ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم

قرآن حکیم

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

(اقبال)

# مُطالعہ حدیث

## تنقید صحیح کی روشنی میں

اور

## بعض عقائد اسلامی کے مجہول و کمزور ماخذ

از


سیّد مقبول احمد صاحب بی۔ اے (مصنف فلسفۂ مذہب)


مع

تنقید از مولانا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری


ناشر

عباس منزل لائبریری ——— الہ آباد (۳)



Marfat.com

DATA ENTERED

7550

۹۱

سول ایجنٹ

پروین بکڈپو

# فہرست مضامین


| نمبر | عنوان |
|---|---|
| (۱) | تنقید ـــــ (از مولانا اسلم جیراجپوری) |
| (۲) | تمہید ـــــ مؤلف |
| (۳) | حدیث و تدوین حدیث پر ایک اجمالی نظر |
| (۴) | اسرائیلیات |
| (۵) | زندیقیت |
| (۶) | دجال |
| (۷) | اسرےٰ اور معراج |
| (۸) | قتل مرتد |
| (۹) | غلامی |
| (۱۰) | اوقات صلوٰۃ |
| (۱۱) | ایام صیام |
| (۱۲) | نصاب زکوٰۃ |
| (۱۳) | خاتمہ |
| (۱۴) | تتمہ جات |


Marfat.com

# پیش لفظ (تیسرے اڈیشن پر)

اس کتاب کا دوسرا اڈیشن پریس ہی میں تھا کہ دفتر "امت مسلمہ امرتسر" جو کتاب کا پہلا ناشر تھا اس آگ کے لپیٹ میں آگیا جو سلگائی تو ہمارے ہی طرف سے گئی تھی مگر جو ہندو مسلم و سکھ کے باہمی نفاق و تنازع کی ہوا سے ایسی بھڑکائی گئی کہ آخر کار سرہند سے پانی پت تک اسلام کے سارے آثار کو خاکستر بلکہ مسلمانوں کے نام و نشان کو مٹا کر رکھدیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کتاب کے چھاپنے والے جو کچھ لاہور بھاگ کرے گئے۔ اس میں کم سے کم اس کتاب کا ایک ورق بھی نہ تھا اور ہونا بھی نہ چاہیئے کہ " این دفتر بابتہ آتش زدنی اولے" کا مصداق اگر فی الواقع نہ بھی تھا تو حوادث روزگار نے ان لوگوں کی آرزوئیں پوری کردیں جو مصنّف کے مدّعا کو یا تو غلط سمجھے یا تعصب ہٹ دھرمی یا کورانہ تقلید و جمود نے انکو حقیقت شناسی سے باز رکھا۔

بہر حال یہ کتاب تمتہ جات کے اضافے کے ساتھ پھر سہ بارہ پیش کیجاتی ہے اور مصنّف کی طرف سے (جو ابھی تک بقید حیات ہے) اس اعلان کے ساتھ کہ اگر کوئی اہل علم و خرد اس بیان کی کسی غلطی کو واضح طور سے ثابت کردے تو مصنّف کی طرف سے نہ صرف تشکر و امتنان کے ساتھ قبول کیجائے گی بلکہ اقرار رجعت کا فوراً ہی اعلان کردیا جائے گا یا کتاب کے ضمیمہ میں شامل کردیا جائے گا۔

ناشر

عباس منزل لائبریری
الہ آباد (۳)
نومبر ۱۹۵۲ء

Marfat.com

# تنقید

## (از مولنا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

"جناب سید مقبول احمد صاحب مؤلف "مطالعہ حدیث" نے اشاعت سے پہلے "مطالعہ حدیث" کا مسودہ جناب مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کی خدمت میں برائے تنقید بھیجا تھا۔ حافظ صاحب موصوف نے جو تنقید لکھی وہ بھی چونکہ علمی فوائد سے معمور ہے اس لئے "مطالعہ حدیث" کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ ——————— ناشر

مخدومی دام لطفہٗ

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ "مطالعہ حدیث" میں نے غور سے مطالعہ کی۔ کتاب چھوٹی مضامین متعدد [illegible] مضمون میں تخریبی اور تعمیری دونوں پہلو۔ ان وجوہ سے بحثیں مختصر اور تشنہ رہ گئیں۔ دلائل میں آیات سے کم اور روایات سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور یہ وہ ہتھیار ہے کہ جس سے آپ کے حریف بہ نسبت آپ کے زیادہ مسلح ہیں۔ اسلئے مجھ کو اندیشہ [illegible] کہ ان بحثوں میں آپ اُن کے مقابلہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ درحقیقت اصلی نقطہ جہاں سے اس بحث کا آغاز ہوتا ہے وہ ظن اور یقین کا نقطہ ہے۔ قائلین حدیث (وہ لوگ جو حدیث کو دینی حجت سمجھتے ہیں) حدیثوں کو ظنی یعنی غیر یقینی [illegible] جانتے ہوئے کہ ان کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک غیر یقینی ہے انکو کلام رسول[1] قرار دیتے ہیں اور انکی اتباع واجب سمجھتے ہیں۔ منکرین حدیث (وہ لوگ جو حدیث کو دینی حجت نہیں سمجھتے) ساحتِ رسالت کو اس سے زیادہ اقدس و ارفع سمجھتے ہیں کہ اسکی طرف کوئی مشتبہ قول منسوب ہونے دیں۔ اسلئے اُن کے نزدیک حدیث کو قول رسول [illegible] جسارت ہے۔ اس کو صرف "قول منسوب الی الرسول" کہہ سکتے ہیں۔

---

[1] بلکہ کلام اللہ بلکہ ناسخ کلام اللہ۔ (ناشر)

میں جہانتک خیال کرتا ہوں فریقین کا مسلک تقویٰ پر مبنی ہے۔ قائلین کا یہ خیال ہے کہ حدیث کو دین نہ سمجھنے سے کہیں ہمارا دین نہ ناقص رہ جائے اور اتباع نبی میں قصور کے مجرم نہ ٹھہریں۔ اور منکرین یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کو ہم نبی کا قول قرار دیکر اسکی اتباع کر کے کسی کذاب یا وضاع کے پھندے میں نہ پھنس جائیں۔ اب اصولی بحث یہ ہے کہ حدیثیں تمامتر ظنی ہیں یعنی اُن کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یقینی نہیں ہے۔ محدثین اور اصولیین نے حدیثوں کی ابتدائی تقسیم دو قسموں میں کی ہے۔ متواتر اور احاد۔ متواتر حدیث یعنی وہ کہ جس کے راوی آغاز عہد سے لیکر آخر تک ہر زمانہ میں اسقدر رہے ہوں کہ انکا اتفاق کذب پر محال ہو یقینی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ تواتر یقینیات کی قسم میں داخل ہے۔ مگر اکثر ائمہ حدیث نے اتفاق کیا ہے کہ ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے جس پر متواتر کی تعریف صادق آتی ہو۔ بعضوں نے دو تین حدیثیں ایسی بیان کی ہیں مگر وہ کوئی اہمیت دینی نہیں رکھتیں اور انکا تواتر بھی اتفاقی ہے۔ الغرض بالعموم ائمہ حدیث ایک حدیث کے بھی لفظاً متواتر ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ صرف معنوی تواتر دو چار حدیثوں میں مانتے ہیں اسلئے تمامتر حدیثوں کو آحاد کے ذیل میں سمجھنا چاہیے جن کے متعلق اصولیین کا اتفاق ہے کہ وہ صحیح سے صحیح ہونے کی صورت میں بھی ظن سے آگے نہیں بڑھتیں۔ چنانچہ اصول کی بہترین کتاب "المستصفیٰ" میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

خبر الواحد لا یفید العلم (ص۱۳۲ مطبوعہ مصر) خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد سے وہ کیا مراد لیتے ہیں یہ بھی اسی صفحہ میں ہے:۔

انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام مالا ینتھی من الاخبار الی حد التواتر المفید للعلم۔ فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فھو خبر الواحد (اس مقام پر خبر واحد سے ہماری مراد وہ حدیث ہے کہ حد تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہونچتی ہو مثلاً ایک حدیث جو ایک جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو وہ خبر واحد ہے) اس لحاظ سے صحاح ستہ کی کل حدیثیں جو اہلسنت میں مقبول ہیں خبر واحد ہیں اور تمامتر مظنون۔ ایک حدیث بھی ایسی ثابت نہیں کی جاسکتی جسکی بابت کہا جائے کہ بجنسہٖ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ ہے۔ اگر کسی حدیث کے متعلق یہ ثابت ہوجائے کہ وہ قطعی قول رسول ہے تو پھر کوئی بحث[1] ہی نہیں رہ جاتی۔ بحث تو ساری یہ ہے کہ حدیثوں کا قول رسول ہونا غیر یقینی اور ظنی ہے۔ اور قرآن کریم ایسی چیزوں کی اتباع کی نہ صرف یہ کہ اجازت نہیں دیتا بلکہ صاف لفظوں میں ممانعت کرتا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ١٥/٤ اس کے پیچھے نہ چل جسکا تجھ کو یقین نہیں ہے۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ١١/٩ ظن حق کی جگہ کچھ کام نہیں دیتا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ حدیث کا آغاز رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت کیوجہ سے ہوا۔ صحابۂ کرام فرصت کے لمحات

---

[1] پھر یہ بحث رہ جاتی ہے کہ قول رسول قول اللہ کے ہم رتبہ ہے یا نہیں۔ (ناشر)

Marfat.com

میں جب ملک میں بیٹھے ہوں گے تو اُن کے لئے اس سے زیادہ محبوب اور کونسا مشغلہ ہو سکتا تھا کہ عہد رسالت کے واقعات کا ذکر کرکے مسرت حاصل کریں۔ بعد میں ان سے لوگوں نے دینی احکام نکالنے شروع کئے۔ حالانکہ خود حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد مبارک میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا جانے لگا تھا۔ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ بشیر بن کعب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے حدیث بیان کرنی شروع کی۔ اُنھوں نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بشیر نے کہا کہ کیا بات ہے جو آپ میری حدیث نہیں سنتے۔ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتا تو ہم دوڑ کر جھپٹتے اور کان لگا کر سنتے مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں شروع کیں اُس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ کرام تھے جنھوں نے اسی وجہ سے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں۔ شیخ طاہر جزائری نے اپنی کتاب توجیہ النظر فی اصول الاثر میں اُن کے نام لکھے ہیں۔ خود رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا فرمان صحیح مسلم میں موجود ہے کہ لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیرہ فلیمحہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جس نے سوائے قرآن کے مجھ سے کچھ لکھا یا ہو وہ اُس کو مٹا ڈالے اس ممانعت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کے ساتھ کلام رسول کا خلط ملط نہ ہو جائے۔ کیونکہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو خود اللہ نے لے رکھا ہے بلکہ اس کی غرض یہ تھی کہ یہ باتیں روایت ہی رہ جائیں دین نہ بن سکیں۔

خلفائے راشدین کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا کہ تم رسول اللہ سے کوئی روایت نہ کرو (تذکرۃ الحفاظ ذہبی) پھر خود ایک مجموعہ احادیث جو انھوں نے لکھ رکھا تھا اُس کو حضرت عائشہ سے لیکر آگ میں جلا دیا (تذکرۃ الحفاظ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سنا کہ لوگوں نے حدیثیں لکھ رکھی ہیں تو اُن سب کو منگوا کر جلوا دیا (طبقات ابن سعد جزء خامس) حضرت عمرؓ جب کسی صحابی کو حدیث بیان کرتے دیکھتے تو درہ لیکر اُس کو مارنے کو تیار ہو جاتے اور تاوقتیکہ گواہ شاہد نہ دے دیتے اسوقت تک نہ چھوڑتے۔ فوجوں کو جب کسی مہم پر رخصت کرتے تو ان کو نصیحت کرتے کہ وہاں جا کر لوگوں کو حدیثوں اور روایتوں میں نہ پھنسانا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لیکر گئے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان زکوٰۃ کے متعلق تھا۔ اُنھوں نے کہا مجھ کو اس سے معاف کرو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جب کوئی شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو وہ اُس سے حلف اُٹھواتے تھے۔ (توجیہ النظر فی اصول الاثر)

ان سب باتوں کی صراحت خود ان حدیثوں میں ہے جنکو مسلمانوں نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ اسکے برخلاف حدیثوں کی حفاظت یا کتابت یا اشاعت وغیرہ کی کوشش نہ رسول اللہ صلعم سے ثابت ہوتی ہے نہ خلفائے راشدین سے۔ اس سے یہ امر بخوبی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ حدیثیں اگر دین ہوتیں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا سلوک اُن کے ساتھ اس کے برعکس ہوتا جو اُنھوں نے کیا اور وہ اس کی حفاظت اور اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔

Marfat.com

صحابہ کرام کے بعد حدیثوں کی روایت برابر بڑھتی گئی۔ اور اسلام میں جو جو فرقے پیدا ہوتے گئے، انھوں نے بھی اپنی حمایت اور دوسرے فرقوں کی مخالفت میں حدیثیں روایت کرنی شروع کیں۔ مختلف طبقات نے مختلف اغراض میں اُن سے کام لینا شروع کیا۔ یہانتک کہ جھوٹی روایتوں کا انبار ہوگیا۔ امام ابن جوزی کے بیان کیمطابق وضاعین حدیث کے حسب ذیل طبقات یا اقسام تھے۔

(۱) بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا حفظ حدیث میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

(۲) بعض محدثین کی یادداشتیں ضائع ہوگئیں اور اُنھوں نے اپنے حافظہ سے روایتیں کیں اور جو خیال میں آیا کہتے گئے۔

(۳) بہت سے راویوں نے جنکی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دیدیا تھا غلط روایتیں کیں۔

(۴) ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے سہواً غلط روایتیں کیں اور بعد میں باوجود اپنی غلطی پر مطلع ہونے کے بھی رجوع کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔

(۵) زنادقہ نے شریعت اسلامی کو مٹانے کے لئے حدیثیں گڑھیں۔

(۶) جب مذہبی تفریق پیدا ہوگئی اور سنّی۔ شیعہ۔ خارجی۔ جہمی۔ مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بنگئے اسوقت ہر فرقہ نے دوسروں کے خلاف اور اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں۔

(۷) بہت سے عابد و زاہد لوگ ایسے تھے کہ عوام کو کسی اچھی بات کی ترغیب دلاتے اور بُری بات سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گڑھتے تھے۔

(۸) بعض ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کا خیال تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا اور اُسکو رسول اللہ تک پہنچا دینا جائز ہے۔

(۹) سلاطین کے مقربین اور حاشیہ نشین اُن کے حسب منشاء روایتیں گڑھتے اور اُن کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

(۱۰) قصہ گو واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کیطرف منسوب کرتے تھے۔ کیونکہ انکی گرمی بازار کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث ہزاروں ہزار مکذوب ومجعول روایتیں اُمّت میں پھیل گئیں۔ انکے علاوہ سیاسی جماعتیں تھیں جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے حسب منشا حدیثیں بنائیں اور اُن کو مشرق و مغرب میں پھیلایا۔ پھر ان سے بھی بڑھ کر اُن لوگوں نے جو اپنے علم و تقدّس کا سکّہ لوگوں پر جمانا چاہتے تھے نئی نئی حدیثیں وضع کیں۔

یہ وضاعین حدیث کی رگ رگ میں گھس گئے اور شعبۂ زندگی اور تعلیمات نبوی کے ہر باب اور ہر فصل میں اُنھوں نے اتنی حدیثیں وضع کرڈالیں جنکا شمار سوائے علام الغیوب کے کوئی نہیں کرسکتا۔ علامہ ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ نے وضاعین کے تراجم میں اپنی کتاب کامل لکھی ہے جو بارہ جلدوں میں ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُنکی تعداد کس قدر تھی اور جو حدیثیں اُنھوں نے وضع کی ہونگی وہ کسقدر ہونگی۔

الغرض حدیثوں کو دین کا درجہ دیدینے کی وجہ سے مسلمانوں کے ہر ہر فرقہ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے اپنے دین کی عمارت وضعی احادیث سے جس طرح چاہیں تعمیر کریں۔ چنانچہ ہر ہر فرقہ نے اپنے اپنے مذہب کو حدیثوں سے ایسا پختہ کرلیا ہے کہ اب اُنکے اختلافات کا مٹنا محال ہوگیا ہے تاوقتیکہ وہ سب کے سب ایک مرکز یعنی کتاب اللہ پر نہ آجائیں۔

اس بیان سے میری غرض حدیثوں کی تردید یا تنقیص نہیں ہے کیونکہ میری نگاہ میں وہ کوششیں بھی ہیں جو ائمہ جرح و تعدیل نے اُن کی تنقیح و تنقید میں کیں۔ لیکن وہ نبی نہ تھے کہ ہر کھوٹے کھرے کو وحی الٰہی سے الگ الگ کردیتے۔ بلکہ ہمارے ہی جیسے انسان تھے اسلئے اُنکی تنقید میں لازمی طور پر مندرجہ ذیل نقائص رہ گئے۔

(۱) اُنھوں نے احادیث کی صحت اور رواۃ کی ثقاہت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ عقل قیاس سے زیادہ مذہبی عقیدت پر مبنی ہے اور بیشتر غلط ہے۔

(۲) اُنھوں نے صحت حدیث کے جو اصول قائم کئے وہ یقینی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں اور نظری حیثیت سے نہایت کمزور۔

چنانچہ صحاح ستہ میں بھی جو اہل سنت میں اصول حدیث کے مطابق مقبول ہیں غلط روایتیں موجود ہیں جو صریحاً قرآن کے خلاف ہیں۔

غرض اصول روایت و درایت کی رُو سے جانچ پڑتال کرنے کے بعد جو احکام احادیث پر لگائے گئے ہیں وہ یقینی نہ ہوسکے بلکہ ظنی ہی رہے اور یہ وہ بات ہے جس کو میں ہی نہیں کہتا بلکہ خود ائمہ حدیث کو بھی تسلیم ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں لکھا ہے:-

ھذا کلہ ما یظھر للمحدثین من حیث نظرھم الی الاسناد والا فلا مطمع للقطع۔ لتجویز العقل ان یکون الصحیح فی نفس الامر موضوعاً والموضوع صحیحاً۔ یہ وہ احکام ہیں جو محدثین کو روایات کے اسناد پر نظر ڈالنے سے نمایاں ہوئے ہیں ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو اُنھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

جب وہ خود احادیث کے متعلق یقین کے مدعی نہیں ہیں تو اس صورت میں احوط اور قرین عقل یہی امر ہے کہ

Marfat.com

حدیثوں کو نہ تو دین قرار دیا جائے جیسا کہ جمہور کا عقیدہ ہے اور نہ بالکل باطل کہا جائے جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے کیونکہ یہ افراط و تفریط ہے۔ بلکہ اُن کو تاریخ دین سمجھا جائے۔ جو قرآن کے مطابق ہو مسلم ہو جو مخالف ہو وہ مسترد۔ یہ خیال کہ ائمہ حدیث نے حدیثوں کو قرآن کے ساتھ ملاکر جانچ لیا ہے کلی طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ محدثین ایک خاص زمانہ اور ماحول میں تھے جس کو چیر کر وہ آگے نہیں جاسکتے تھے اور قرآن کسی زمانہ اور ماحول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ حدیثوں کے دینی تاریخ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اس کا اعتماد رواۃ کے اعتماد پر قائم ہوا ہے اور رواۃ کا اعتماد اُن کے ہمعصروں کی شہادت پر مبنی ہے جو بالکل تاریخی چیز ہے۔ اس لئے اس تاریخی اعتماد پر بجز تاریخ کے دین کی تعمیر نہیں ہوسکتی کوئی شخص اللہ اور رسول کیطرف سے مامور نہیں ہے کہ محدثین کی ثقاہت پر ایمان لائے چنانچہ خود محدثین میں سے بعض ایک کی تصدیق کرتے ہیں تو بعض تکذیب۔ ایسی حالت میں اُن کی روایات دین کیونکر ہوسکتی ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اُنکا اعتبار نہ کرے تو اللہ اور رسول نے اُسکے لئے کونسی سزا مقرر کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ شیعہ رواۃ کو سنی مانتے ہیں اور نہ سنی رواۃ کو شیعہ اور محض اس بنیاد پر ہم فریقین میں سے کسی کو قابل تعزیر نہیں سمجھتے۔

حدیثوں کو دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان ماضی کے ساتھ اسقدر وابستہ ہوگئے ہیں کہ اُن میں مستقبل کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔ اُنھوں نے قرآن کریم اور عقل دونوں کو چھوڑ رکھا ہے۔ اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام میں ماضی کی سند لینے کے خوگر ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زندگی خود ساختہ پابندیوں کی روادار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قومیں آگے بڑھتی جارہی ہیں اور مسلمان باوجود ادعائے دین حق دن بدن گرتے جارہے ہیں۔

یہ تو بالاجمال وہ عنوانات ہیں جن پر خود حدیث اور تاریخ کی رُو سے حدیثوں کے متعلق بحث ہوسکتی ہے۔ اسکے علاوہ قرآن کریم اور عقل کی رو سے جو مباحث اُن کی صحت و عدم صحت کے متعلق ہونگے وہ الگ ہیں۔ اس مختصر تحریر میں جو ضرورت سے زیادہ طویل ہوتی جارہی ہے اُن کی گنجائش کہاں۔

آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ اگرچہ دلچسپ ہیں اور اُن سے بہت کچھ حدیث کی اصلیت پر روشنی پڑتی ہے لیکن بعض جزئیات میں آپ کے ساتھ اتفاق کرنے کے وجوہ ناکافی ہیں۔ بالخصوص تعداد ایام صیام اور اوقات صلوٰۃ میں لیکن یہ اختلاف میرا ایک اصول پر مبنی ہے یعنی میں اُسوۂ رسول کو دین مانتا ہوں جو عمل متواتر کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے اور اس میں صلوٰۃ پنجگانہ اور روزے پورے مہینہ کے ہیں۔

جن مسائل پر آپ نے قلم اُٹھایا ہے اُنکی بعض لطیف باتیں آپ سے چھوٹ گئی ہیں۔ چند مثالیں لکھتا ہوں۔

ربا کے مسئلہ پر آپ نے بحث کی ہے۔ حدیث میں ربا بالفضل کا بیان ہے یعنی التمر بالتمر والشعیر بالشعیر والی روایت جس میں صرف چھ چیزیں ہیں جو ربا کی تحت میں آتی ہیں اور جملہ کتب حدیث میں یہی روایت بہ تبدیل رواۃ یا بہ تبدیل الفاظ باب الربا میں درج کی گئی ہے۔ اس پر بحث کی ضرورت تھی کہ اس سے معیشت یا معاشرت انسانی

Marfat.com

کے کس پہلو کی اصلاح مدنظر ہے اور دنیا میں وہ کونسا بازار ہے جہاں جو کے بدلے جو۔ گیہوں کے بدلے گیہوں اور مسلم کی روایت کے مطابق نمک کے بدلے نمک بکتا ہے۔ اور کیوں یہ تبادلہ اگر دست بدست اور برابر نہ ہو تو ربا ہے۔ ان حدیثوں کو دیکھئے اور پھر قرآن کریم کے ایک لفظ ربا پر غور کیجئے جس سے کس قدر عظیم الشان اصلاح انسانی معاشرت میں ہو سکتی ہے۔

دجّال⁵ کی روایات میں حضرت تمیم داری کے متعلق جو جساسہ کے راوی ہیں یہ ضرور درج کرنا تھا کہ وہ پہلے قصاص تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ سے سالہا سال تک قصہ گوئی کی اجازت مانگی لیکن وہ نہیں دیتے تھے آخر میں اُن کے اصرار سے اتنی اجازت دیدی کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے لوگوں کو سنا دیا کریں۔ ایک دن انھوں نے دیر تک سنایا تو اُن کی درہ سے خبر لی۔

یہ سارا بیان ملا علی قاری نے موضوعات (مطبوعہ مطبع محمدی لاہور صفحہ ۱۶) میں امام طبرانی نے ابن عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ کیا اس سے یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ جسّاسہ والی روایت ایک قصہ ہے۔

بنی عباس کے متعلق کہ وہ دین کی راہ سے امت کے قلوب پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے آپ نے بہت سی روایتیں درج کی ہیں۔ لیکن بعض لطیف نکات رہ گئے۔ مثلاً جامع البیان میں زیر آیت "الا المودۃ فی القربیٰ" یہ حدیث امام احمد ابن حنبل سے مروی ہے:۔

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام للعباس لایدخل قلب امرءٍ ایمان حتی یحبکم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباسؓ سے کہا کہ جب تک تم کو محبوب رکھے کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوتا۔

لیجئے ایمان کا داخلہ ہی بند ہے جب تک کہ خاندان عباسیہ کی محبت پہلے نہ ہو۔ کیسا زبردست پروپیگنڈا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کیا جو کسی انسان کی محبت کی بنیاد پر قائم ہو۔ مگر سادات نے تو (معاف کیجئے گا آپ بھی سید ہیں) نمازوں کے اندر درود میں اپنا حق قائم کر لیا۔ میں کبھی نہیں قیاس کر سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مروجہ درود جو نمازوں میں پڑھا جاتا ہے پڑھتے رہے ہوں یا اس کے پڑھنے کی کسی کو ہدایت کی ہو۔ کیونکہ یہ خاندان پرستی ہے جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے اور قرآن کے بھی منافی ہے۔ اس میں ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۳۳

اور وہی ہے جو تمھارے اوپر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالے۔ وہ مومنوں پر مہربان ہے۔

---

⁵ یہ روایات مؤلف "طلوع حدیث" نے اس خط سے لیکر "مطالعہ حدیث" میں مختلف مقامات پر حواشی میں درج کر دی ہیں (ناشر)

یعنی اللہ اور اس کے فرشتے کل مومنوں پر درود بھیجتے ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا نبی صرف اپنے آل پر درود بھیجے اور اسی کی امت کو تعلیم دیجائے۔ بہت سے سادہ دل لوگ درود میں آل کے معنی کو وسعت دیکر تمام اُمت پر پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن کے لفظ اٰل فرعون نیز ایک حدیث سے جس کو وہ روایت کرتے ہیں من اتبعنی فھوالی" سند لاتے ہیں۔ لیکن درود میں آل محمدؐ کو تشبیہ دیگئی ہے آل ابراہیم سے اور آل ابراہیم سے حتماً اولاد ہی مراد ہے۔ اسلئے مشبہ میں بھی اولاد ہی مراد ہوگی۔ اسی طرح آیت تطہیر میں جو خاص ازواج رسول کے لئے نازل ہوئی تھی حدیث ردا کے ذریعہ سے اپنے آپ کو داخل کرلیا اور وہ بھی اس طرح کہ اہل بیت کے لقب پر جو عربی زبان میں سوائے "گھر والی" کے اور کسی پر بولا نہیں جاتا بلا شرکت غیرے قابض ہوگئے۔ خمس غنیمت میں "ذوی القربیٰ" کے لفظ سے اپنا ایک دائمی حق قائم کرلیا۔ گویا رسول اللہ کے بعد جو اُن کا جانشین ہوگا اسکے ذوی القربیٰ ہی نہ ہونگے۔ چنانچہ امام شافعی اور مالک وغیرہ کا یہی مذہب ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ یہ حق بنی ہاشم کو ملتا رہیگا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ جو قرآن پر غائر نظر رکھتے تھے اس کے قائل نہ ہوسکے۔

یہ چند اُمور بطور تمثیل کے میں نے لکھدئے ورنہ بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

آپ کی کتاب میں میں نے کسی لفظ کو تبدیل یا کوئی اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ جس انداز پر آپ نے لکھا ہے اس کے لحاظ سے ترمیم کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوئی۔ فقط

نیازمند

اسلم جیراجپوری

قرولباغ۔ دہلے

مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء

Marfat.com

# تمہید

ان مضامین کا زیادہ حصہ رسالہ نگار میں مختلف اوقات میں شائع ہوا تھا۔ اور اب احباب کے پیہم اصرار سے اس سلسلۂ مضامین کو جو نگار میں شائع ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے نظر ثانی، حذف و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کر کے پیش کرتا ہوں۔

میرا مدعا اس قسم کی تحریر سے نہ ذاتی نام و نمود ہے نہ مولویوں سے ہنگامہ آرائی۔ یہ کتاب محض میری پہلی کتاب فلسفہ مذہب کا تتمہ ہے۔ جس میں ایک ضمنی بحث یعنی "اسلام میں حدیث کا کیا درجہ ہے" صراحت کی محتاج تھی۔ چنانچہ یہ کتاب بھی فلسفہ مذہب کی طرح ان نئی روشنی کے انگریزی داں طبقے سے مخصوص ہے جو مذہب کے اصول و فروع۔ حشو و زوائد میں تمیز کرنے کی قابلیت یا فرصت نہ پاکر اصل مذہب ہی سے معاندانہ روش اختیار کر رہے ہیں۔ مغربی علوم کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ عقل و بصیرت و درایت کا وہ معیار بالکل جاتا رہا جو آج سے ایک ہزار سال قبل تھا یا جو اب بھی عربی مدارس میں قائم ہے اور اسلام کی نسبت جو خطرہ کبھی محسوس نہ ہوا تھا وہ اب گہرے بادل کی طرح مسلمانوں کے چاروں طرف منڈلا رہا ہے۔ اگر اسلام قرآن پہ قائم رہتا تو اس خطرے کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر جیسا حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے اپنی اس مشہور رباعی میں فرمایا ہے:

سر رشتۂ اتحاد ہم سے چھوٹا — آپس ہی کی خانہ جنگیوں سے ٹوٹا
قرآن کے اثر کو روک دینے کے لئے — ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

نتیجہ یہ ہوا کہ اس اسلام سے رفتہ رفتہ اس جماعت کو انقباض پیدا ہوا اور ان کے دلوں سے مذہب کی وقعت ہی جاتی رہی یعنی وہ مذہب جو قرآن کا مذہب ہے۔

۱ بلغاریہ کے نومسلم جو پوماک کہلاتے ہیں ان میں سے زیادہ تر ایسے بدبخت ہیں جنہوں نے علانیہ اسلام

Marfat.com

ترک کر دیا ہے محض اس وجہ سے کہ اُن سے پانچ وقت کی نماز خصوصاً ظہر و مغرب ادا نہیں ہو سکتی۔ اُنھوں نے بہت کوشش کی کہ بلغاری حکومت اُن کو فیکٹریوں، سکوں اور دفاتر میں نماز ظہر کی چھٹی دے اور شام کے وقت جب وہ اپنے کام سے فرصت پاکر تفریح کو نکلیں تو اُن کو ہر پارک اور گلی کوچے میں مصلّے بچھانے کی آسانیاں عطا کی جائیں حکومت نے اس کو گوارا نہ کیا۔ تو اولاً اُنھوں نے فیکٹریوں۔ سکوں اور دفاتر کو ترک کیا۔ شام کو اپنے کلبۂ احزاں میں خانہ نشینی اختیار کی۔ مگر اس طرح جب اُن سے دنیا کا کام نہ چلا تو اُنھوں نے اسلام ہی کو چھوڑ دیا۔ خدانخواستہ اس مثال سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں کسی طرح نماز کی اہمیت کو کم کر رہا ہوں بلکہ صرف ذہنیت کے رجحان کو دکھلا رہا ہوں۔ شب معراج کا جشن ترکی میں بڑے زوروں سے منایا جاتا ہے مگر نوجوان ترکوں سے یہ شکایت ہمیشہ سُنی گئی کہ جب اُن کا "خوجہ" ممبر پر معراج کا قصّہ بیان کرتا ہے تو ہم شرم سے چاروں طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ کوئی عیسائی تو وعظ میں شریک نہیں ہے۔ ورنہ ہم کو ضرور طعنے دیگا کہ افوہ اسی اسلام کی تبلیغ کی آرزو تم کو ہمارے درمیان ہے۔

بوسنیا و ہرزیگونیا میں امرا کا بڑا طبقہ جو نسلاً سلاو قوم ہے مسلمان ہے۔ اُن کی نسبت ترکی کے علما نے فتوے دیدیا کہ جب تک وہ اپنا گھر بار و زمین چھوڑ کر ٹرکی میں ہجرت نہ کر جائیں گے اور ترک نہ بن جائینگے وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار نہ ہونگے اور نہ اُن کی کوئی نماز قبول ہوگی نہ روزہ۔ کچھ لوگ اس فتویٰ سے ڈر کر مفلوک الحال ٹرکی میں آکر ترکوں پر بار ہو گئے مگر پسماندگان نے وطن کے بجائے اسلام کو ترک کرنا گوارا کر لیا۔ اور اس فتویٰ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس ملک میں اذان کی آواز سنائی دیتی تھی وہاں مسلمانوں کی یادگاروں پر اب چغد و بوم کی نوبت بج رہی ہے۔

اسی طرح ٹرکی میں زکوٰۃ کا مفہوم اس درجہ بدل دیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کو رافت و نیکدلی کا مظہر نہیں جانتا بلکہ حکومت کو ایک ٹیکس دینا۔ جنگ عظیم میں اتحادیوں نے جب قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو شیوخ کردستان نے ترکوں کا ساتھ دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق قسطنطنیہ اب امام مہدی کے ہاتھ ہی پر فتح ہو سکتا ہے۔ قتل مرتد پر ترکوں اور تمام یوروپین اقوام میں پچاس سال تک بدمزگی رہی۔ اور غلامی کا دنیا میں اگر کہیں رواج ہے تو عرب و حجاز میں۔ پھر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس رسم قبیح کو مسدود کرنا قرآن کی رو سے ہمارا حق تھا۔ اس کو دوسری قوموں نے کیا۔ ہندوستان میں ہماری جو مٹی پلید ہے۔ اس کی سب سے زیادہ حسرت انگیز حالت یہ ہے کہ ایسے سوشل ریفارم یعنی نکاح صغیرہ۔ جبریہ تعلیم۔ عورتوں کے بحیثیت انسان ہونے کے فطری حقوق۔ ان کے لئے بجائے ہمارے ہندو جد و جہد کر رہے ہیں اور اس کی مخالفت سب سے زیادہ ہم نے کی۔

صوبہ بنگال[1] میں اگر مسلمانوں کا تناسب کسی جگہ بقدر اُن کی آبادی کے ہے تو وہ جیلخانوں۔ پولیس کے رجسٹروں محکمۂ آبکاری کے فرد سیاہ (BLACKLIST) اور قحبہ خانوں میں ہے۔ جس کو دیکھ کر دل سے بیساختہ آہ نکلتی ہے۔ یَارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا۔

ان سب خرابیوں کی جڑ یہی ہے کہ قرآن پر ایک زنگ آلود قفل لگا کر اس کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ اور ٹھیک انہی باتوں سے جن سے کہ قوم یہود مخذول و منکوب ہوئی یعنی قومی شریعت و روایات کا تتبع اور ارباب پرستی۔ اسلام بجائے اس کے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں لیظہرہٗ علی الدین کلہ کے ساتھ جلوہ افگن و ضیا پاش ہوتا۔ خود اسلامیوں کے دل میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے یہ ہیں وہ داغ دل جو باوجود لومۃ لائم مجھے ان کتابوں کے لکھنے سے باز نہیں رکھتے۔

غالباً میں نے اپنے مدعا کا اظہار کر دیا ہے۔ اب میں قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے دعائے خیر سے یاد کریں یا مجھے صلواتیں سنائیں۔

(س۔ م۔ ا)

---

[1] بنگال میں مسلمان ۵۴ فیصدی ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمی پستی کا یہ حال ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ۱۰۶۳ ہندو کے مقابلے میں بحثوں نے یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا ہے اُن کی کل تعداد ۲۰۰ ہے یعنی تعلیم میں ہندو مسلم کا تناسب ۵ : ۱ کا ہے۔ افسوس

Marfat.com

Marfat.com

# حدیث و تدوین حدیث پر ایک اجمالی نظر

سنت۔ فقہ۔ حدیث تین مختلف چیزیں ہیں جو قرآن کے بعد شریعت اسلام کے مبادی یا بنیاد کہی جاتی ہیں۔ سنت تو وہ زبانی طریقے اور اعمال رسول ہیں جو مسلمان ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ابتدا سے چلے آئے اور اس پر عامل رہے یعنی رسول اللہ صلعم کے طریقے کو اصحاب نے دیکھا۔ اصحاب کو تابعین نے۔ تابعین کو تبع تابعین نے اور اس طرح سلسلہ بہ سلسلہ ایک طریقہ اسلام کے مذہبی اعمال کا مسلمانوں میں جاری و ساری رہا۔ یہ ظاہری عمل رسول یا سنت ایسے مشہور و متواتر تھے کہ اس پر کسی رد و قدح کی ضرورت نہ تھی۔ نہ کسی صاحب عقل کو کلام یا اعتراض ہو سکتا ہے خود قرآن شریف بھی سنت متواترہ کی تائید میں ہے اور مسلمانوں کا سواد اعظم جو اپنی صفت "سنت و الجماعت" کرتا ہے عملی اسلام کے اس صحیح طریقے پر ہے جو نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں میں رائج رہا ہے۔ قرآن شریف میں اگرچہ نماز کے طریقے پر سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ مگر اس کی ایک آیت سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ سنت متواترہ پر عمل کرانے کا عندیہ ہے یعنی "تم نماز پڑھو جیسی تم کو سکھلائی گئی ہے"[1] مسلمان اس سے مشکل سے انکار کریگا کہ جو نماز مسلمانوں کی جماعت پڑھ رہی ہے وہ بجز معمولی فروعی اختلاف کے سنت متواترہ نہیں۔ یا اذان جس کا ذکر قرآن شریف میں دو جگہ ہے یعنی "اذا نادیتم الی الصلوٰۃ" "واذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ" مگر اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ سنت متواترہ پر عمل کیا جائے یا نماز جنازہ جس کا ذکر قرآن شریف نے ایک منافق کی میت کے بارے میں کیا ہے۔ مگر نماز جنازہ کس طرح پڑھی جائے وہ یقیناً رسول کا وہ عمل ظاہر ہے جس کو سنت متواترہ کہتے ہیں۔ یا ایام صیام میں "اعتکاف" یا حج میں "عمرہ" و "نسک" کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا ہے مگر یہ نہیں بتلایا ہے کہ عمرہ اور اعتکاف کیا ہے اور کس طرح کرنا چاہیے۔ لازم ہے کہ ہم اس کی تفصیل سنت متواترہ میں تلاش کریں۔ غرضیکہ عملی مذہب کیلئے سنت متواترہ کا اصول

---

[1] فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ج فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (بقرہ۔ رکوع ۳۱)

ضروری ہے۔ مگر سنت متواترہ حدیث میں یا کسی کتاب میں منضبط کرنے کی چیز نہیں۔ نہ حدیث نے اسکو منضبط کیا نہ اسکی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ ایسے مشہور و متواتر عمل مسلمانوں کی جماعت میں تھے کہ ان کا کتابوں میں لکھنا اور اسپر استدلال کرنا تحصیل حاصل تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ عام سنت کو جب کبھی حدیث کی صورت میں لایا گیا تو اس میں اسقدر متضاد روائتیں بیان کردی گئیں کہ بجائے شک کو رفع کرنے کے وہ مسئلہ اور بھی مشتبہ ہوگیا۔ مثلاً حدیث کی مدد سے کوئی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ آمین بالجہر ہے یا آمین بالخفی یا نماز میں رفع یدین ہے یا نہیں ہے یا صلوٰۃ وسطیٰ کس وقت کی نماز ہے یا لیلۃ القدر رمضان کی کونسی رات ہے یا وضو میں پیر دھونا چاہئے یا مسح کرنا چاہئے یا جنابت کا غسل کب واجب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ممبر پر خطبہ بیٹھ کر پڑھنا چاہئے یا کھڑے ہوکر۔ اور جب یہ بحث حضرت امیر معاویہ کے وقت میں اُٹھائی گئی تھی کہ وہ بوجہ کبرسنی و فربہی کھڑے ہونے سے معذور تھے تو اُن کی آسانی کے لئے بعض رواۃ نے یہ حدیث بیان کرنا شروع کردی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر بھی خطبہ دیا ہے۔ گو اس کی تردید میں دوسرے راویان حدیث نے "وترکوک قائما" کی آیت قرآن اپنی تائید میں پیش کی۔ حالانکہ ممبر پر خطبہ کہنا آنحضرت کا ایک مشہور و ظاہر فعل تھا جس کے دیکھنے والے کثرت سے تھے۔ بہرحال سنت متواترہ پر حدیثیں بھی ہوں تو بشرطیکہ اُن کی وضاحت خود قرآن میں موجود نہ ہو اُن کو بلا تکلف مانا جاسکتا ہے اور یہ ہی حدیثیں ہیں جو حدیث متواتر کہلاتی ہیں مگر وہ اسقدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مگر "سنت والجماعت" نے بہت جلد وہ رنگ اختیار کیا جسکو ہم عرف عام میں "اہل حدیث" کہہ سکتے ہیں یعنی مذہب کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع ہوکر سیاست و معاشرت و تجارت و کسب و تدبیر منزل کے عام دنیاوی اصول پر حاوی ہوگیا۔ اس مذہب کے لئے قرآن و سنت کافی نہ سمجھے گئے چنانچہ جب کسی سیاسی۔ ملکی۔ معاشرتی معاملے میں کسی طریقہ کو اخذ کیا جاتا تو مسلمان اس کا جواز قرآن اور سنت متواترہ میں ڈھونڈھتے اور جب وہاں اُس کو نہ پاتے تو قیاس و رائے سے کام لیتے۔ مگر چونکہ قیاس و رائے ایک ذاتی چیز تھی اور فتویٰ اختلافی رہتا۔ اس کو قابل تسلیم و عمل بنانے کے لئے اجماع کی ضرورت ہوئی۔ مگر اجماع کے یہ معنی ہوتے کہ قیل و قال کا دروازہ کھل جاتا۔ اس مشکل کو دُور کرنے کے لئے آسان صورت یہ تھی کہ اس کو حدیث رسول میں منتقل کردیا جائے (اذ اڈنیا دایا جعلنا له حدیثا) اس ضرورت نے بہت جلد ائمہ حدیث کی ایک جماعت پیدا کردی جو مقدس و مقتدائے اُمت ہی نہ سمجھے جانے لگے بلکہ سلطنت کے مہمات میں بھی اُن سے مشورہ لیا جانے لگا۔ مسلمانوں میں فرقے پیدا ہوگئے اور ہر ہر فریق اپنے فرقے کی حمایت میں حدیثیں پیش کرنے لگا۔ اسوجہ سے وضع۔ جعل اور کذب کے امکانات حدیثوں میں بہ نسبت تاریخ کے بھی زیادہ ہوگئے جن کی وجہ سے حدیثوں کی حیثیت ایک ظنی تاریخ سے زیادہ نہ رہی۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ احادیث رسول دنیا میں موجود تھیں اور ائمہ اربعہ نے ان کو مدنظر رکھ کر اپنی شریعت کی بنیاد ڈالی۔ واقعہ اس کے خلاف ہے پہلے

فقہ کے اصول مدون کئے گئے اور اس کے بعد اُن کی سند و تائید میں حدیثیں وضع کی گئیں۔ اگر پہلی صدی کے مسلمان اپنے ہر کاروبار میں مذہب کو پیش نہ کرتے تو غالباً صرف مذہب کے لئے قرآن اور سنت متواترہ کافی سے زیادہ تھے۔ مگر خدا جانے اُن کی سمجھ میں یہ کیوں نہ آیا کہ دنیاوی سیاست و معاشرت کو مذہب سے علیحدہ کر کے اپنے عقل و قیاس کا جولانگاہ بنایا جائے۔ فقہ نے جہاں وضو و نماز پر صراحت کے دفتر بنائے ہیں۔ وہیں سیاسیات۔ معاملات۔ مناکحات وغیرہ پر بھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے محیط و وسیع مذہب کے لئے نہ قرآن کافی ہو سکتا تھا نہ سنت متواترہ۔ مسائل دنیاوی کے انصرام کے لئے خدا وحی نہیں اُتارا کرتا اور اگر اُتارتا ہے تو اُسکو عقل و تجربہ انسانی و ماحول و زمانہ کی مناسبت سے محکم نہیں کرتا۔ مگر یہود کے فریسیوں کے بعد مسلمانوں کو یہ طرۂ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اگر کپڑا یا جوتا پہنیں گے یا کھانا کھائیں گے تو اس فتوے کے منتظر رہیں گے کہ فقہ کے رُو سے اُن کا کونسا فعل حرام ہے اور کون سا حلال۔ موجودہ زمانے میں مسلمانان عالم کا تقریباً ۹/۱۰ حصہ ایسے ملکوں میں آباد ہے۔ جہاں کی دنیاوی شریعت اسلامی شریعت کی محتاج نہیں۔ باوجودیکہ مسلمانوں کا کاروبار آسانی سے چل رہا ہے۔ عربی مدرسے کا ملّا اس فقہ کو رٹتا ہوا پایا جاتا ہے۔ جو خلافت عباسیہ کی یادگار ہے۔ اس کے نزدیک اب بھی دنیا دارالحرب اور دارالاسلام میں تقسیم ہے اور دارالحرب میں صرف کافروں کو رہنا چاہئے تاکہ دارالاسلام کے مسلمان اُن سے جہاد کر سکیں اور اُن کے عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر غلام بنا سکیں۔ بقول مسٹر امیر علی ــــ "اسلام کے عمومی اصول اسکیمو کی قوم میں پھیلائے جا سکتے ہیں مگر یہ کتنا بڑا غضب ہے کہ تیسری صدی ہجری میں وہ قانون جو عراق کی آب و ہوا و معاشرت کے لحاظ سے مرتب ہوا تھا مذہب اسلام کے جز میں شامل کر لیا جائے۔"

امام ابو حنیفہؒ جن کا زمانہ سنہ ۸۰ھ کا ہے۔ انھوں نے جس فقہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ ایک حد تک حدیث کی سند سے مستغنی تھی۔ اُن کے اُصول فقہ میں قیاس و رائے کو زیادہ دخل تھا۔ وہ دس بارہ حدیثوں کے واقف تھے۔ مگر اس پر بھی اُن کو اطمینان نہ تھا۔ نہ غالباً دنیا میں اسوقت حدیث کا اتنا چرچا ہوا تھا جو کہ بعد دو صدی میں ہوا ہے۔ امام مالکؒ جن کا زمانہ ۱۲۰ ہجری کا ہے وہ اپنی موطا میں تین چار سو حدیثیں ایسی دستیاب کر سکے جو اُن کے نزدیک قابل اعتبار تھیں۔ لیکن امام حنبلؒ جن کا زمانہ ۲۰۰ ہجری کا ہے اُن کی فقہ میں متعدد حدیثیں ہیں جو اُن کے زمانے تک ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچ گئی تھیں۔ امام حنبل سے پہلے امام شافعیؒ کا زمانہ تھا جنھوں نے گو کہ خود کوئی حدیث کی کتاب نہیں لکھی۔ اُن کے متبعین نے تقریباً اس زمانے میں متعدد حدیثیں فراہم کر دیں جو حنابلہ میں تھیں۔ یعنی:ـــ

| | | |
|---|---|---|
| امام ابو حنیفہؒ | ۸۰ ہجری | دس یا گیارہ حدیثیں |
| امام مالکؒ | ۱۲۰ ہجری | دو یا تین سو حدیثیں |

امام شافعیؒ ۱۷۵ ہجری صحاح ستہ جو شافعیوں کی مرتب کردہ ہیں اور جن کی تعداد تقریباً سات ہزار سے زائد ہے۔

امام حنبلؒ ۲۲۰ ہجری مسند امام حنبلؒ میں حدیثوں کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے۔

یہ حدیثیں کیسی ہیں۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

حدیث بجائے خود کوئی چیز ایمان لانے کی نہیں ہے۔ اگر کسی مسلمان کو اس بات کا قطعی یقین ہو جائے کہ جو کچھ بخاری و مسلم میں لکھا ہوا ہے وہ عین فرمودہ رسول ہے تو پھر کوئی بحث باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کا نہ ماننا گویا رسالتمآب سے سرکشی کرنا ہے اور اس کی جرأت کسی مومن کو نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ صاحب عقل و علم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کے قابل نہیں کہ حدیث کی کوئی کتاب ایسی ہے — جس پر آنکھ بند کر کے عمل کیا جائے۔ یا کم سے کم کسی مسلمان کو اس کی توفیق ہوئی کہ عقل و درائت سے کام لیکر جواہرات کو خذف ریزوں یا بمعنی دیگر رسول اللہ کے حقیقی اقوال کو راوی کے وہم و گمان و قول سے جدا کر دیتا۔ شرح اصول بزدوی میں مرقوم ہے کہ ابو عمرو دمشقی نے لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے ایسی جماعت سے استشناد کرتے ہوئے اپنی کتاب میں اُن کی روایات کو جگہ دی ہے جیسے عکرمہ۔ اسمٰعیل عاصم اور عمرو بن فرزوق وغیرہ حالانکہ اُن کی نسبت متقدین اور محققین نے جرح کی ہے۔ امام مسلمؒ نے بھی سوید بن سعید وغیرہ سے استشناد کیا ہے جس پر اوروں نے طعنہ دیا ہے۔ امام دار قطنیؒ نے فرمایا ہے کہ دو سو دس حدیثیں صحیحین کی ضعیف ہیں۔ جن میں سے اسّی مخصوص بہ بخاری اور تیس مخصوص بہ مسلم اور ایک سو دونوں میں مشترک۔ لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سی حدیثیں ہیں جن کی عدم صحت پر نہ صرف متقدین اور محققین نے سنداً جرح کی ہے بلکہ متن میں بھی ایسے تاریخی اور عقلی اور قرآنی معارضات ہیں جیسا ان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا جو ہر صاحب ہوش و عقل کو اسی نتیجہ پر پہنچائینگے یعنی اگر ابن جوزیؒ کے ان مشہور اصول پر صحاح کو دیکھا جائے تو نصف سے زیادہ حدیثیں ساقط الاعتبار قرار پائینگی۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم نے صحاح کو ان اصول سے بالا رکھ لیا ہے۔ ابن جوزیؒ کے اصول یہ ہیں :—

"جس حدیث کو عقل کے مخالف یا اصول کے خلاف دیکھو سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے۔ پھر اسکے راویوں کے جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں ہے۔ یا حدیث میں ایسا بیان ہو جو حس و مشاہدے کے برخلاف ہو۔ یا نص قرآن یا سنت متواترہ یا اجماع کے اس طرح سے مخالف ہو کہ کسی طرح تاویل کی گنجائش نہ ہو۔ یا اس میں ادنیٰ سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہو یا معمولی اور تھوڑے سے کام پر بڑے بڑے انعام کا وعدہ کیا گیا ہو۔ اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور بازاریوں کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ یا اکیلا ایک شخص ایسے لوگوں سے روایت کر رہا ہے کہ ان کے دوسرے شاگرد اس حدیث کو بیان نہیں کرتے یا ایسی حدیث کی روایت تنہا ایک ہی شخص بیان کر رہا ہو کہ جس کے

Marfat.com

مضمون کا جاننا تمام مکلفین کے لیے بلا کسی عذر کے ضروری ہے۔ یا حدیث میں کسی ایسے بڑے کام کا تذکرہ ہو جسکے لیے بہت سے وسائل دریافت ہوا کرتے ہیں یا حدیث میں ایسی بات موجود ہو کہ جسکے جھوٹ ہونے کی ایسی بڑی جماعت نے تصریح کی ہو جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا اور ایک دوسرے کی تقلید سے جھوٹ بولتے رہنا عادتاً کبھی دیکھا نہ گیا ہو۔"

حافظ ابن حجر نے اپنی نزہتہ النظر شرح نخبتہ الفکر میں لکھا ہے کہ

موضوع ہونے کا پتہ اس طرح مل سکتا ہے کہ وہ قرآن یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی یا عقل درست کے اس طرح متناقض ہو کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو تو وہ حدیث موضوع قرار پائے گی۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے رسالہ عجالہ نافعہ میں حدیث کی شناخت کے حسب ذیل اصول لکھے ہیں :۔

(۱) مشہور تاریخ کے خلاف راوی روایت کرے۔

(۲) اس کا راوی رافضی ہو یا ناصبی ہو۔

(۳) ایسی بات کہے کہ جس کا جاننا اور عمل کرنا سب پر فرض ہو مگر صرف وہی شخص یہ روایت کرتا ہو۔

(۴) مقتضائے وقت اور قرینہ حالیہ اس کے جھوٹے ہونے پر دلالت کرے۔

(۵) عقل اور قواعد شرعیہ کے اس طرح مخالف ہو کہ وہ اس کی تکذیب کریں۔

(۶) راوی ایک ایسا قصہ بیان کرے کہ اگر وہ حقیقت میں ہوا ہوتا تو ہزاروں آدمی اس کو دیکھ کر بیان کرتے۔

(۷) لفظوں میں یا معنی میں رکاکت ہو یعنی کوئی راوی ایسے لفظ کے ساتھ روایت کرے جو [illegible] ہو یا ایسے معنی بیان کرے جو وقار اور شان نبوت کے خلاف ہوں۔

(۸) چھوٹے سے گناہ میں نہایت سخت عذاب یا چھوٹے سے نیکی کے کام میں بہت زیادہ ثواب کا بیان ہونا۔

(۹) چھوٹے چھوٹے کاموں پر حج وعمرہ کے ثواب ملنے کا بیان ہو۔

(۱۰) کسی کو مثل انبیاء کے مستحق ثواب کا کسی کام میں بیان کیا ہو۔

(۱۱) حدیث کے بیان کرنے والے نے اسکے جھوٹے ہونے کا خود اقرار کیا ہو۔

ان بزرگوں کے اصول اس بات پر گواہی دے رہے ہیں کہ کسی حدیث کا معیار یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ راوی ایک ایسے سند سے کام لے رہا ہے جو سب ثقہ ہیں۔ یا روایت ایسی کتاب میں ہے جس کو متبرک یا مقدس ہاتھوں نے ترتیب دیا ہے۔ بلکہ اس کو عقل و قرآن و تاریخ کے معیار سے جانچنا چاہئے۔ محمد بن علی قاضی شوکان نے اپنی کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں بہت سی حدیثوں پر سکوت کیا ہے اور ان کے ضعف کا کچھ ذکر

نہیں کیا۔ البتہ منذری شارح ابوداؤد نے بہت سی حدیثوں کا مدلل طور پر ضعف بیان کیا ہے۔ اور ایسا ہی حال مسند امام حنبل کی حدیثوں کا ہے "۔ ترمذی کی نسبت تو یہاں تک کہا گیا کہ اُن کے حسن کہنے پر مت جاؤ۔ نسائی سے پوچھا گیا۔ کتاب سنن تو ہمہ صحیح ست۔ گفت لا۔ ابن ماجہ کی حدیثیں تو اس قدر ضعیف ہیں خصوصاً قزوین والی حدیث کہ بعض علمار نے ابن ماجہ پر طعن کیا ہے اور اُن کے سنن کو صحاح ستہ سے خارج کر دیا ہے۔

پس حدیث کے متعلق یہ اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد۔ اس کا حلال و حرام۔ جواز و عدم جواز مشکوک روایات پر قائم ہو سکتا ہے یا قرآن کے صریح احکام کے مقابل مشکوک روایتوں کو ترجیح دیجائے گی۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو کسی حدیث کو اسلئے مان لینا کہ بخاری شریف کے صفحوں میں موجود ہے اگر بخاری پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک محقق کا قول[1] ہے۔

"ہماری نگاہ میں سارا مجموعہ احادیث قرآن کے ایک حرف کی قیمت نہیں رکھتا۔ جب ہم امام یحییٰ بن معین وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل کے یہ الفاظ سنتے ہیں کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے یا علمار اصول کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ سنت قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے تو اس روایت پرستی پر ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ ہم تو ان لوگوں کو اہل علم مانتے ہیں جنکی نسبت قرآن کہتا ہے۔ ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیك من ربك هو الحق (جن کو علم دیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ تیرے تیرے رب کیطرف سے اُتارا گیا ہے وہی حق ہے) یقیناً حدیث پرستوں کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ ہم جھوٹ اور سچ کو جانچ لیتے ہیں اور ائمہ حدیث نے بخاری وغیرہ کی حدیثوں کو تنقید کر کے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ رواۃ کی صداقت ایک باطنی وصف ہے جس پر قطعی شہادت ہو ہی نہیں سکتی اسلئے یہ شہادت خود ظنی ہے اور ازیں قبیل حدیث کی تصحیح اور تغلیط کے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں وہ بجائے خود صحیح نہیں ہیں۔ اہل نظر متکلمین نے قدم قدم پر اختلافات کئے مگر شخصیت پرستی کے جذبے میں محدثین نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور انھیں کمزور اصولوں پر حدیث کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس صورت میں ہم ہر راوی کے بیان کو اسی کا قول سمجھتے ہیں نہ کہ قول رسول اور قرآن نے یہ زرّیں اصول سکھایا ہے "وان تطع اکثر من فی الارض یضلوك عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن" (روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت کرو تو اللہ کے راستے سے وہ تم کو گمراہ کر دیں گے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر ظن کی) علمائے حدیث احادیث کو ظنی قرار دیتے ہیں اور ظنیات سے دین کا کام نہیں چلتا " ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً (ظن حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا) امام غزالی المستصفی میں کہتے ہیں (جلد اوّل صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ مصر) خبر الواحد لا یفید العلم (خبر واحد مفید یقین نہیں ہے) خبر واحد کس کو کہتے ہیں یہ بھی اسی صفحے میں انھیں کے قلم سے دیکھئے " انا نرید بخبر الواحد فی هذا المقام ما لا ینتهی

---

[1] ایک مسلمان (اغلباً مولانا اسلم جیراجپوری) نگار اکتوبر ۱۹۳۰ء

Marfat.com

الی حد المتواتر فما رواه خمسة او ستة مثلاً فهو خبر الواحد" (ہم خبر واحد سے اس مقام پر وہ حدیث مراد لیتے ہیں جو حد تواتر تک نہ پہونچتی ہو مثلاً جو حدیث ایک جماعت یا پانچ چھ راویوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے) بیشک متواتر یقینی ہے کیونکہ تواتر یقینیات کی ایک قسم ہے۔ مگر متواتر حدیث کے وجود ہی میں بحث ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین حدیثیں ہیں جنکو لوگوں نے متواتر کہا ہے۔ امام بن صلاح اور ابن تیمیہ کا ذکر چھوڑیئے۔ کیونکہ ان حضرات کو حدیث کے معاملہ میں غلو ہے۔ بخاری اور مسلم کی حدیثیں جو جملہ ائمہ حدیث کے نزدیک غیر متواتر اور ظنی ہیں اُن کے نزدیک یقینی ہیں اور بجز اپنے عقیدے کے اور کوئی دلیل اُن کے پاس نہیں۔ قرآن کریم میں ہے ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم (بعض لوگ حدیث کے مشغلے کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں) اس میں بغیر علم کا لفظ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ ائمہ حدیث نے حدیث کو مفید علم قرار نہیں دیا ہے۔ قرآن میں ہے یرید اللہ لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم (اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کردے اور تم کو اگلوں کے راستے کی ہدایت کرے) اللہ جس سنت کو خود بیان کرنا چاہتا ہے وہ وہی ہے جو اُس نے انبیائے سابقین کو سکھلایا تھا۔ اور اسی کو ہماری ہدایت کیلئے ہمارے واسطے بیان کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ وہی صراط مستقیم ہے جس کی ہدایت ہم ہر نماز میں مانگتے ہیں۔ یعنی ایمان۔ تقویٰ۔ تزکیہ نفس۔ اصلاح اعمال۔ ادائے فرض و حقوق وغیرہ جن کے ساتھ دنیا اور آخرت کی سعادت وابستہ ہے اور جو آسمانی دین ہے نہ کہ اس قسم کی سنت کہ رسول اللہ نے زندگی بھر تہمد اور عمامہ باندھا۔ داڑھی چھوڑی اور مونچھ ترشوائی۔ حلوہ اور شہد پسند فرماتے تھے اور دنیا کی چیزوں میں سے عورت اور خوشبو مرغوب خاطر تھیں وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ شخصی حالات ہیں جو تاریخ ہیں نہ کہ دین۔"

ایک دوسرے حنفی عالم نے کہا ہے۔[۵]

"احادیث کی دو قسم ہیں۔ متواتر اور احاد۔ متواتر حدیث بلاشبہ رسول اللہ صلعم کی تعلیمات ہیں۔ مگر متواتر بہ معنی حقیقی بہت کم اور نہایت کم ہیں۔ اور وہ بھی کتابی روایات کے ذریعے سے نہیں بلکہ زبانی روایات کا سلسلہ ملانے کے بعد مثلاً تعداد رکعت۔ فرض۔ صلوٰۃ وغیرہ۔ اب رہیں غیر متواتر یعنی احاد۔ ان میں جو محدثین کی تحقیقات میں درجہ صحت کو پہونچ گئی ہیں وہ بھی یقینی طور پر نہیں مگر ظن غالب کے طور پر رسول اللہ صلعم کا یا مذہب شیعہ میں ائمہ معصومین کا ارشاد کہی جا سکتی ہیں۔"

ان احادیث صحیحہ پر عمل کرنے میں مجتہدین کا باہم اختلاف ہے اور اس اختلاف میں ایک کا دوسرے کو کسی درجہ میں بھی قابل ملامت نہ قرار دینا بلکہ واجب الاکرام سمجھنا ان احادیث کے مرتبہ کی کافی شہادت ہے۔ ان احادیث کا درجہ

---

[۵] مولانا عبدالشکور۔ النجم نمبر ۱۹۔ ۲۰۔ جلد ۹۔

Marfat.com

معلوم کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ آجتک کسی سنی عالم نے کسی شیعہ عالم کو اس بنا پر کافر نہیں کہا کہ شیعہ صحیح بخاری کی احادیث کو غلط سمجھتے ہیں اور نہ کسی شیعہ عالم نے کسی سنی کو اس بات پر کافر کہا کہ سنی کتاب کافی کی روایت کو کذب محض جانتے ہیں۔ غرضیکہ یہ احادیث ظنی ہیں اور صرف عمل کے لئے اور عمل میں ہی اختلاف مجتہدین کی گنجائش ہے۔ لہذا اصل مذہب یعنی اعتقادات کی بنیاد ان احادیث پر نہیں ہے جیسا کہ محدثین اور اصولیین نے اس کی تصریح کردی ہے امت اسلامیہ کے پاس سوائے قرآن مجید کے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس کو پورے یقین اور کامل حزم کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم کہا جاسکے۔ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کو مسلمان جس اعتقاد و یقین کے ساتھ اللہ کا کلام جانتے ہیں اسی یقین کے ساتھ غیر مسلم اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف کی ہوئی کتاب خیال کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب کے بعض ارکان کی کوئی صراحت قرآن میں نہیں ہے اگرچہ انکا ذکر ہے۔ ہم کو لامحالہ ان کی تفسیر کے لئے حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ پھر جب حدیث کی کوئی دینی قیمت نہیں تو قرآن کے ان الفاظ کی جو حقیقتاً تشریح کے محتاج ہیں سمجھنے کی کیا صورت۔ سوال نہایت معقول ہے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ حدیث نے قرآن کی جو تشریح کی ہے اُس کی ضرورت سنت متواترہ اور خود قرآن کے صاف و سلیس عبارت سے باقی نہ تھی اور جو کچھ اس سے زیادہ کی ہے وہ عقل و نقل و خود قرآن کے مطالب سے اس درجہ بیگانہ ہے کہ درحقیقت حدیث میں سب سے زیادہ اس مواد کے حذف کی ضرورت ہے۔ جو تفسیر قرآن یا شان نزول کے ضمن میں بالعموم حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ مثالاً میں یہاں چند باتیں پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تاریخ نزول قرآن ہی کو لے لو جس کی روایت بخاری کے سب سے پہلے صفحے پر ہے اور جس کو تقریباً تمام صحاح ستہ نے نقل کیا ہے۔ باوجودیکہ وہ اتنی مشہور و متواتر حدیث ہے۔ نہ صرف درائتاً ناقابل اعتبار ہے بلکہ خود حدیث میں ہی اس کی تردید موجود ہے۔ حدیث یہ ہے:—

"پہلے پہل جو وحی رسول اللہ صلعم پر شروع ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ آپ کا خواب سچا ہونے لگا تو آپ جب کوئی خواب دیکھتے تو وہ صبح کی روشنی کی طرح نمودار ہوتا۔ پھر آپ کو تنہائی کا شوق ہوا۔ آپ غار حرا میں اکیلے تشریف رکھتے تھے۔ وہاں عبادت کیا کرتے تھے کئی کئی دنوں تک گھر میں نہ آتے تھے۔ اپنا توشہ ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر حضرت خدیجہ کے پاس لوٹ کر آتے اور وہ توشہ اتنا ہی تیار کردیتیں یہانتک کہ ایکا ایک آپ پر وحی اُتری۔ آپ اسی حرا کے غار میں تھے کہ فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اُس نے کہا پڑھو۔ آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر فرشتے نے پکڑ کر دبوچا اتنا کہ وہ تھک گیا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا اقراء باسم ربك الذی خلق الی آخرہ۔ یہ سنکر رسول اللہ صلعم لوٹے اور آپ کے مونڈھے اور گردن کے بیچ کا گوشت پھڑک رہا تھا۔ یہانتک کہ پہنچے حضرت خدیجہ کے پاس اور آپ نے فرمایا مجھے کپڑے سے ڈھانک دو۔ اُنھوں نے ڈھانپ دیا۔ یہانتک کہ آپ کا ڈر جاتا رہا۔ اسوقت آپ نے بی بی خدیجہ سے فرمایا اے خدیجہ مجھے

Marfat.com

کیا ہوگیا ہے اور سب حال بیان کیا اور کہا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ خدیجہ نے کہا ہرگز نہیں آپ خوش ہوجئے قسم اللہ کی۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو کبھی رسوا نہ کریگا یا کبھی رنجیدہ نہ کریگا۔ آپ تو اللہ کی قسم ناتے کو جوڑتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں بوجھ اُٹھاتے ہیں اور ناداروں کے لئے کمائی کرتے ہیں اور خاطرداری کرتے ہیں مہمان کی۔ اور آفتوں میں مدد کرتے ہیں لوگوں کی۔ پھر خدیجہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور وہ خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے اور جاہلیت کے زمانے میں نصرانی ہوگئے تھے اور عربی لکھنا جانتے تھے تو انجیل کو عربی میں پڑھتے تھے اور بہت بوڑھے تھے۔ اُنکی بینائی جاتی رہی تھی۔ خدیجہ نے کہا اُن سے اے چچا اپنے بھتیجے کی سنو۔ ورقہ نے کہا اے میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو۔ رسول اللہ صلعم نے جو کیفیت دیکھی سب بیان کردی۔ ورقہ نے کہا یہ تو وہ ناموس ہے جو موسیٰ پر اُترا تھا۔ کاش میں اُس زمانے میں جوان ہوتا۔ کاش میں زندہ رہتا اس وقت تک جب تمہاری قوم تم کو نکالے گی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کیا وہ ہم کو نکال دیگی ورقہ نے کہا ہاں۔ جب کوئی شخص دنیا میں وہ لیکر آیا جس کو تم لائے ہو تو لوگ اس کے دشمن ہوگئے اور میں جو اُس دن کو پاتا تو اچھی طرح تمہاری مدد کرتا۔"

حدیث اچھی ہے اور ماننے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ مگر ذرا قرآن شریف میں سورہ اقراء کو نکال کر پڑھو خصوصاً ان آیتوں پر غور کرو۔ ارءیت الذی ینھی۔ عبداً اذا صلّی۔ ارءیت ان کان علی الھدیٰ۔ او امر بالتقویٰ۔ ارءیت ان کذّب وتولّٰی۔ الم یعلم بان اللہ یریٰ (کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے کیا تم نے دیکھا کہ وہ راہ راست پر ہے یا تقویٰ کا حکم دیتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا کہ کس طرح وہ جھٹلاتا ہے اور اپنی پیٹھ پھیرتا ہے۔ کیا اُسکو معلوم نہیں کہ اللہ اس کو دیکھتا ہے۔)

کلّا لئن لم ینتہ۔ لنسفعاً بالناصیۃ۔ ناصیۃ کاذبۃ خاطئۃ۔ فلیدع نادیہ سندع الزبانیۃ

کیا یہ آیتیں خود ثابت نہیں کررہی ہیں کہ یہ سورہ اسوقت نازل ہوئی ہوگی جب مسلمانوں میں نماز قائم ہوچکی تھی۔ اسلام کی تبلیغ ہورہی تھی۔ کفار اس کی مخالفت کررہے تھے اور ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ آیت اُسوقت نازل ہوئی جبکہ آپ نے اپنا نبوت کا کام ہی شروع نہ کیا تھا۔ نہ کفار میں اسلام پیش کیا تھا۔ پھر دیکھو۔ اقراء کے صحیح معنی نہ جاننے پر واضع نے کیسی عجیب وغریب روایت وضع کی ہے۔ راوی پریشان ہے کہ اقراء کا حکم کیسے دیا گیا آنحضرت تو پڑھنا بھی نہ جانتے تھے۔ اسلئے ضرورت ہوئی کہ حضرت جبرئیل اُن کو پکڑ کر دبائیں اور اس طرح پڑھنے کی قابلیت آپ کے جسم میں سرائت ہوجائے تاکہ یہ آیت جو بقول بعض صابی پرستوں کے سبز حریر پر جلی قلم سے لکھا ہوا تھا پڑھ سکیں۔ مگر اقراء کے معنی صرف کتاب سے دیکھ کر پڑھنے ہی کے نہیں ہیں۔ یہ ایک عبرانی لفظ ہے جس کے معنی پکارنے اور اعلان کرنے کے بھی ہیں۔ اور اسی لفظ سے انگریزی کا لفظ (cry) "کرائی" بنا ہے۔ چنانچہ یرمیاہ و یسعیاہ نبی کے نوشتوں میں عبرانی کا جو لفظ "قرا" آیا ہے اس کا ترجمہ انگریزی میں "کرائی" کیا گیا ہے۔ تیسری غلطی اس میں یہ ہے کہ

ورقہ بن نوفل (غالباً ایک فرضی شخص جنکا حضرت خدیجہ سے رشتہ نہ کوئی عرب کا نساب جانتا ہے اور نہ اُن کی کسی اولاد کا عرب میں پتہ چلتا ہے) کو نصرانی ظاہر کیا گیا ہے۔ اوّل تو مکہ میں کوئی قریش جاہلیت میں عیسائی نہیں ہوا اور نہ وہ لوگ عیسائیت سے واقف تھے۔ دوسرے انجیل اسوقت سوائے یونانی زبان کے نہ عربی میں تھی نہ عبرانی میں۔

مگر خود اس تمام روایت کی تردید بخاری و مسلم میں موجود ہے یعنی :۔

"ابوسلمہ نے جابر بن عبداللہ سے پوچھا۔ قرآن میں سب سے پہلے کیا اُترا۔ انھوں نے کہا یا ایھا المدثر۔ میں نے کہا یا "اقراء"۔ جابر نے کہا میں تم سے وہ حدیث بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ صلعم نے ہم سے بیان کی تھی۔ آپ نے فرمایا میں حرا میں ایک مہینے تک رہا۔ جب میری مدت رہنے کی پوری ہوگئی تو میں اُترا اور وادی کے اندر چلا کسی نے مجھے آواز دی میں نے سر اُٹھایا۔ دیکھا تو جبرئیل ہوا میں تخت پر بیٹھے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت لرزہ چڑھ آیا۔ تب میں خدیجہ کے پاس آیا اور میں نے کہا کہ مجھے کپڑے اڑھا دو۔ مجھے کپڑے اڑھا دو اور پانی میرے اوپر ڈالو۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں اُتاریں یا ایھا المدثر قم فانذر و ربک فکبر۔ الیٰ آخرہ"

یہ حدیث بھی صحیح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس سورہ میں کفار مکہ کی اس مخالفت کا ذکر ہے جبکہ وہ قرآن کا ایک بڑا حصہ سن چکے تھے۔ انہ فکر و قدر۔ فقتل کیف قدر ثم قتل کیف قدر۔ ثم نظر ثم عبس و بسر۔ ثم ادبر و استکبر۔ فقال ان ھذا الا سحر یوثر۔ ان ھذا الا قول البشر۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس سورہ میں اس کا بھی اشارہ ہے کہ بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

وما جعلنا عدتھم الا فتنۃ للذین کفروا لیستیقن الذین اوتوا الکتٰب و یزداد الذین امنوا ایمانا

پھر واضع نے مدثر کے لفظی معنی لیکر اُس کی تاویل میں کیسی بھونڈی بات گڑھی ہے۔ حالانکہ خود قرآن میں ایسے بہت سے اصطلاحی الفاظ ہیں جن کے لفظی معنی مراد نہیں ہوتے۔ و ابصارھم غشاوۃ۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم۔ یوم یکشف عن ساق۔ رب اشرح لی صدری۔ الم نشرح لک صدرک۔ ید اللہ مغلولۃ کیا مدثر کے معنی حالت جذب میں ہونا زیادہ مناسب نہیں ہے۔

اب تم خود نتیجہ نکال سکتے ہو کہ حدیث میں مشہور باتوں کے متعلق بھی کسقدر اختلاف و قرآن کے صریح مخالف و متضاد باتیں ہیں۔ حالانکہ ہر قرائن سے قرآن میں کم سے کم تیسویں پارے کی ترتیب یعنی آخری سورہ قل اعوذ بین کو اولین سورہ قرار دیکر پیچھے کی سورتوں کو دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ خود قرآن میں جو ترتیب ہے وہ صحیح ترتیب ہے۔ کم سے ۲۸ پارے تک یعنی قبل ہجرت حبشہ۔

تفسیر قرآن کی ہی دو ایک مثالیں لے لو۔

"لا تحرک بہ لسانک"۔ یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مت ہلا اپنی زبان کو۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جب

جبریل آپ کے پاس وحی لیکر آتے آپ وحی کو سنتے جاتے تھے اور اپنی زبان اور ہونٹوں کو بھی ہلاتے جاتے تھے۔ اس میں بڑی مشکل ہوتی اور یہ سختی آپ کے چہرے سے ظاہر ہوتی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری (اس کے بعد راوی نے آیت کو پڑھا ہے۔ جس کے بعض الفاظ موجودہ قرآن میں نہیں ہیں۔)

کیا خود قرآن کے الفاظ اس تفسیر کو باقی رکھتے تھے۔ اس روایت میں غضب یہ ہے کہ تفسیر اس بُری طرح سے کی ہے کہ روای نہیں سمجھتا کہ قرآن کے اصل الفاظ کیا ہیں اور تفسیر کیا ہے دونوں کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔

تفسیر "انا اعطینٰک الکوثر" ایک دن رسول اللہ صلعم ہم لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں آپ کو ایک غفلت سی ہوئی۔ پھر سر اُٹھایا ہنستے ہوئے۔ ہم نے کہا آپ کیوں ہنسے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کوثر ایک نہر ہے جسکا وعدہ مجھ سے میرے پروردگار نے کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی ہے۔ وہ ایک حوض ہے جس میں قیامت کے دن میری اُمت کے لوگ پانی پینے کو آئینگے۔

راوی نے کوثر کے معنی سے روایت تو پیدا کرلی۔ مگر اس کو خیال نہ آیا کہ حضرت انس جن کی سند سے وہ روایت بیان کر رہا ہے وہ مکہ میں موجود ہی نہ تھے بلکہ مدینہ میں اور اس وقت اُن کی عمر ۶ یا ۷ سال کی تھی اور یہ آیت ابتدائی مکی آیت ہے جسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کفار قریش کے طعنہ کا جواب ہے "ان شانئک ھو الابتر"

ایک مثال شان نزول آیت قرآن کی بھی لے لو۔

"ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ نکلے ایک سفر میں۔ جب بیدا یا ذات الجیش میں پہونچے (خیبر اور مدینے کے درمیان) تو میرا گلے کا ہار ٹوٹ گیا اور رسول اللہ صلعم اس کے ڈھونڈھنے کے لئے ٹھیر گئے۔ لوگ بھی ٹھیر گئے۔ وہاں پانی نہ تھا نہ لوگوں کے پاس پانی تھا۔ لوگ ابوبکر کے پاس آئے اور کہنے لگے تم نہیں دیکھتے عائشہ نے کیا کیا ہے۔ رسول اللہ کو ٹھیرا دیا ہے اور لوگوں کو بھی جہاں پانی نہیں۔ نہ ان کے ساتھ پانی ہے۔ یہ سُنکر ابوبکر آئے اور رسول اللہ صلعم اپنا سر میری ران پر رکھے ہوئے سو رہے تھے۔ اُنھوں نے کہا تو نے روک رکھا ہے رسول اللہ صلعم کو۔ اور لوگوں کو۔ یہاں نہ پانی ہے اور نہ لوگوں کے پاس پانی ہے اور غصہ کیا انھوں نے اور کوسا میں میرے کوچے دینے لگے اپنے ہاتھ سے میں ضرور ہلتی مگر حضرت کا سر میری ران پر تھا اسوجہ سے نہ ہل سکی۔ پھر آپ سوتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور پانی بالکل نہ تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت اُتاری۔ اسید بن حضیر نے کہا اے ابوبکر کی اولاد یہ کچھ پہلی برکت نہیں ہے تمھاری۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ پھر ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا جسپر میں سوار تھی تو ہار اُس کے نیچے سے نکلا۔"

اگرچہ بادی النظر میں اس روایت میں کوئی بات خلاف قیاس نہیں ہے۔ مگر تنقید صحیح کی روشنی میں یہ روایت مشکوک ہوجاتی ہے۔ اوّل تو قرآن شریف میں تیمم کا حکم علیحدہ نہیں دیا گیا بلکہ سورۃ مائدہ رکوع ۲۔ آیت ۶ میں

Marfat.com

وضو کے ساتھ ہی تیمم کا ذکر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سورۃ نساء میں تیمم کے بارے میں جو آیت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم کی اجازت اسوقت بھی تھی جبکہ مسلمانوں میں ابھی شراب بھی حرام نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ کے ہار کی قیمت کیا تھی۔ اگر بیش بہا چیز تھی تو آنحضرت کے گھر میں اُس کا وجود کیسا۔ اور اگر اُس کی کوئی قیمت نہ تھی تو صحرا و بیابان میں ایک کم قیمت چیز کے لئے سارے مسلمانوں کو پریشان کرنا کیا معنی۔ کیا جس نبی کے سامنے تمام دنیا کی دولت خزف ریزہ سے زیادہ نہ تھی وہ ایک معمولی ہار کے لئے اس قدر پریشان ہو اور دوسروں کو پریشان کرے۔ راویوں نے بھی شاید اس مشکل کو معلوم کیا تھا کیونکہ دوسری روایت میں ہار حضرت اسماء کا کر دیا جاتا ہے جو حضرت عائشہ کے پاس امانتاً تھا۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیمم کی اجازت سے لوگوں کی تشنگی اور ضرورت کس طرح رفع ہوئی۔ ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ پانی خوب برسایا کہیں سے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا تو کوئی بات تھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیفکری سے حضرت عائشہ کے زانو پر سر رکھ کر سو رہنا (راوی ہمیشہ آنحضرت کو حضرت عائشہ کے زانو پر سر رکھ کر سلایا کرتے ہیں۔) عجیب ہے۔ حالانکہ سارا قافلہ جس واسطے ٹھہرایا گیا تھا وہ سونے کے لئے نہ تھا بلکہ ہار کی تلاش کے لئے۔ اس مشکل کو سمجھ کر بعض راویوں نے روایت میں یہ تبدیلی کر دی کہ آنحضرت نے کچھ آدمیوں کو ہار ڈھونڈھنے کے لئے اور جگہ بھیجدیا تھا مگر یہ لوگ اُس جگہ سے ہی بھیجے جا سکتے تھے جہاں پانی دستیاب ہو سکتا ہو۔ پھر حضرت ابوبکر کا آنحضرت کے آرام میں خلل ڈالنے کا خیال نہ کرنا وہ بھی بعید ہے۔

وضو اور تیمم کے بارے میں ایک دوسری متفق علیہ مگر موضوع روایت پر مولانا تمنا عمادی کا ایک مختصر مضمون رسالہ البیان سے نقل کیا جاتا ہے جسکو پڑھنے کے بعد صحیحین کی روایتوں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ وھو ھذا

"اُمت میں اسقدر اختلاف دینی مسائل میں کیوں ہوئے، اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ بنام الانصاف فی وجوہ الاختلاف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، جس کا اُردو ترجمہ مولانا مودودی صاحب کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی شائع کر رہے ہیں۔ اس کی پہلی قسط ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء کی مشترکہ اشاعت "ترجمان القرآن" کے صفحہ ۷ سے صفحہ ۳۲ تک شائع ہوئی ہے میں نے اصل عربی رسالہ بھی ایکبار دیکھا تھا اور اسکو شاہ صاحبؒ کے ایک سطحی فکر کا نتیجہ قرار دیکر چھوڑ دیا تھا۔ اسوقت بھی اس پورے رسالے کی تنقید مقصود نہیں ہے۔ مگر صرف یہ دکھا دینا چاہتا ہوں کہ روایت پرستی کس طرح لوگوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے کہ ان کو ایسی باتیں جو بالکل خلاف عقل ہیں، وہ بھی خلاف عقل نہیں معلوم ہوتیں۔ حضرت شاہ صاحب کا زمانہ تو وہی اگلی روایت پرستی کا زمانہ تھا جو ان سے قبل کے محدثین سے شروع ہو چکا تھا۔ مگر آج کل تو پھر "سلفیت" عود کر رہی ہے اور بخاری و مسلم کی پرستاری پر اہلِ عقل و ایمان تیار نہیں ہیں۔ ایک جماعت تو سرے سے کسی حدیث کی بھی دین میں مطلقاً ضرورت ہی نہیں سمجھتی۔ مجھ جیسے لوگ اگر مطابق کتاب اللہ پاکر بعض حدیثوں کو قبول بھی کر لیتے ہیں تو کافی تحقیق و تدقیق کے بعد، اور

Marfat.com

روایات سے ایک عام بدظنی مسلمانوں کے نئے طبقے میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس وقت مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی اور مولانا مودودی صاحب اگر کسی روایت کو پیش کریں تو محدثین ہی کے اصول کے مطابق ذرا اسکو جانچ تو لیا کریں۔ آخر اپنے ساتھ حضرت شاہ صاحب کو بھی مورد مطاعن کیوں بنواتے ہیں؟ ایسے مضامین کی اشاعت سے لوگوں کے شبے تو رفع نہ ہوں گے۔ البتہ کچھ نئے شبہے ضرور پیدا ہو جائیں گے۔

"ترجمان القرآن" کے مذکورہ پرچے کے صفحہ ۲۰ پر وجوہ و اسباب اختلاف بیان کرتے ہوئے ایک سبب "احادیث نبوی سے واقفیت و عدم واقفیت" بتاتے ہوئے ایک صورت یہ بھی بتائی ہے کہ ایک صحابی کو وہ حدیث ملی ہو، دوسرے کو نہ مل سکی ہو، اسلئے دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسکی دوسری مثال یوں بیان فرماتے ہیں:-

"دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ عمر بن الخطابؓ کا خیال تھا کہ اگر جنبی کو غسل کے لئے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عمارؓ بن یاسر نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک[1] مرتبہ رسول اللہ صلعم کا ہمسفر تھا، مجھ کو غسل کی حاجت ہوگئی، لیکن پانی نہ پا سکا، اس لئے (تیمم کی خاطر) دھول میں لوٹ پوٹ لیا، پھر آنحضرت صلعم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا، تو آپ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کر لینا کافی تھا (یہ کہتے ہوئے) آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور اُن کو اپنے منہ اور ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمرؓ نے عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو اُن کو اس روایت میں نظر آیا، ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھہری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقے میں یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مشہور ہوگئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑ گیا، اسی لئے لوگ اسی پر عمل پیرا ہو گئے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسر سے کر حضرت شاہ ولی اللہ تک کسی نے بھی اپنی پوری زندگی میں کبھی ایک بار بھی سورہ نساء و سورہ مائدہ پڑھا ہی نہ تھا، یا ان لوگوں کے پاس قرآن مجید کا جو نسخہ مسلسل چلا آ رہا تھا، اس میں تیمم کی دو آیتوں میں سے کوئی آیت بھی نہ تھی ــــ بخاری و مسلم میں یہ روایت جس قدر اضطراب کے ساتھ متعدد طرق میں مروی ہے وہ خود راویوں کے "حافظ نباشد" کی واضح مثال ہے۔ پھر یہ روایت یا اعمش سے مروی ہے

---

[1] بخاری ومسلم میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس میں اس واقعہ کو صرف عمار نے اپنی اور رسول اللہ صلعم کی ہمسفری کے موقع سے متعلق بیان کیا ہو۔ البتہ بعض میں تو صرف اپنی اور حضرت عمرؓ کی ہمسفری کے موقع سے متعلق بیان کیا ہے اور بعض میں تنہا ان کا ذکر ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق یہ مذکور ہے کہ بخاری ومسلم دونوں میں ان کے سامنے تیمم کی آیت پیش کی گئی، مگر انھوں نے کہا کہ اگر اسکی بنا پر تیمم کی اجازت دیدی گئی تو سرد پانی سے ڈر کر لوگ تیمم کرنا شروع کر دیں گے۔ اس لئے پانی اگر کئی ماہ بھی نہ ملے تو ایک مہینہ تک نماز نہ پڑھی جائے گی۔ اس کے راوی بھی وہی اعمش شیعی ہیں۔ ۱۲ منہ غفرلہ

Marfat.com

یا حکم بن عُتیبہ سے۔ سلیمان بن مہران الاعمش الکوفی اور حکم بن عتیبہ دونوں ہی شیعے تھے۔ انھوں نے فقط یہ دکھانے کے لئے کہ حضرت فاروقؓ اعظم اس قدر قرآنی احکام سے (نعوذ باللہ) بے خبر تھے کہ تیمم کا طریقہ جو دو دو جگہ قرآن میں بصراحت مذکور ہے اس سے بھی ناواقف تھے، یہ روایت گڑھی تھی۔ امام بخاری و مسلم نے اس کو اپنی کتابوں میں شیعوں کا حصہ رسدی قرار دیکر درج کرلیا ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری تک اسلامی موضع (گاؤں) بالکل اجمالی تھا اسوقت شیعہ اور سنّی کا بٹوارہ نہیں ہوا تھا۔ راویان حدیث میں کافی حد تک شیعے تھے، بلکہ قرآن چھڑوا کر مسلمانوں کو روایات کی بھول بھلیاں میں پھنسانے والے درحقیقت یہی لوگ تھے، اس لئے راویان حدیث میں اکثریت انھیں کی تھی۔ مگر چوں کہ اس جماعت کے پاس بخاری و مسلم کے عہد میں کوئی سیاسی طاقت نہ تھی، اس لئے اہل سنت سے الگ ہوکر اپنی جداگانہ مذہبی و قومی تنظیم کو اُس وقت وہ خلافِ مصلحت سمجھتے تھے اور پھر جداگانہ تصنیف و تالیف میں اُن کا مقصد بھی پورا نہ ہوتا تھا، اس لئے اہل سنت محدثین سے تعلقات پیدا کرکے اپنا حصہ رسدی اپنی حدیثیں انکی تالیفات میں داخل کراتے رہے۔ یہ حدیث تو بالکل خلاف عقل ہے کہ جس بات کا صاف اور صریح حکم قرآن مبین میں درج ہے، حضرت عمرؓ جیسا فاروق اعظم اس سے بے خبر ہو، اور عمار بن یاسر بھی پیش نہ کریں اپنا واقعہ اور حدیث۔ قرآن کی آیت ان کو بھی یاد نہ آئے اور پھر آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب یہ لکھیں کہ حضرت عمرؓ نے تو اس حدیث کے کسی پوشیدہ ضعف کی وجہ سے اس کو قبول نہ کیا ہو۔ مگر بعد کو جب دوسرے طرق سے اس حدیث میں قوت آگئی تو پھر اس کے مطابق عمل درآمد شروع ہوگیا یعنی دوسرے طرق سے اس حدیث میں قوت نہ آتی تو تیمم کا قیامت تک رواج ہی نہ ہوتا۔ کیا شاہ صاحب کو بھی تیمم کی آیت کبھی قرآن میں نظر نہیں آئی تھی؟ ان ھذا من اعاجیب الزمن"

غرضیکہ حدیثوں میں قرآن کی اسی قسم کی عجیب و غریب تاویلیں ہیں۔ اسی واسطے امام احمد بن حنبل نے صحیح فرمایا ہے کہ حدیث میں تین چیزیں ہیں جنکا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک ملاحم۔ دوسرے مغازی۔ تیسرے تفسیر قرآن۔ خود حدیث سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض لوگ جو قرآن کا علم رکھتے تھے وہ راویوں کی روایت پر اعتراض کرتے تھے جبکہ روایت کو قرآن کے منشا و مطلب کے صریحاً خلاف پاتے تھے۔ اسوقت راوی کے پاس سوائے اس کے کوئی جواب نہ ہوتا تھا کہ ہائیں کیا ہم جھوٹے۔ کیا ایسے اصحاب کبار جھوٹے اور نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا اعتراض۔ حالانکہ کوئی معترض حدیث پر اسلئے اعتراض نہیں کرتا کہ وہ واقعی آنحضرت کا ارشاد ہے بلکہ صرف اسوجہ سے کہ وہ عقل سلیم و فطرت و قرآن کے خلاف ہے۔ اسلئے وہ آنحضرت کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔

اس قسم کی دو مثالیں ہیں:۔

(۱) جب یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی گودنا گودنے والوں اور گودنا گودنے والیوں پر اور منہ سے روئیں نکالنے والیوں اور دانتوں کو کشادہ کرنے والیوں پر حسن کے لئے۔ اللہ کی خلقت بدلنے والیوں پر۔ بنی اسد کی

Marfat.com

ایک عورت نے سنا جسکو اُم یعقوب کہتے تھے۔ تو وہ راوی کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ میں سنتی ہوں تم نے ایسا کہا اُنھوں نے کہا مجھے کیا ہوا کہ میں لعنت کروں اس پر جس پر آنحضرت نے لعنت کی اور یہ بات تو اللہ کی کتاب میں موجود ہے وہ بولی میں نے تو سارا قرآن پڑھا ہے لیکن یہ بات اس میں کہیں نہیں پائی۔ راوی نے کہا اگر تو قرآن پڑھتے ہوئے ہوتی تو اسکو پاتی۔ کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" (سوال تو یہ نہ تھا کہ یہ حکم محض رسول کا ہے اور اس لئے قابل اعتراض ہے بلکہ سوال تو یہ تھا کہ ایسا حکم آپ نے واقعی دیا۔ پھر آیت غیر متعلق پڑھی گئی کیونکہ اس کا ربط مال غنیمت کی تقسیم میں بعض بدگمانیوں کی تنبیہ مقصود تھی)

ایسا ہی

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میت پر عذاب ہوتا ہے زندے کے رونے سے جب لوگ کہتے ہیں واعضداہ واکاسیاہ یا واناصراہ یا اس قسم کے کلمے تو فرشتے میت کو جھڑکتے ہیں اور کہتے ہیں کیا تو ایسا ہی تھا۔ سننے والے نے کہا سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ یعنی کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھاوے گا۔ راوی نے کہا افسوس ہے تجھ پر۔ میں تجھے حدیث بیان کرتا ہوں۔ ابو موسیٰ نے حدیث بیان کی۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ ابو موسیٰ نے جھوٹ باندھا رسول اللہ صلعم پر یا میں نے جھوٹ باندھا ابو موسیٰ پر۔

اس شخصیت پرستی نے حدیث کو دوسری حیثیت سے جانچنے نہ دیا اور حدیث کا وہ [illegible] رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک سے دی گئی [illegible] جو اس زمانے میں [illegible] زہری جن کو حدیث کا موجد کہنا چاہئے۔ وہ بنی امیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ اُن کو اقرار ہے کہ انھوں نے حدیثیں [illegible] کیں کہ سلاطین نے اُن سے ایسی خواہش ظاہر کی۔ حاکم نے ہارون سے اور انھوں نے ابی عبداللہ سے اور انھوں نے باپ سے نقل کیا ہے کہ خلیفہ المہدی عباسی کا بیان ہے کہ مجھ سے مقاتل بن سلیمان نے کہا "ان شئت وضعت لک احادیثا" یعنی اگر تو چاہے تو میں تیرے لئے حدیثیں وضع کروں۔ مہدی نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم مہدی نے ایسا کہا یا نہیں مگر حدیثیں خود گواہ ہیں کہ وہ لوگ جو ایک طرف اپنے تقوے کی وجہ سے عوام میں بااثر تھے اور دوسری طرف حکومت کی نمک خواری اُن کا پیشہ تھا وہ حکومت کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے اس قسم کی عام حدیثیں بھی بناتے "السلطان ظل اللہ فی الارض من اکرمہ اکرمہ اللہ ومن اھانہ اھانہ اللہ" بلکہ خلفاء کے نام و وقت [illegible] نبوی حدیثیں

---

لے عباسیوں کے پروپیگنڈے کی سب سے اول حدیث وہ روایت ہے جو صاحب البیان نے زید بن الاموقی [illegible] یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا حضرت عباس سے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہ ہوگا جبتک تم لوگوں (یعنی بنی عباس) سے محبت نہ رکھے [illegible] جبتک کہ خاندان عباسیہ کی محبت دل میں نہ ہو۔ اور خود اس حدیث کے موضوع ہونے کی سب سے بڑی دلیل [illegible] حدیث میں [illegible] اہل الامر کے رسول اللہ صلعم کے زمانے میں تو کیا اموی اور عباسیوں کے ابتدائی زمانے میں بھی مستعمل نہ تھے [illegible] سلطان کا لفظ سب سے پہلے [illegible] نے استعمال کیا ہے۔

کہتے تھے۔ گو کہ مسلم و بخاری میں ایسی حدیثیں کم ہیں مگر باقی صحاح میں ایسی حدیثیں بکثرت ہیں۔ خلفائے بنی عباس خصوصاً انھیں مہدی عباسی کے لئے جو حدیثیں وضع کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ یہ روائتیں ابوداؤد۔ ترمذی و ابن ماجہ سے لی گئی ہیں۔

(۱) ابوسعید خدری نے کہا کہ بعد از وفات وقوع حوادث کے خیال سے ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ آپ کے بعد کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا میری امت میں مہدی ظاہر ہوگا جو پانچ یا سات یا نو سال حکومت کریگا اور اس کے پاس ایک آدمی آکر اس سے سوال کریگا وہ اس کی چادر میں جسقدر اُس سے اُٹھ سکے گا مال بھر دیگا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے آخر میں مہدی ہوگا جو دولت لُٹائے گا اور اسے کچھ مال نہ سمجھے گا۔

(۳) عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ ایک دن کچھ جوانان بنی ہاشم رسول اللہ صلعم کے پاس آئے جب آپ نے اُنکو دیکھا تو آپ کی آنکھیں بھر گئیں اور چہرہ مبارک متغیر ہوگیا۔ ابن مسعود نے کہا کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا بات ہے۔ ہم نے کبھی آپ کی ایسی حالت نہیں دیکھی تھی۔ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے گھرانے کو دنیا کے بدلے آخرت عنایت کی ہے اور میرے اہلبیت میرے بعد سخت مصیبتیں اُٹھائیں گے۔ ہر طرف نکالے اور بھگائے جائینگے۔ یہانتک کہ مشرق کیطرف سے ایک قوم کالے جھنڈے لئے ہوئے آئیگی۔ میرے اہلبیت اس سے طالب خیر ہونگے لیکن وہ منظور نہ کرینگے اور سخت کشت وخون واقع ہوگا اور انجام کار میرے اہلبیت میں ایک شخص کو حکومت ملے گی۔ وہ مہدی ہے جو دنیا میں عدل وانصاف پھیلائیگا اور جور وستم کو مٹائے گا۔ تم میں سے جو شخص اس کا زمانہ پاوے میرے اہلبیت کا ساتھ دے اگرچہ وہ برف پر کیوں نہ چلے۔

(۴) مجاہد نے کہا مجھ سے ابن عباس نے بیان کیا کہ اگر میں سنتا کہ تو اہلبیت کی مانندہے تو ہرگز تجھ سے یہ حدیث بیان نہ کرتا۔ میں نے کہا کہ آپ اطمینان رکھئے میں ایسے ایسے لوگوں سے اسکو چھپاؤنگا اس پر ابن عباس نے کہا کہ میرے اہلبیت چار ہیں سفاح۔ منذر۔ منصور۔ مہدی۔ مجاہد کہتا ہے کہ میں نے کہا ان چاروں کا حال مجھ سے بیان کیجئے۔ ابن عباس نے کہا کہ سفاح اکثر اپنے انصار کو قتل اور دشمنوں کو معاف کریگا اور منذر بہت کچھ داد و دہش کریگا اور اپنے کو بڑھا دیگا اور اپنے حق میں بہت کم لیگا۔ اور منصور اپنے شاطر دشمنوں پر غالب آویگا کہ جیسے رسول اللہ صلعم اپنے اعدا پر فتحمند ہوئے کہ آپ سے دشمن دو مہینہ کی مسافت درمیان ہونے پر کانپ اُٹھتے تھے۔ منصور سے ایک مہینے کی مسافت پر ڈرا کرینگے اور مہدی دنیا کو عدل سے بھر دیگا۔ جیسے کہ اسوقت وہ ظلم وستم سے بھرپور ہوگئی ہے (حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے!!!)

(۵) رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر دنیا میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے سوا ایک دن کے تو اللہ تعالےٰ اس دن کو لمبا کرے گا یہانتک کہ میرے اہلبیت میں سے ایک شخص مالک ہوگا دیلم کے پہاڑ اور قسطنطنیہ کا۔

(۶) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماوراء النہر سے ایک شخص حارث نامی ظاہر ہوگا جسکے مقدمتہ الجیش میں منصور ہوگا۔ وہ آلِ محمد کی سلطنت قائم کریگا۔ جیسی کہ قریش نے میری تقویت کی۔ جسوقت یہ شخص ظاہر ہو تو مسلمانوں پر اسکی امداد و نصرت واجب ہے۔ وغیرہ

ہر شخص جس کو تاریخ خلافت عباسیہ سے ذرہ برابر بھی درک ہے وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ان حدیثوں کی وضع میں کیا راز پنہاں تھے جسمیں ایک خود واضع کی تمنا انعام بھی ہے۔ تعریف تو یہ تھی کہ جہاں خلافت عباسیہ کے قیام کی پیشینگوئی کرکے مسلمانوں کو اسکی امداد پر اُبھارا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اسکے حسرتناک انجام کی بھی پیشگوئی ہوتی مگر اسوقت

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

پھر واعظین اور روضہ خوانوں نے اپنے وعظ کی گرمی اور چاشنی کےلئے عجیب و غریب روایتیں وضع کیں۔ ایکبار امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین رصافہ کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کی موجودگی میں ممبر پر وعظ کہتے ہوئے یہ حدیث بیان کرنے لگا کہ ہم نے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے اس حدیث کو لیا۔ اور اُنھوں نے عبدالرزاق سے اور اُنھوں نے معمر سے اور اُنھوں نے قتادہ سے اور اُنھوں نے انس رضؓ سے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اُس کے ہر کلمے سے ایک چڑیا پیدا ہوتی ہے جسکی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے یہ قصہ خرافات تقریباً بیس ورق کے تھا۔ پس امام احمد بن حنبل اور ابن معین آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کہنے لگے کہ تم نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ بخدا اس کو تو ہم نے اسی وقت سنا ہے۔ پس دونوں چُپ ہوگئے۔ یہانتک کہ نماز سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد ابن معین نے اُس کو اشارہ سے بلایا اور پوچھا کہ تم سے اس حدیث کو کس نے بیان کیا ہے اُس نے کہا کہ احمد بن حنبل اور ابن معین نے۔ اُنھوں نے کہا میں ابن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل۔ ہم نے تو آج تک نہ اس کو سُنا نہ کسی سے بیان کیا۔ لہذا یہ حدیث جھوٹ ہے۔ اس کو کسی دوسرے نے بیان کیا ہوگا۔ اُس نے کہا آپ ہی ابن معین ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا میں ہمیشہ سنتا تھا کہ ابن معین احمق ہے سو میں نے آج جان لیا۔ ابن معین نے کہا کہ تم نے کیونکر جانا کہ میں احمق ہوں۔ اُس نے کہا کیا دنیا میں آپ کے سوا کوئی ابن معین اور احمد بن حنبل نہیں۔ میں نے ان کے سوا سترہ احمد بن حنبل سے اس کو لیا ہے۔ پس امام احمد نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا اے لوگو اس کو بلاؤ۔ اس کے بعد وہ ہنستا ہوا کھڑا ہوگیا۔

پھر ایک فرقے نے دوسرے فرقے کے خلاف حدیثیں وضع کیں۔ مثلاً

رسول اللہ صلعم نے فرمایا دو گروہ ہیں میری امت میں جن کو اسلام سے سروکار نہیں ایک مرجیہ دوسرے قدریہ۔

یا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کچھ لوگ میری امت میں ہیں انکو خوارج، جو اپنے سر کو منڈاتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن اُن کے حلق کے نیچے سے نہیں اُترتا۔ اُن کو جہاں پاؤ قتل کرو۔

Marfat.com

یا مرجیہ اس امت کے مجوس ہیں یا خوارج دوزخ کے کتے ہیں۔

عبداللہ بن زبیر کی پارٹی نے اپنے مخالف بنی امیہ کے خلاف یہ حدیث وضع کرائی۔

"حارث بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان دونوں اُم المومنین ام سلمہ کے پاس گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اُنھوں نے ام سلمہ سے پوچھا اس لشکر کو جو دھنس جاویگا اور یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب عبداللہ بن زبیر مکہ کے حاکم تھے۔ اُنھوں نے کہا رسول اللہ صلعم نے فرمایا پناہ لیگا ایک پناہ لینے والا خانہ کعبہ کی۔ اس کی طرف شام سے (ایک روایت میں ابی سفیان) ایک لشکر بھیجا جاویگا۔ وہ جب ایک میدان میں پہنچیں گے تو دھنس جاوینگے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ جو شخص زبردستی اس لشکر کے ساتھ ہوا تو وہ بھی اس کے ساتھ دھنس جاویگا فرمایا ہاں لیکن قیامت کے دن اپنی نیت پر اُٹھیگا۔"[ل]

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثقیف میں ایک دجال ہوگا (یعنی حجاج جو بنی اُمیہ کے لشکر کا سردار تھا۔ جو عبداللہ ابن زبیر کے مقابلہ کے لئے بھیجی گئی تھی)۔

شیعان علی کی طرف سے یہ حدیثیں شائع کی گئیں اور جو ہماری مستند حدیثوں میں شمار کیجاتی ہیں یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو علی سے جنگ کریگا اسکے لئے میں جنگ ہوں اور جو ان سے صلح کرے اسکے لئے میں صلح ہوں۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ عشرہ مبشرہ میں سے طلحہؓ و زبیرؓ اور امہات المومنین میں سے حضرت عائشہ صدیقہ و خلفائے راشدین و خلفائے بنی امیہ مع حضرت معاویہ سب کے سب دشمنان رسول ہیں۔ نعوذ باللہ یا یہ روایت جو تاریخی واقعہ بن گیا کہ حضرت علی آنحضرت کے بستر پر لیٹ گئے اور رسول اللہ صلعم قریش کو دھوکا دیکر چپکے سے نکل گئے۔ معمولی عقل کا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اس واقعہ کے وضع کرنے میں حضرت صدیق اکبر کی معیت اور یار غار ہونے کا جواب تھا۔ ورنہ ایک پیغمبر اولوالعزم کے شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے دوسرے شخص کی جان کو خطرے میں ڈالے اور وہ بھی اپنا عزیز بھائی اور دوست۔ پھر حضرت علی کو لٹلانے کی ضرورت۔ ایک لکڑی کے کندے سے بھی یہ ہی کام نکل سکتا تھا اگر پیغمبر کو مکر و خداع کرنا ہی تھا۔

ان سے زیادہ دلیر وہ عباد و زہاد تھے جن کا سب سے بہتر مشغلہ یہ تھا کہ جہاں کوئی عجوبہ زا بات بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی یا معتقدین کو سکتہ میں ڈالنے کا شوق ہوا یا زہد و فقر غنا و عشق مجازی کی مجلس گرم کرنی ہوتی تو اُس کے سرے پر ایک سلسلہ سند کا اور رسول اللہ صلعم کا نام جھٹ لے دیا (یاخذ حدیثاً ضعیف الاسناد یترکب له اسناداً صحیحاً یعنی اگر کسی مجہول روایت کی سند ضعیف پاتے تو اُس کو صحیح سند سے ترکیب دے ڈالتے) ان زاہدو

---

ل اس حدیث میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ ام سلمہ کا انتقال معاویہ کی خلافت میں ۵۹ھ میں ہو چکا تھا اور عبداللہ بن زبیر جب مکہ میں حاکم تھے تو وہ ۶۴ھ کا زمانہ تھا۔

Marfat.com

عباد کے نزدیک یہ بالکل مباح تھا کہ ترغیب وترہیب ومناقب کی جعلی حدیثیں رسول اللہ صلعم کے نام سے مشہور کی جائیں اور انکو ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ عام محدثین کی طرح کسی سند وراوی کی بھی پرواہ کریں۔ خود اُنکی ریاضت و روحانیت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ جہاں انھوں نے آنکھ بند کی۔ اور رسول اللہ صلعم کے دربار میں پہونچ گئے۔ بعضوں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا کہ اُنھوں نے اتنی بڑی زندگی پائی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں موجود تھے۔ بعضوں نے "حدیث قدسی" تصنیف کرکے اپنے شجرۂ ولایت کو سلسلہ اسناد میں لیکر روایت کو رسول اللہ صلعم تک پہنچا دیتے ہیں اور بعض اتنے دلیر تھے کہ وہ اس قسم کے وضاعین کو خواب میں دیکھتے کہ رسول اللہ صلعم اُن کی کتابوں کی تعریف کر رہے ہیں۔ ابن حبان نے اپنی کتاب الضعفاء میں عبداللہ بن یزید حضرمی کی نسبت بیان کیا ہے کہ ایک بدعتی شخص اپنی بدعت سے تائب ہوا۔ تو کہنے لگا کہ اس حدیث کو دیکھو۔ تم اس شخص سے لیتے ہو۔ حالانکہ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں۔ جعلنا لہ حدیثاً یعنی اس کے لئے حدیثیں وضع کر لیا کرتے ہیں۔ ابوسعید مدائنی وغیرہ کا یہی پیشہ تھا کہ موضوع قصے بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ حاکم نے کہا ہے کہ محمد بن القاسم جو رئیس المرجیہ تھا "کان یضع الحدیث علی مذھبھم" یعنی وہ اپنے مذہب کے موافق حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ ابوداؤد باوجودیکہ بڑے قائم اللیل وصائم الدہر تھے جھوٹی حدیثیں بنایا کرتے تھے (تدریب الراوی) ابن حبان نے کہا ہے کہ ابو بشر احمد بن محمد الفقیہ المروزی باوجودیکہ اپنے زمانے کے حامی سنت تھے جھوٹی حدیثیں بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح وہب بن حفص ایسے بزرگ تھے کہ کسی سے کلام نہیں کرتے تھے باوجود اس کے کان یکذب کذباً فاحشاً محمد بن سعید مصلوب کا قول ہے "لا باس اذا کان کلام حسن ان یضع له اسناداً" یعنی جب کلام اچھا ہو تو اس کے لئے سند وضع کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ قتادہ۔ شہیر۔ سفیان ثوری۔ حسن بصری۔ اعمش وغیرہ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ بھی حدیثیں وضع کرتے تھے (جنکو حدیث کی اصطلاح میں [illegible] حدیثوں میں سند کو اُڑا دیتے تھے)

ان عباد و زہاد میں سے اکثر نیک نیتی سے حدیثیں اسلئے وضع کرتے تھے تاکہ لوگ بھی اُنکی طرح متقی ہوجائیں۔ چنانچہ تدریب الراوی میں ابن اسمعیل سے ایک قصہ بیان ہے کہ ہم کو ایک شخص نے ابی بن کعب سے قرآن مجید کی تمام سورتوں کے فضائل مرفوعاً روایت کردے۔ میں نے شیخ صاحب سے دریافت کیا کہ آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ اُنھوں نے فرمایا واسط کے ایک شخص نے جو ابھی زندہ ہے [illegible] کیا۔ اُنھوں نے فرمایا مجھ کو بصرے کے ایک شخص سے وصول ہوئی ہے۔ میں ان سے [illegible] نے فرمایا مجھ کو عبادان کے شیخ سے وصول ہوئی ہے۔ بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا وہ مجھے [illegible] لے گئے۔ پس دیکھا کہ [illegible] صوفی [illegible] پس اس نے کہا کہ مجھ کو ان شیخ صاحب نے حدیث [illegible]

فرمایا کہ مجھ سے اس حدیث کو کسی نے بیان نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ لوگوں کو قرآن مجید سے بالکل بے رغبتی ہوگئی ہے لہذا میں نے اس حدیث کو وضع کر دیا حاکم نے ابی العمار المروزی سے نقل کیا ہے کہ ابی عصمت نوح ابن مریم سے کہا گیا کہ کیا بات ہے تم عکرمہ سے اور وہ ابن عباس سے قرآن مجید کی سورتوں کے فضائل بیان کرتے ہیں یہ فضائل عکرمہ کے شاگرد بیان نہیں کرتے۔ ان حضرت نے کیسا صاف جواب دیا "انی رایت الناس قد اعرضوا عن القرآن واشتغلوا بفقة ابی حنیفة ومغازی ابن اسحٰق فوضعت هذا الحدیث حسبةً

ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں ابن مہدی سے نقل کیا ہے کہ میں نے میسرہ بن عبد ربہ سے دریافت کیا کہ تم یہ حدیثیں کہاں سے لاتے ہو کہ جو اس کو پڑھتا ہے اس کے لئے ایسا ایسا ہے تو اُنھوں نے جواب دیا کہ میں نے ان حدیثوں کو اس لئے وضع کیا کہ لوگ اس میں رغبت کریں اور جو ہوشیار لڑکے ہیں وہ زہد اختیار کرتے ہوئے شہوات دنیا اور بغداد کے بازاروں میں گھومنا اپنی موت کے ڈر سے چھوڑ دیں۔

اس نیک نیتی سے وضع کی ہوئی حدیثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان حدیثوں کی تردید کرنا عوام کے خوف سے ناقدین کے لئے اور مشکل ہوگیا۔ مثلاً اگر ایک شخص اپنی وضع کی ہوئی حدیثوں سے تمام دن روزہ رکھوائے اور تمام رات نماز پڑھوائے تو کس کی مجال تھی کہ وہ اس کی تردید کر کے فاجر و فاسق کا خطاب پائے۔ امام شعبی ایک دن ایک مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ وہاں ایک بزرگ وعظ میں فرما رہے تھے کہ قیامت کے دن دو صور ہونگے۔ ایک صور سے دنیا تباہ کی جائیگی اور دوسرے صور سے دنیا پیدا ہوگی۔ امام شعبی نے نماز ختم کرنے کے بعد اس قول کی تردید کرنا چاہی تو واعظ اور اس کے وعظ سننے والوں نے یہ کہہ کر کہ کیسا فاجر شخص ہے جو ایسی عمدہ بات کی تردید کرتا ہے بیچارے امام کے پیٹ گئے اور جب تک اُن سے یہ نہ کہلوالیا کہ دو صور نہیں بلکہ اللہ میاں کے پاس ستر صور ہیں اُن کو مارتے مارتے بدحواس کر دیا۔

امام نووی اپنی کتاب التقریب والتیسیر میں فرماتے ہیں :۔

" واضعان حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں مگر ان میں زیادہ ضرر اس قوم سے ہوا جو زہد کی طرف منسوب ہیں۔ اُنھوں نے اپنے زعم اور خیال کے موافق بہت سی حدیثیں وضع کر لیں۔ لہذا اُن کی روایات کو ثقات نے بھی قبول کر لیا۔"

پس بقول امام نووی وضع حدیث کے حسب ذیل اسباب ہوا کرتے ہیں :۔

(۱) لامذہبی سے جیسے زنادیق ہوتے ہیں (اسکی بحث پر مفصل علیحدہ مضمون ہے)

(۲) غلبۂ جہالت سے جیسے بعض عابد و زاہد بزرگ ہوتے ہیں (ملفوظات صوفیہ میں ایسی ہی حدیثوں کا انبار ہے)

(۳) تعصب کی زیادتی سے جیسے بعض مقلدین ہوتے ہیں۔

(۴) بعض رؤسا کی خواہش کی پیروی مقصود ہوتی ہے۔

(۵) بغرض شہرت ذاتی۔

(۶) مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے ترغیب و ترہیب و فضائل اعمال کی حدیثیں۔ (جیسے امام غزالی کی تصنیفات ہیں)

(۷) یہود و نصاریٰ و مجوس کی روایتیں جو انھوں نے نو مسلم ہو کر بیان کیں (کعب احبار ابن منبہ وغیرہ کی حکایتیں جن سے تفسیریں پُر ہیں)

غرضیکہ خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد اور امام غزالی کے زمانے تک واضعان حدیث کی ایک غالب جماعت رہی ہے۔ جن کا یہ ناپاک پیشہ تھا کہ جھوٹی حدیثیں وضع کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف محض اپنی خواہش نفسانی یا اسلام سے استہزا اور ترغیب و ترہیب کی غرض سے منسوب کر دیا کرتے تھے۔ دسویں صدی ہجری میں عسقلانی۔ ابن جوزی۔ ملا علی قاری۔ شوکانی نووی وغیرہ نے جو تفحص و تنقید کی ہے وہ حاطب اللیل سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ جاحظ نے ایک بار یہ آزمانے کے لئے کہ حدیث کی جانچ محققین کس طرح کرتے تھے۔ فدک کے متعلق ایک حدیث وضع کر کے بغداد کے بہت سے شیوخ کے سامنے پیش کی تو بجز ابن ابی شیبہ علوی کے باقی سب نے اُسکو قبول کر لیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں حدیث کا کیا حال تھا۔

ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں کہا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میرے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ سو حدیثیں ایک کتاب میں جمع کی تھیں۔ ایک رات کو آپ نہایت بے چینی سے کروٹ بدلتے رہے۔ جس سے مجھے سخت رنج ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ آپ کسی بیماری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں یا کوئی اور بات ہے۔ صبح ہوتے ہی مجھ سے فرمایا کہ تمھارے پاس جو حدیث کی کتاب ہے وہ میرے پاس لاؤ۔ جب میں وہ لے آئی تو آپ نے آگ منگا کر جلا دیا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب نے ایسا کیوں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ کتاب چھوڑ جاؤں۔ شاید اس میں ایسے آدمی کی حدیث ہو جو میرے نزدیک تو معتبر ہو اور حقیقت میں وہ ایسا نہ ہو۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا۔ پھر فرمایا کہ تم ضرور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرنے میں مختلف ہو رہے ہو تمھارے اندر اختلاف ہونگے اور تمھارے بعد لوگوں میں بہت زیادہ اختلاف ہوگا۔ لہذا تم احادیث آنحضرت کی مت بیان کرو اسکے بعد جو تم سے کوئی مسئلہ دریافت کرے تو اس سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان قرآن موجود ہے اس میں جو حلال ہے حلال سمجھو اور جو حرام ہے اس کو حرام سمجھو۔

Marfat.com

حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں فاطمہ بنت قیس نے حاضر ہوکر یہ حدیث بیان کی کہ تین طلاق والی عورت کے خورد و نوش کے صرفہ کا خاوند ذمہ دار نہیں ہے۔ حضرت عمر نے ارشاد فرمایا کہ میں قرآن مجید کے حکم کو ایک عورت کی روایت سے چھوڑ نہیں سکتا کہ جس کے اندر جھوٹ و سچ دونوں کا احتمال ہے (بخاری) عروہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر نے حدیث نبوی مدون کرنے کا ارادہ کیا اور صحابہ سے مشورہ لیا۔ سب نے یہ تجویز پسند کی۔ مگر خود حضرت عمر ایک مہینے تک رُکے رہے۔ یہاں تک کہ بصیرت حاصل ہوگئی۔ اور ایک دن صبح اُٹھ کر اُنھوں نے فرمایا۔ میرا قصد سنت نبوی کی تدوین کا تھا۔ لیکن پھر خیال ہوا کہ تم سے پہلی قوموں نے بھی کتابیں لکھیں اور کتاب اللہ کو چھوڑ کر اپنی ان کتابوں کی ہو رہیں۔ واللہ میں کتاب اللہ میں ہرگز کسی چیز کی آمیزش نہ ہونے دونگا۔ حضرت ابوہریرہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت عمر کے زمانے میں بھی وہ اس طرح حدیث بیان کرتے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر میں ایسا کرتا تو مجھے درّے سے پیٹ ڈالتے ایک روز ابوموسیٰ اشعری نے دروازے سے حضرت عمر کو تین بار سلام کیا۔ جب حضرت عمر نے اجازت نہ دی تو وہ واپس چلے گئے۔ حضرت عمر نے فوراً آدمی بھیجکر اُن کو بلوایا اور کہا کہ کیوں واپس ہوئے۔ ابوموسیٰ نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ تین بار سلام کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو لوٹ جانا چاہیئے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اس حدیث پر گواہ لاؤ۔ ورنہ سزا پاؤگے۔ ابوموسیٰ یہ سنکر گھبرائے۔ صحابہ کے ایک مجمع میں پہنچے۔ صحابہ نے اُن کو پریشان حال پاکر پوچھا خیر تو ہے۔ ابوموسیٰ نے تمام واقعہ بیان کیا اور کہا تم میں سے کسی نے اس حدیث کو سنا ہے۔ سب نے کہا ہم سب نے سنا ہے اور ان میں سے ایک صحابی (ابوسعید خدری) نے حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوکر اسکی گواہی دی تب ابوموسیٰ کی جاں بخشی ہوئی (مسلم و بخاری) حضرت عمر فاروق نے تیمم کے بارے میں حضرت عمار صحابی کی روایت کو تسلیم نہیں کیا۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ابراہیم نخعی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں ابن مسعود۔ ابوالدرداء۔ اور ابومسعود انصاری کو اس جرم میں قید کیا تھا کہ اُنھوں نے حدیث کی روایت کثرت سے کی تھی۔

ابن عینیہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے اُبی بن کعب کے پاس ایک جماعت بیٹھی دیکھی جس سے اُبی حدیث روایت کر رہے تھے۔ حضرت عمر نے اُبی پر کوڑا اُٹھایا۔ اُبی نے کہا عمر دیکھ خدا تجھ پر رحم کرے کیا کرتا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ روایت کرنا تیرے لئے فتنہ اور سننے والوں کے لئے ذلت کا موجب ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی۔ آپ نے فرمایا میں نہیں جانتا یہ کیا چیز ہے (قال لا ادری ما ھی)

تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ حضرت علی نے فرمایا کہ مجھ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا ہے تو میں اسپر حلف کھاتا ہوں اگر حلف کر لیتا ہے تو اس کو میں سچا جانتا ہوں ورنہ جھوٹا۔ عبداللہ بن یسار سے مروی ہے کہ حضرت علی نے خطبہ میں فرمایا۔ جس کے پاس قرآن کے علاوہ کوئی تحریر ہے میں اُسے قسم دلاتا ہوں کہ لوٹ کر فوراً مٹا دے کیونکہ پچھلی قومیں اسی

طرح ہلاک ہوئیں کہ اُنھوں نے اپنے رب کی کتاب چھوڑ کر اپنے علماء کے اقوال کی پیروی شروع کردی۔

مشکوٰۃ میں حارث اعور سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں "میرا گذر ایک مسجد میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بیٹھے احادیث میں غور و فکر کر رہے ہیں میں نے جاکر حضرت علی سے عرض کیا۔ کہ یہ لوگ مسجد میں اجتماع کیے ہوئے ہیں اور احادیث پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ حضرت علی نے کہا کیا یہ ہی صورت ہے۔ انھوں نے کہا جی ہاں۔ فرمانے لگے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک فتنہ برپا ہونے والا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اسکی [illegible] سے ہوگی۔ نبی اکرم نے فرمایا قرآن میں تم سے پہلے لوگوں کے احوال ہیں اور مابعد کی خبریں بھی موجود ہیں یہ قرآن [illegible] کی کتاب ہے نہ لغویات۔ جس شخص نے اسکو لغو خیال کرکے چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ اسکو تباہ کردیگا اور جس نے اسکے علاوہ کسی دوسری کتاب سے ہدایت چاہی اللہ تعالیٰ اسکو گمراہ کردیگا یہ خدا کی مضبوط رسی ہے۔ یہ ہی پُر حکمت [illegible] یہ ہی سیدھا راستہ ہے یہ ہی وہ چیز ہے جس سے خواہشات ٹیڑھی نہیں ہوتی۔ نہ اسکے ساتھ کوئی زبان مختلط ہوسکتی ہے نہ اس سے علماء کا پیٹ بھریگا۔ زیادہ تلاوت کی وجہ سے پرانا نہیں ہوگا۔ اسکے عجائبات ختم نہ ہونگے۔ یہ وہ چیز ہے کہ جن اسکو سنکر یہ کہنے پر مجبور ہوئے "انا سمعنا قرآناً عجبا۔ یھدی الی الرشد فامنا بہ" جس شخص نے اس کے ذریعے سے بات کہی سچا ہے اور جس نے اس پر عمل کیا اُسکو اجر دیا جائے گا اور جس نے اسکے ذریعے سے فیصلہ کیا وہ منصف ہوجائیگا اور جس نے اسکے ذریعے سے ہدایت چاہی اسکو راہ مستقیم عطا کیجائے گی۔

ہم یہ نہیں کہتا کہ یہ روایتیں خود بھی صحیح ہیں۔ مگر خلفائے راشدین کے زمانے میں اور خود خلفاء [illegible] کہ روایتوں کا مروی ہونا دلالت ہے اس بات کی کہ ان حضرات کو حدیث کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ [illegible] ہوا کہ امیر معاویہ کہا کرتے تھے کہ عہد فاروقی کی حدیث کا اعتبار کرو کیونکہ وہ لوگوں کو اس بارے میں ڈراتے [illegible] تھے (مسلم) حضرت معاویہ کا اس طرح تنبیہ کرنا صاف بتا رہا ہے کہ اُن کے زمانے میں عام [illegible] ہوگیا تھا اور کثرت سے لوگ جھوٹی حدیثیں بنا کر آنحضرت کی طرف منسوب کردیا کرتے تھے۔ بشیر بن کعب عدوی ایک روز عبداللہ بن عباس کے پاس آئے اور حدیث بیان کرنے لگے۔ جب ابن عباس نے اُن کی طرف [illegible] طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا تو متعجب ہوکر کہنے لگے کہ ہم تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتے ہیں اور آپ سنتے ہی نہیں۔ حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ پہلے جب کوئی حدیث روایت کرتا تھا تو ہمارے کان سننے سے [illegible] متوجہ ہوجاتے تھے۔ مگر جب سے حدیث کے اندر لوگوں نے احتیاط کرنا چھوڑ دی تو اب ہم اس حدیث کو لیتے ہیں جس کو ہم خود جانتے ہیں یا وہ مشہور و معروف ہوتی ہے۔ حدیث کی کثرت سے صرف [illegible] ہوگئے تھے۔ مسلمانوں کا بڑا طبقہ بھی حدیث سے [illegible]

خبردار! کوئی تم میں سے اپنے [illegible]

Marfat.com

پرواہ نہیں کیونکہ ہر عمدہ کلام میرا کلام ہے۔

یا حدیث گوئی کو اس طرح کی وعیدوں سے نہ روکا جاتا۔

جو شخص مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے۔ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں کرے۔ یا ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سُنے اُس کو بیان کردے۔

تو خلفائے راشدین خصوصاً حضرت عمر کے زمانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ کوئی حدیث بیان کردے چہ جائیکہ اس کو لکھنا یا ترتیب دینا۔ بلکہ بنی امیہ میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک اس بدعت کا رواج نہ ہوا تھا۔ اور یہ ہی وجہ ہے کہ آثار قیامت کی حدیثوں میں ایسے قیامت خیز واقعات کا کہیں اشارہ نہیں ملتا جیسے فتنہ و بغاوت بہ زمانۂ خلافت حضرت عثمان۔ جنگ جمل۔ شہادت امام حسین۔ احتراق کعبہ وغیرہ۔ حالانکہ اس کے بعد کے واقعات خصوصاً جو عباسیوں کے زمانے میں واقع ہوئے ہیں مثلاً حجاز کی آتش فشانی یا رومیوں کے محاربات و محاصرۂ قسطنطنیہ کا ذکر آثار قیامت کی پیشگوئیوں میں کیا گیا ہے۔ حدیث کی سب سے پہلی کتاب عمر بن عبدالعزیز کی ایما سے محمد بن شہاب زہری نے لکھی۔ مگر یہ کتاب ناپید ہے اور قیاس غالب یہ ہے کہ بنی اُمیہ کے ساتھ یہ دفتر بھی عباسیوں کے ہاتھ سے نسیاً منسیا ہوگیا۔ عباسیوں کا جب زمانہ آیا اور ابوجعفر منصور کو خلافت ملی اور وہ حج کو گئے تو اُنھوں نے اپنے ایک پرانے ساتھی مالک بن انس سے خواہش کی کہ وہ ایک کتاب حدیث کی تصنیف کریں۔ امام مالک نے منصور کی خواہش پر حدیث کی پہلی کتاب موطا ترتیب دی جو اب بھی موجود ہے۔ اس میں کوئی تین چار سو حدیثیں مسائل فقہ کے ضمن میں ہیں۔ ان روائتوں کی بنیاد زیادہ تر زہری کی روایتوں پر ہے جس کو امام مالک نے زبانی لوگوں سے سنا یا اُن کے پاس زہری کا کوئی نسخہ موجود تھا۔ موطا میں ایک ہی مسئلہ پر مختلف فیہ حدیثیں ہیں اور یہ مشکل امر ہے کہ دو متضاد حدیثوں میں سے ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط قرار دیا جائے۔ اس میں اور مابعد کی حدیثوں میں یہ بین فرق ہے کہ نہ اس میں حضرت ابن عباس کی تفسیر قرآن ہے نہ حضرت ابوہریرہ کے قصص اسرائیل و ملاحم اور نہ ہی اس میں معراج کا ذکر ہے جس کا ذکر بعد کی حدیثوں میں ہوا۔ اسکے ساتھ حدیثوں کی تعداد بھی اس قدر زیادہ نہیں ہے جس سے جعلی حدیثوں اور اصلی حدیثوں میں تمیز نہ کی جاسکے۔ مگر موطا میں رجم زانی و ساحرہ وغیرہ کی ایسی روایتیں ہیں جو غالباً الحاقی ہیں۔ خود امام مالک نے جو مسودہ موطا کا چھوڑا تھا وہ پراگندہ نوٹوں میں تھا۔ جس میں وہ خود بھی حذف و اضافہ کرتے رہے اور چونکہ اس میں ابن عباس کی روائتوں سے استناد نہ کیا گیا تھا۔ خلافت عباسیہ میں نہ اس مسودہ پر نظر ثانی کی گئی اور نہ وہ مقبول عام ہوا۔ بربر و مغرب میں عباسیوں کی دست درازی سے دور جہاں بنی اُمیہ کی ذریات پناہ لئے ہوئے تھے وہاں اس کتاب کا زیادہ چرچا ہوا۔ اسواسطے کہ اس کتاب میں مروان۔ عبدالملک وغیرہ کی اسناد سے بھی حدیثیں تھیں جن کو بنی عباس سننا ہی نہ چاہتے تھے اور چونکہ بربر کے مزاج میں ابھی ارتداد و ساحریت وخشونت باقی تھی اس کے تدارک و دفعیہ کی صورتیں پیدا کرنے کے لئے موطا میں ایسے

فقہی مسائل حدیث کی سند سے ٹھونس دیے گئے جو دراصل قرآن کی منشا ہی کے خلاف تھے۔ بایں ہمہ موطا ایک حیثیت سے باوجود ان نقائص کے مابعد کی کتابوں سے افضل ہے۔ مگر شاید موطا کا ہنر ہی بعد کو اس کا سب سے بڑا عیب بن گیا۔ کیونکہ جب عوام کا رجحان دلچسپ حکایتوں کی طرف ہوا اور وعظوں کی چاشنی کے لئے عجیب و محیر العقول قصوں اور کلام کا چرچا ہوا ادھر حکومت کا خود رجحان اور شغف حدیثوں کی طرف پایا گیا تو گویا فتنہ وضع حدیث کا دروازہ کھل گیا۔ سو برس کے اندر یعنی جب امام حنبل نے مسند کی ترتیب دی تو کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے ساٹھ لاکھ سے کچھ اوپر حدیثوں سے انتخاب کر کے چالیس ہزار حدیثیں اور بعضوں نے کہا کہ بیس ہزار حدیثیں علیحدہ کیں۔ یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ اُن کے پاس حدیث پرکھنے کا کیا آلہ تھا۔ کیونکہ صرف ایک حدیث کی تفحص اور سلسلۂ اسناد کی تمام کڑیوں کو مضبوط پانا خصوصاً جبکہ رواۃ ایک زمانے اور ایک جگہ کے رہنے والے نہ ہوں اگر محال نہیں تو ممکن ضرور ہے۔ اور پھر جبکہ صحابہ اور تابعین میں سے جن کو جرح سے بالا رکھا گیا تھا زندہ بھی نہ تھے۔ بہرحال اُن کے بیٹے اور اُنکے پوتے ابوبکر قطفی نے کچھ روایتیں اپنی طرف سے اور ملا کر اُسکو اٹھارہ مسند میں ترتیب دیا۔ احمد بن حنبل کی وفات ۲۴۱ ہجری میں ہے اور یہ زمانہ حدیثوں کی تصنیف کا ہے جو بیل عزم کثیرت اپنے ساتھ قرآن اور اُس کی ساری حکمت و موعظت کو بہا کرلے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگوں کا بہترین پیشہ حدیث کی کتابیں لکھنا ہوگیا تھا اور لکھنے والوں کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ اپنے پاس ایک نوٹ بک رکھتے اور بغداد و کوفہ و بصرہ کے ہر عام مجمع میں جہاں کوئی داستان گو اپنا شناپ رسول اللہ صلعم کے نام سے بکتا اور ان کے بعد ایک صحابی اور ایک تابعی کا نام لیکر چار پانچ اپنی قسم کے بزرگوں کا نام لے دیتا۔ وہ اس کو نوٹ کر لیتے۔ احادیث کے جو دفاتر اس زمانے میں تیار ہوئے ہیں۔ اُنکی ایک نہایت مختصر فہرست یہ ہے:۔

(۱) مسند ابوداؤد طیالسی [۲۱۴ ہجری] (۲) مسند عبد بن حمید [۲۴۹ ہجری] (۳) مصنف عبدالرزاق [۲۱۱ ہجری] (۴) مسند سعید بن منصور [۲۲۵ ہجری] (۵) مصنف ابی بکر بن شیبہ [۲۳۵ ہجری] (۶) بخاری [۲۵۶ ہجری] (۷) مسلم [۲۶۹ ہجری] (۸) سنن ابوداؤد [۲۷۵ ہجری] (۹) جامع ترمذی [۲۷۹ ہجری] (۱۰) مسند حارث [۲۸۲ ہجری] (۱۱) مسند بزار [۲۹۲ ہجری] (۱۲) مسند دارمی [۲۵۵ ہجری (۱۳) سنن ابومسلم [۲۶۲ ہجری] (۱۴) سنن النسائی [۳۰۳ ہجری] (۱۵) سنن ابن ماجہ [۲۷۳ ہجری] (۱۶) مسند ابویعلی [۳۰۷ ہجری] (۱۷) طحاوی [۳۲۱ ہجری] (۱۸) طبرانی [۳۶۰ ہجری] (۱۹) معجم ابن قانع [۳۵۱ ہجری] (۲۰) سنن دارقطنی [۳۸۵ ہجری] (۲۱) صحیح ابن حبان [۳۵۴ ہجری] (۲۲) مستدرک حاکم [۴۰۵ ہجری] (۲۳) بیہقی (۴۵۸ ہجری)

ان کتابوں میں متاخرین نے اکثر یہ کیا کہ بہت سی حدیثوں کو جو انھوں نے متقدمین کی کتابوں میں پائیں اور اُن کو پسند آئیں وہ حرف بحرف نقل کر لیں۔ صحاح ستہ میں اکثر روایتیں ایسی ہیں جو لفظ بہ لفظ تمام صحاح ستہ میں ملتی ہیں۔ اسواسطے بہت سے لوگوں نے ان منتشر دفاتر احادیث کو ایک مستقل کتاب میں ترتیب دینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ پانچویں صدی ہجری میں امام بغوی

Marfat.com

نے مصابیح السنن کے نام سے حدیثوں کا عطر کشید کیا۔ اسی طرح ساتویں صدی ہجری میں ایک دوسرے عالم نے مشکوٰۃ المصابیح پر یہ ہی کوشش کی یعنی چوتھی اور پانچویں صدی کا زمانہ راویوں کی شناخت و انتخاب کا رہا۔ تو ساتویں و آٹھویں صدی دفاتر حدیث کی شناخت و انتخاب کا۔ مگر نہ چوتھی صدی میں ناقابل اعتبار راویوں پر کوئی معقول تنقید کی گئی اور نہ ساتویں صدی میں دفاتر حدیث کی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حنفیہ نے صحاح ستہ کو ان دفاتر میں سے کس طرح چنا اور کس معیار پر۔ کیا یہ عجمیت کی پاسداری تو نہ تھی۔ کیونکہ حنفی ان ممالک میں بکثرت ہیں جہاں سے یہ محدث اٹھے تھے۔ یعنی خراسان عجم ماوراالنہر۔ یا یہ ہو کہ جب حنفیت میں (جو سب مذاہب سے زیادہ قرآن و سنت عقل سلیم و اجماع پر مبنی تھا اور تقریباً دفاتر حدیث سے مستغنی) کسی مستقل و مرتب کتاب فقہ نہ ہونے کی وجہ سے قیل و قال ہوا اور جب اعتزال و آزاد خیالی کی رو ختم ہونے کے بعد اشعری و نسفی و ابن تیمیہ و ماوردی کے ایسے صاحبان نقل پیدا ہوئے تو انھوں نے حنفیت کا اسدرجہ ردعمل کیا کہ اس کو حنبلیت کی طرف واپس لے آئے اور اُسوقت اُن کو ایک ایسے دفتر حدیث کی ضرورت پڑی جو حنفیہ کو بھی سنت و جماعت سے ہٹا کر روایت و حدیث کے تتبع پر دوسرے فرقہ کے لوگوں کی طرح مائل کردے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جس طرح خلفائے فاطمیہ نے اپنے مذہب کی کتابوں کو شام و مصر میں رائج کیا اور کتاب موطا امام شافعی کی درس و تدریس کو حکماً بند کیا۔ ملوک ماوراالنہر عجم افغانستان و ہند نے ان کتابوں کی سرپرستی کرکے اُن کو اسقدر مقدس بنادیا کہ بہت جلد قرآن کی جگہ بخاری کا درس ہونے لگا بلکہ اس سے زیادہ بابرکت سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ سلطنت ترکیہ میں اب تک جب سلطنت کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو مساجد میں بخاری کا دور کیا جاتا ہے۔ بخاری کی بزرگی و شرف کے لئے محیرالعقول روایتیں وضع ہوئیں۔ لوگ ان کو خواب میں دیکھنے لگے۔ بعض صالحین نے مراقبہ اور عالم رویا میں خود رسول اللہ صلعم کو اس کتاب کی سفارش کرتے ہوئے اور اپنی کتاب کہتے ہوئے سنا۔ یہانتک کہ وہ اصح الکتاب بعد کلام اللہ قرار پائی۔ جرح و تعدیل سے مستغنی بلکہ اس پر ایمان نہ لانا باعث خطرۂ دین و جان۔ مگر مسلمانوں میں اور فرقے بھی تھے جو وضع حدیث میں کسی سے کم رہنا نہیں چاہتے تھے اور اس سے بہتر آلہ فرقہ بندی اور اپنے خاص عقیدے کی تبلیغ کا کون ہوسکتا ہے۔ شیعان علی نے اپنا ایک علیحدہ دفتر حدیث کھولا اور اُن کو ہماری نسبت یہ آسانی تھی کہ ہمارے ہاں تو خیر صرف صحابی کی معصومیت کا سوال تھا جو ہجرت سے پچاس برس کے اندر گزر گئے تھے۔ شیعوں میں ائمہ مقتدر کی معصومیت ماموں اور خلیفہ متوکل تک قائم رہی۔ یعنی ایک کلام جب ایک امام معصوم کے منہ سے نکلا تو پھر اس پر جرح و تعدیل کیا معنی۔ اور ان ائمہ معصومین کا زمانہ آخری خلفائے عباسیہ تک تھا۔ شیعوں کی حدیثوں کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

(۱) کافی [۳۲۹ ہجری] (۲) ابن بابویہ [۳۸۱ ہجری] (۳) استبصار طوسی [۴۲۶ ہجری]
(۴) نہج البلاغت سید رضی [۴۰۶ ہجری]

پھر سنیوں کے نزدیک یہ کتابیں ویسے ہی مردود ہیں جیسے شیعوں کے نزدیک سُنیوں کی کتابیں پھر طرہ یہ کہ سُنیوں نے

شیعوں کے راوی اور شیعوں نے سنی راویوں سے استناد کیا۔ چنانچہ خود بخاری و مسلم کے اسناد میں ایسے لوگ شامل ہیں جو درحقیقت رافضی یا زندیق تھے۔ مثلاً یزید ابن زیاد کے متعلق ابن عدی نے کہا ہے کہ وہ کوفہ کا شیعہ تھا۔ محمد بن الفضل نے کہا ہے کہ وہ شیعوں کا زبردست امام تھا۔ مسلم نے اس کی روایتوں کو لیا ہے۔ یا ابواسحق شیعی جس سے بخاری و مسلم دونوں نے حدیثیں لی ہیں۔ یا فطن ابن خلیفہ جس کو ابن معین ثقہ کے ساتھ شیعہ کہتا ہے یا عمار ذہبی یا عبدالرزاق بن ہمام۔ اسی طرح شیعوں نے سنیوں کی تقریباً وہ تمام روایتیں اخذ کیں۔ جن میں حضرت علی، امام حسن و حسین وغیرہ کی منقبت یا خلفائے راشدین و بنی اُمیہ کی منقصت تھی یا ابن عباس کے ذہنی فتاوے مثلاً جواز متعہ۔ جمع بین الصلاتین۔ مسح جلین۔ قتل مرتد۔ نسخ و تحریف قرآن۔ رجم زانی کی روایتیں۔ مسلمانوں کی جماعت کے بعض اسکول نے اس پر بھی قناعت نہ کی بلکہ انھوں نے اپنے فرقوں کے لئے اور بھی دفاتر تیار کئے۔ چنانچہ مسند امام شافعی۔ مسند امام محمد۔ مسند امام اعظم۔ وہ کتابیں ہیں جو ان ائمہ کے شاگردوں نے خود لکھ کر اپنے امام کے نام سے موسوم کردیں۔ اسی طرح شیعوں میں یعقوب کلس (Jacob Killis) قاہرہ کے ایک یہودی نے خلفائے بنی فاطمہ کے لئے جن کا وہ وزیر تھا ایک کتاب وضع کی اور اسکا نام کلینی رکھا۔ اور خلفائے فاطمیہ نے بجبر و زور اس کتاب کی تشہیر کی۔ وضع حدیث کے وقت خوارج خال خال رہ گئے تھے اور یہی ایک فرقہ ہے جس نے قرآن کے بعد نہ کوئی فقہ مرتب کی اور نہ کوئی حدیث کی کتاب وضع کی۔

غرضیکہ مفروضہ صحاح ستہ میں ہر قسم کے رطب و یابس کا اتنا بڑا انبار ہے کہ اگر ہم چاہیں کہ حقیقت کے چند دانے اور رسول اکرم کی درخشاں صورت کے چند موتی تلاش کریں تو وہ خروار بھس میں سے چند دانہ گندم کا فراہم کرنا ہے۔ مگر اس کے لئے بھی وقت و عقل درکار ہے جن میں سے ایک کا کال ہمارے نئے تعلیمیافتہ میں ہے اور دوسرے کا طبقۂ علمائے میں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دفتر احادیث اسلام کے سیدھے سادے مذہب کو اس طرف واپس لائی جہاں سے حضرت مسیحؑ و حضرت محمد مصطفٰے صلعم نے اس کی اصلاح شروع کی تھی۔ یقیناً یہ چیز قرآن کے گلے میں سنگ گراں سے کم نہیں اور کسی غیر مسلم کو ہماری فقہ یا حدیث یا تفسیر کی کوئی کتاب بغیر اس اندیشے کے نہیں دی جاسکتی کہ وہ اسکو پڑھ کر اسلام کا ٹھٹھا نہ اڑائیگا۔ یا رسول اکرم سے برگشتہ نہ ہوجائے گا۔

ان احادیث کو منقح کرنا گویا ایک مسموم کھانے کو غیر مسموم کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسے کھانے ہی سے ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ مگر از بسکہ ہماری چاٹ اس کے لئے پڑ چکی ہے۔ یہ ضعیف کوشش اس امر کے لئے ہے کہ شاید ہم کچھ زہریلے مواد کو نکالنے پر قادر ہوسکیں۔

---

Marfat.com

# اسرائیلیات

یہود کی شریعت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ اوّل توریت یعنی احکام تحریری یا الہامی۔ جس کو عبرانی اصطلاح میں "توریت شیبی کتابیہ" کہتے ہیں۔ دوسرے احکام صدری یا زبانی جس کی اصطلاح عبرانی میں "توریت شیبی الفاۃ" ہے (عین اسکے مطابق ہمارے ہاں وحی متلو و وحی غیر متلو کے الفاظ ہیں) یہود کا قول ہے کہ جو احکام طور سینا پر نازل ہوئے تھے وہ مجمل احکام تھے اسلئے یہ کافی نہیں۔ ربیوں نے کہا کہ حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر چالیس روز کا چلّہ کیا جیسا کہ کتاب خروج (باب ۲۴۔ آیت ۱۲ ۱۹) میں ہے۔ اسوقت اُن کو کچھ زبانی باتیں بھی بتلائی گئیں جو احکام ربانی کی شرح ہیں یہی احکام یہودیوں کی حدیث یا مشنا ہیں۔ جس کو عبرانی میں "**حلقہ لی موشی من شینائی**" بھی کہتے ہیں۔ حلقہ وہی ہے جو عربی میں سلک اور جس کا فاعل سالک (راہ رو) آتا ہے یعنی سنت۔ موشی عبرانی میں موسیٰ کو کہتے ہیں۔ من شینائی کے معنی وہی ہیں جو عربی میں ہیں یعنی "سنن موسیٰ من طور سینا"۔ ان زبانی احکام یا مشنا کے متعلق یہود کے دو فریق تھے۔ ایک فریسی دوسرے صدوقی۔ یا نی زمانا ایک تالمودی اور دوسرے قراتی (Qarait Jews) یا اہل قرأت[1]۔ فریسیوں کے نزدیک مشنا بھی احکام توریت کی واجب العمل ہے اور صدوقی فرقہ اس کے برخلاف اُن کو ربیوں کی موضوعات بتاتا ہے۔ صدوقی اس واسطے روز محشر و جزا و سزا کے قائل نہیں ہیں کہ اس کے ذکر سے توریت خالی ہے اور تالمود کو وہ مانتے نہیں۔ صدوقی کا قول مشنا کے متعلق ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ مشنا (جس کا ترجمہ سینٹ جیروم نے غلطی سے Dentronysis کرکے توریت کی کتاب استثناء کے ہم معنی کر دیا ہے) کا زیادہ حصہ ان خرافات ولاطائل قصّوں پر شامل ہے جنکا سلسلۂ نسب قدیم و مشرک سامی روایتوں سے ملتا ہے جو عرصہ دراز سے عوام میں سینہ بسینہ مشہور چلی آتی ہیں۔ حضرت مسیح کے قبل ان فرقوں کا اختلاف شریعت موسیٰ کے احکام زبانی و تحریری پر مبنی تھا۔ مگر فریسی فرقہ غالب فرقہ رہا۔ کیونکہ یہودیوں کے احبار و ربانیین و مشائخ اسی غالب فرقے کے موید تھے۔ برخلاف اس کے صدوقی میں کوئی زبردست قوت نہ تھی۔ پہلا فرقہ شدت سے لفظ پرست تھا اور دوسرا اسی حد تک مطلب پرست۔ فریسیوں میں صدری و زبانی احکام کا درجہ اگر احکام ربانی سے بڑھا ہوا نہ تھا تو اس سے کم بھی نہ تھا۔ صدوقی زبانی احکام یعنی روایات و حدیث کی تائید احکام ربانی سے چاہتے تھے۔ اس مطلب کے لئے توریت کی عجیب و غریب تاویل کی جاتی۔ یہ فرقہ

---

[1] مسلمانوں میں ابتداء سے ایک فرقہ اہل قرأت یا اہل قرآن کا تھا۔ چنانچہ حدیث میں بھی اسکا اشارہ پایا جاتا ہے یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا میری اُمت میں ایک گروہ ہے جو ہمیشہ راہ راست پر قائم رہیگا لوگوں نے کہا وہ کون گروہ ہے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا وہ اہل قرأت ہیں۔

Marfat.com

اگرچہ یہ نہ چاہتا تھا کہ احکام شریعت میں کوئی نئی بات پیدا کی جائے بلکہ صرف مروجہ اعمال مذہب میں بہ اصول منطق و قیاس جیسا اُن کی سمجھ میں آتا تھا احکام شرعیہ کا جواز پیدا کریں۔ لیکن فریسیوں میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ انھوں نے توریت میں مشنا کے احکام و قصص و روایات جان بوجھ کر داخل کئے یا اُن کو بدل ڈالا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ توریت کی تفسیر جب ارامی زبان میں لکھی گئی تو تفسیر کے ضمن میں ہر قسم کے ہفوات و من گھڑت قصے داخل کتاب کئے گئے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ربیوں نے ناسخ و منسوخ کا مسئلہ پیدا کر کے احکام توریت کو اپنی شریعت مزعومہ سے جب چاہتے باطل کر دیتے۔

شریعت یہود مسلمانوں کی فقہ کی طرح زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھی۔ اس میں دنیاوی اور دینی کوئی فرق نہ تھا۔ وہ حفظان صحت۔ وراثت۔ زراعت۔ لباس۔ نکاح۔ طعام۔ بیع و شرا وغیرہ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں دخل دیتی ہے۔ یعنی یہودیت صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ایک قومی و سیاسی دستور العمل ہے۔ یہی وہ شریعت تھی جو سب سے پہلے مسیحیت کے مقابل آئی۔ حضرت مسیح کا دعوی تھا کہ وہ شریعت یہود کو مٹانے نہیں آئے بلکہ اس کی تکمیل کو آئے ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بقول انجیل وہ شریعت یہود کے بعض احکام کی پروا نہ کرتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ شریعت پناہ فریسیوں کے متعلق نہایت تلخ جن کو وہ مکار۔ خاطی۔ زانی۔ ریاکار۔ اولاد افعی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ مگر اس کا ثبوت نہیں کہ وہ فریسیوں کے اختلافات کے متعلق صدوقی فرقے کی تائید کرتے تھے یا اُس کو بہتر سمجھتے تھے۔ البتہ اُنھوں نے یہ ضرور کیا کہ جرات سے اس کا علانیہ اقرار کیا کہ یہود کے بعض احکام شرعی وقت و زمانے کے لحاظ سے قابل تبدیلی ہیں۔ اگر اُن کا یہ قول انجیل میں الحاقی نہیں ہے کہ انھوں نے رومیوں کی سلطنت اور یہودیوں کی شریعت دونوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے سیاست و مذہب کو علیحدہ کر دیا "جو خدا کا ہے خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے قیصر کو دو" سے ظاہر ہے کہ وہ شریعت کے بعض دنیاوی مسائل کو جن کا تعلق قومی سیاست سے تھا ترک کرنے پر تیار تھے۔ حضرت مسیح کے بعد اُن کے شاگرد اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ یعنی وہ اس کے لئے بھی تیار تھے کہ یہود کی ساری شریعت کو کالعدم کر دیا جائے۔ اُن کا یہ خیال تھا اور غالباً صحیح تھا کہ مذہب کی تبلیغ عام دنیا کی تمام قوموں میں شریعت یہود کی پابندی کے ساتھ ممکن نہیں۔ اور اگر مسیحیت کو تبلیغی مذہب ہو کر دنیا میں پھیلنا ہے تو شریعت یہود یعنی ایک قومی شریعت کو ترک کرنا لازم ہے۔ نہ صرف ترک کرنا بلکہ بقول پولوس رسول۔ شریعت یہود ایک طوق لعنت ہے جو مذہب عیسوی کے گلے میں ڈال دی گئی ہے۔ چونکہ خود حضرت مسیح کے نزدیک شریعت آب ذہبی مذہبی انسان تھے۔ قیاس بعید نہیں کہ حضرت مسیح اگر زیادہ دنوں تک زندہ رہتے تو غالباً آخر میں وہ بھی وہی کرتے جو اُن کے خلیفہ پولوس نے کیا۔

تم نے قرآن شریف میں پڑھا ہوگا (سورہ الاعراف رکوع ۱۹۔ آیت ۱۵۰) کہ "نبی الامی" جو انجیل و توریت کا موعود ہوگا وہ منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کریگا کہ شریعت کی بیڑیوں کے بار گراں سے یہود کو خصوصاً اور دوسری

قوموں کو نجات دیگا۔ سوال یہ ہے کہ اغلال شریعت ہے کیا جسکا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ اغلال کے معنی اُس زنجیر کے ہیں جو گلے میں ڈالکر اس سے ایک قیدی کے ہاتھ و پیر جکڑ دئے جائیں کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اغلال کا لفظ شریعت اور خصوصاً شریعت یہود کے لئے اسقدر پُر معنی اور فصیح ہے کہ اس کی تعریف کسی دوسرے لفظ سے ممکن نہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ یہود کے احکام سبت و قربانی سے اغلال مراد ہے۔ جس کو قرآن نے ایک حد تک کالعدم کر دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اغلال کی تعریف میں نہ سبت آتا ہے نہ قربانی۔ بلکہ شریعت کے وہ تمام احکام و اجزا ہیں جو مذہب کو ایک محدود جماعت سے زیادہ پھیلنے میں روکاوٹ ڈالتے ہیں اور ایسی شریعت زدہ جماعت احباریت کے ہاتھوں میں کھلونا ہو کر رہ جاتی ہے۔ یعنی مذہب نام ہوجاتا ہے صرف لفظی بحث و جسمانی حرکات کا۔ جس کو انگریزی کی اصطلاح میں لیگلزم و فارملزم کہتے ہیں۔ اور جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ قتل ناحق۔ ایذا رسانی۔ زنا۔ ظلم۔ چوری۔ غبن۔ سود لیے گناہ عظیم نہیں سمجھے جاتے جیسا سبت کے روز غیری روٹی پکانا۔ بپتسمہ نہ لینا۔ ڈاڑھی منڈانا۔ سگریٹ[1] پینا۔ غیر ذبیحہ کھانا۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پارسائی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ یعنی مذہب کا وہ سارا مقصد فوت و غربود ہوجاتا ہے جس کے لئے نماز و روزہ و زکوٰۃ ایک زینہ یا راستہ نیکی کے پہنچنے کا ہوتا ہے مگر جو شریعت کی بدولت اصل مقصد پارسائی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اسی فارملزم کی بُرائی قرآن مجید نے اس مشہور آیت میں کی ہے۔ لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ وعمل صالحا الی آخرہ

یہودیت و اسلام میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہودی ایک قومی مذہب ہے اور اسلام عمومی۔ یہود احباریت و شریعت کا پابند ہے اور اسلام "ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ" کا اس نے احباریت کی جڑ کاٹ کر پھینک دی اور اس کی ضرورت کو نہ نماز میں باقی رکھا نہ نکاح میں۔ مگر کیا یہ تماشا قابل عبرت نہیں ہے کہ ہمارا موجودہ طرز عمل قرآن کی تنقیص کرتا ہے اور یہودیت کی تائید۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے حدیث سازی و شریعت نوازی میں ان یہود کی نقل کی جو ان کے اردگرد شام و عراق و مصر میں تھے۔ ان کے اعمال و اعتقاد میں ایسی چیزیں داخل ہیں جنکا قرآن میں اشارہ تک بھی نہیں بلکہ بعض تو ایسی ہیں جو نص قرآن کے صریحاً خلاف ہیں اور جن کو شرعی جواز دینے کے لئے موضوع حدیث پیدا کی گئی اور اس کی رو سے قرآن کا حکم منسوخ قرار دیا گیا یا قرآن ناقص بتایا گیا۔ جب ذیل مسائل مسلمانوں میں فقہ کی رو سے معمول بہ ہیں ان کے لئے قرآن کا ایک ایک حرف تلاش کر ڈالو تم کو کہیں سے اس کی تائید نہ

---

[1] میجر پالگریو جس نے ۱۸۶۲ء میں نجد و اندرون عرب کا سفر کیا تھا۔ وہابیوں کے متعلق لکھتا ہے کہ ان کے نزدیک سگریٹ پینا اتنا بڑا گناہ ہے کہ قتل و غارت گری اور زنا سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ ایک زانی و قاتل کو معاف کر سکتے ہیں مگر سگریٹ پینے والے کے خون کے پیاسے ہوجاتے ہیں۔

Marfat.com

ملے گی اور اگر ملیگی تو اس کے خلاف۔

(۱) رجم مرتد (۲) رجم زانی وزانیہ (۳) رجم ساحرہ (۴) مسئلہ نسخ نقص وحی الٰہی (۵) احکام ذبیحہ وماکولات لحم (۶) احکام قربانی (۷) احکام طہارت (۸) تحریم تماثیل وتصاویر (۹) احکام لباس وشوارب وحیتہ (۱۰) غلامی (۱۱) فتنہ (۱۲) غیر یہود سے سود لینا۔ ان کے نہب وغارت کو مباح سمجھنا۔ اُن کی عورتوں سے بلا نکاح متمتع ہونا اگر دست رس میں آجائیں۔ (۱۳) عبادت میں حرکات جسمانی پر غلو (۱۴) لفظ پرستی حتی کہ احکام الٰہی میں حیل شرعی پیدا کرنا (۱۵) توریت کا عام یہود کو پڑھنا چھونا۔ سمجھنا اور ترجمہ کرنا حرام (۱۶) مذہب کو قومی شریعت کا محتاج وپابند بنانا (۱۷) انبیائے بنی اسرائیل کے متعلق لغو۔ بیہودہ اور دور از کار افسانے (۱۹) ملاحم واخبار فتن (۲۰) علمائے دین کو وارث رسول اور مطاع دین جاننا۔

غرضیکہ یہودیت کی وہ زبردست رجعت ہمارے اعمال میں ہے کہ اس نے یہودیت اور اسلام میں کوئی فرق باقی نہیں چھوڑا۔ اور حدیث کا یہ قول مجبوراً ماننا پڑتا ہے کہ "مسلمان اسی سوراخ میں گھس رہے ہیں جس میں یہود گھسے تھے"

لیکن محض بعض مماثلت کا دکھلا دینا اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں نے یہود کی تقلید کی۔ ہم کو اس کا پتہ لگانا چاہئے کہ یہود کے مراسم واحکام کو کس طرح مسلمانوں کی جماعت نے اختیار کیا۔

ابن خلدون کہتا ہے "عرب کے لوگ نہ اہل کتاب تھے نہ ان میں علم تھا۔ بدویانہ زندگی وجہالت ان پر غالب تھی۔ جب اُنکو کسی بات کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا کہ اسباب کائنات اور ابتدائے آفرینش اور اسرار وجود سے واقف ہوں جس سے آگاہ ہونے کا انسان کی طبیعت کو شوق ہوتا ہے۔ تو وہ اہل کتاب سے دریافت کرتے تھے جو اس زمانے میں یہودی اور عیسائی تھے۔ عرب کے یہودی بھی مشرکین عرب کی طرح جاہل تھے۔ بجز ان باتوں کے جو عوام الناس جانتے ہیں اور کوئی بات نہیں جانتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر قبیلہ حمیر کے تھے جو یہودی ہوئے تھے۔ جب مسلمان ہوئے تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کی جاتی ہے مثلاً ابتدائے خلق اور قرب قیامت کی نشانیاں اور اخبار فتن۔ وہ سب ان کی وجہ سے مسلمانوں میں اٹک رہ گئیں" (مقدمہ طبع بیروت۔ صفحہ ۳۰۴)

آگے چل کر ابن خلدون کہتا ہے "وھولاء مثل کعب الاحبار ووھب بن منبہ وعبد اللہ بن سلام امثالھم یعنی ان روایتوں کے اصل ماخذ کعب احبار۔ وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام کی مانند لوگ ہیں جو اصل میں یہود تھے اور بعد کو مسلمان ہوگئے۔

شاید بعض کو ابن خلدون کی رائے سے اتفاق نہ ہو مگر خود حدیث سے بھی اسکا پتہ چلتا ہے کہ مسلمان یہود کے صحبت رہا کرتے تھے اور اُن کی مذہبی کتابوں کو عربی میں سنا کرتے تھے۔ بخاری میں ہے:۔

"مسلمانوں کو سمجھانے کے لئے اہل کتاب توریت کو عبرانی میں پڑھکر اس کی تفسیر عربی میں کیا کرتے تھے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب اور کہو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے اور جو ہماری طرف اُترا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔"

گو یہ واقعہ جس کے راوی حضرت ابوہریرہ بیان کئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے زمانہ کا نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔ اسلئے کہ اوّل تو حضرت ابوہریرہ جب مدینے آئے اسوقت یہود کا آخری قلع قمع جنگ خیبر میں ہوچکا تھا۔ دوسرے خود قرآن سے ثابت ہے کہ یہود بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو اپنی مذہبی کتاب سناتے اُس کو نہایت سختی سے چھپاتے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت اس کا پتہ دے رہی ہے کہ بعد کو ایسا ہوا ہے اور یہ امر قابل قیاس ہے کہ مسلمانوں کی یہودیوں میں مذہبی صحبت رہا کرتی تھی اور وہ ان کی باتوں کو سنتے تھے۔ اگرچہ روایت اس سبب سے ضعیف ہوجاتی ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرزاق بن ہمام ہے دوسرے معمر ہیں جو آخر میں نابینا ہوگئے تھے اور انکا قوت حافظہ متغیر ہوگیا تھا۔ عبدالرزاق کی روایت بوجہ رفض میں مشہور ہونے کے مشکوک ہے۔ دوسرا شبہ اس روایت سے یہ ہوتا ہے کہ حدیث اور زیادہ تر تفسیر میں قصص یہود کا جو مواد ہے وہ یہود کی اصل روایتوں کی خواہ وہ متن توریت میں ہوں یا اُس کی تفسیر میں ایک مسخ شدہ صورت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راویوں نے کبھی ان قصص کو براہ راست عالمان یہود سے نہیں سنا تھا۔ بلکہ صرف ان بازاری لوگوں سے جن کو خود اپنے مذہبی معلومات سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ تو یا تو یہ نتیجہ نکالا جائے کہ مسلمان جب یہود سے کوئی روایت یا مسئلہ دریافت کرتے تھے تو وہ بغض وعناد سے اُن کو غلط سلط باتیں بتادیتے تھے یا یہ نتیجہ نکالا جائے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے یعنی عوام یہود کے اقوال کو راویوں نے کبھی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ پہلی صورت کے لئے یہ روایت کچھ روشنی ڈالتی ہے:۔

"عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے۔ مروان نے کہا اپنے دربان رافع سے۔ ابن عباس کے پاس جاؤ اور کہو کہ اگر ہم میں سے ہر ایک آدمی کو عذاب ہووے جو اپنے کئے پر خوش ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اس بات پر جو اس نے نہیں کی تو ہم سب کو عذاب ہوگا۔ ابن عباس نے کہا تم کو اس آیت سے کیا تعلق۔ پھر ابن عباس نے یہ آیت پڑھی واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتو الکتٰب لتبیننہ للناس ولا تکتمونہ پھر اس آیت کو پڑھا لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا ابن عباس نے کہا رسول اللہ صلعم نے اہل کتاب سے کوئی بات پوچھی۔ اُنھوں نے اُس کو چھپایا اور اُس کے بدلے اُنھوں نے دوسری بات بتائی۔ پھر نکلے اس حال میں کہ آپ کو یہ سمجھا دیا کہ ہم نے آپ کو یہ بات بتادی جو آپ نے پوچھی اور اپنی تعریف کے خواستگار ہوئے آپ سے اور دل میں خوش ہوئے اپنے کئے پر تو اللہ تعالےٰ نے انھیں کو فرمایا ہے کہ عذاب دیگا اور مراد وہ اہل کتاب ہیں۔ (ابن ماجہ)

Marfat.com

مگر یہ حدیث جہاں تک اس کا تعلق رسول اللہ سے ہے ناقابل اعتبار ہے۔ ورنہ خدانخواستہ دشمنان دین کے لئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آج تک یہ طعنے دے رہے ہیں کہ آپ یہودیوں کی باتوں کو سنکر وحی الٰہی کی صورت میں پیش کیا کرتے تھے۔ اچھی خاصی سند ہاتھ آجاتی۔ اوّل تو خود حدیث میں ہی اس روایت کی تردید ابوسعید خدری کی روایت سے جو مسلم میں موجود ہے۔ ہو جاتی ہے۔ یعنی

"کچھ منافق رسول اللہ صلعم کے زمانے میں ایسے تھے کہ جب آپ لڑائی پر جاتے تو پیچھے رہ جاتے اور حضرت کے خلاف گھر بیٹھنے سے خوش ہوتے۔ پھر جب آپ لوٹ کر آتے تو آپ سے عذر کرتے۔ اور قسم کھاتے اور یہ چاہتے کہ لوگ اُن کی تعریف کریں ان کاموں پر جو اُنھوں نے نہیں کئے۔ تب اللہ تعالےٰ نے یہ آیت اُتاری لاتحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنھم بمفازۃ من العذاب

دوسرے راوی اس کو ابن عباس کی سند سے بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ ابن عباس کا سن جسوقت یہ آیت اُتری تین چار سال سے زیادہ کا نہ تھا۔ اور یہ بعید ہے کہ مروان اس حقیقت کو جانتا ہوا ابن عباس سے سوال کرتا۔ مگر اس روایت سے اسقدر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ شام و عراق میں اکثر محدثین و فقیہہ یہودیوں سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ اب دوسری صورت کو لو۔ یعنی مسلمان یہودیوں کی افواہی باتیں سنکر اُن کو صحیح سمجھ لیا کرتے تھے۔ وہ حدیث کے ان قصص کے مطالعہ سے فوراً ظاہر ہو جائینگی جن میں سے بعض کو میں یہاں نقل کرتا ہوں۔ اور واقعی نہایت درجہ افسوس کی بات ہے کہ ان ہفوات کو رسول اللہ صلعم کے مُنہ سے کہلوایا گیا ہے۔ خدا ان راویوں پر رحم کرے۔ جنہوں نے اسرائیلیات کے لئے بھی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کے قصے بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر مجھ پر جھوٹ نہ باندھو۔ ورنہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں کرلو (بخاری)

(۱) رسول اللہ صلعم نے فرمایا جہاد کیا پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر نے تو اُس نے لوگوں سے کہا وہ مرد نہ چلے جس نے نکاح کیا ہو اور چاہتا ہو کہ اپنی عورت سے صحبت کرے اور ہنوز اس نے صحبت نہیں کی۔ اور نہ وہ شخص جس نے مکان بنایا ہو اور ہنوز اس کی چھت بلند نہ کی ہو اور نہ وہ شخص جس نے بکریاں اور گابھن اونٹنیاں مول لی ہوں اور وہ اُنکے جننے کا امیدوار ہو۔ پھر اُس پیغمبر نے جہاد کیا تو عصر کے وقت یا عصر کے قریب اس گاؤں کے پاس پہونچا تو پیغمبر نے سورج سے کہا تو بھی تابعدار ہے اور میں بھی تابعدار ہوں۔ یا اللہ اس کو روکدے تھوڑی دیر میرے اوپر۔ پھر سورج روکا گیا۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے فتح دی ان کو۔ پھر لوگوں نے اکٹھا کیا جو لوٹا تھا۔ اور آسمان سے آگ اُتری اس کو کھانے کو۔ لیکن اُس نے نہ کھایا۔ پیغمبر نے کہا تم میں سے کسی نے چوری کی ہے۔ پھر انھوں نے مل کے برابر سونا نکال کر دیا اور وہ بھی اس مال میں رکھا گیا۔ زمین پر اور آگ سے آئے اس کے کھانے کو اور اس کو کھا گئے اور ہم میں سے پہلے کسی کے لئے لوٹ درست نہیں ہوئی۔ اسلئے کہ اللہ تعالےٰ نے ہماری ضعیفی اور عاجزی دیکھی تو حلال

Marfat.com

کردیا ہمارے لئے لوٹ کو (مسلم)

دیکھو بائبل میں یوشع بن نون کے ایک واقعہ پر جو خود مہمل ہے کیسی طومار بندی اور حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔

(۲) رسول اللہ صلعم نے فرمایا بنی اسرائیل ننگے نہایا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھا کرتے تھے لیکن حضرت موسیٰ تنہائی میں نہاتے۔ لوگوں نے کہا قسم خدا کی موسیٰ ہمارے ساتھ اس واسطے نہیں نہاتے کہ انکو فتق کی بیماری ہے۔ ایک بار حضرت موسیٰ غسل کر رہے تھے وہ پتھر اُن کے کپڑے لیکر بھاگا۔ موسیٰ علیہ السلام اسکے پیچھے دوڑے کہتے جاتے تھے اے پتھر میرے کپڑے دے۔ یہاتک کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے اُن کی شرمگاہ کو دیکھ لیا۔ اور کہا قسم خدا کی اُن کو تو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اسوقت وہ پتھر تھم گیا۔ جب بنی اسرائیل کے لوگ خوب دیکھ چکے حضرت موسیٰ نے اپنے کپڑے لئے اور پتھر کو مارنا شروع کیا۔ ابوہریرہ نے کہا قسم خدا کی اس پتھر پر نشان ہیں چھ یا سات حضرت موسیٰ کی مار کے (بخاری)

"استغفراللہ۔ اس بیہودہ روایت کی خبر یہود کے فرشتوں کو بھی نہیں۔"

(۳) موت کا فرشتہ حضرت موسیٰ کے پاس بھیجا گیا۔ جب وہ آیا تو حضرت موسیٰ نے اس کو ایک طمانچہ مارا۔ اور اُس کی آنکھ پھوڑ دی۔ وہ لوٹ کر پروردگار کے پاس گیا اور عرض کی تو نے مجھے اپنے بندے کے پاس بھیجا جو موت کو نہیں چاہتا۔ اللہ تعالےٰ نے اُس کی آنکھ پھر درست کردی اور فرمایا جا اس بندے سے کہہ تم اپنا ہاتھ ایک بیل کی پیٹھ پر رکھو اور تمھارے ہاتھ تلے جتنے بال آویں اُتنے برس کی عمر تم کو ملیگی۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے پروردگار پھر اسکے بعد کیا ہوگا۔ حکم ہوا پھر مرنا ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا تو پھر ابھی سہی۔ اُنھوں نے دعا کی یارب مجھے پاک زمین کے نزدیک کردے ایک پتھر کی مار برابر۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر میں ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ کی قبر دکھاتا راستے کی طرف سرخ دھاریدار ریتی کے پاس (مسلم و بخاری)

لاحول ولاقوۃ!

(۴) رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ اللہ جل جلالہٗ نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔ اُن کا قد ساٹھ ہاتھ لمبا تھا۔ جب اُن کو بنا چکا تو فرمایا جا اور ان فرشتوں کو سلام کر اور وہاں کئی فرشتے بیٹھے تھے اور سُن وہ تجھے کیا جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ تیرا اور تیری اولاد کا یہی سلام ہے۔ حضرت آدم گئے اور کہا السلام علیکم۔ فرشتوں نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ تو جو کوئی بہشت میں جاویگا وہ آدم کی صورت میں ہوگا یعنی ساٹھ ہاتھ کا لانبا۔ اس کے بعد لوگوں کے قد گھٹتے گئے ابتک (مسلم و بخاری)

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آدم کو تو خیر پانچ ہزار برس کا زمانہ گزرا۔ ہمارے زمانے میں دس ہزار برس کے زائد انسانوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں مگر اُن کا قد چھ فٹ کے اندر ہی ہے۔

Marfat.com

(۵) رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ آدم و موسیٰ علیہ السلام میں تکرار ہوئی۔ سو موسیٰ نے فرمایا اے آدم آپ باپ ہیں ہمارے سو آپ نے ہم کو محروم کیا اور نکالا جنت سے اپنے گناہ کے سبب سے۔ سو فرمایا حضرت آدم نے اے موسیٰ اللہ تعالیٰ نے چن لیا تم کو اپنے کلام کرنے سے اور لکھی توریت تمھارے لئے اپنے ہاتھ سے تو کیا ملامت کرتے ہو تم مجھ کو اس کام پر جو اللہ سبحانہٗ نے میرے اوپر تقدیر کیا چالیس برس میری پیدائش سے پہلے۔ سو جیت گئے آدم علیہ السلام تقریر میں (مسلم و بخاری)

(۶) حضرت سلیمان کے ساٹھ بیبیاں تھیں۔ ایک روایت میں ستر ہے۔ ایک میں نوے۔ ایک میں ننانوے اور ایک میں سو (رجماً للغیب) اُنھوں نے کہا میں اُن کے پاس ایک رات میں ہو آؤنگا اور سب کو پیٹ رہیگا۔ پھر ہر ایک اُن میں سے لڑکا جنے گی جو سوار ہو کر خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریگا لیکن کوئی حاملہ نہیں ہوئی۔ سوائے ایک عورت کے وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ جناب رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر حضرت سلیمان انشاء اللہ کہتے تو ہر ایک عورت ایک لڑکا جنتی وہ سوار ہوتا خدائے تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا۔ (مسلم و بخاری)

بائبل میں سات سو بیبیاں اور تین سو کنیزیں ہیں۔ مگر باقی قصہ کا ذکر نہیں۔

اسیطرح حضرت ابراہیم و نمرود کا قصہ ہے۔ نمرود بقول روایت بائبل طوفان نوحؑ سے قبل گزرا ہے۔ اسلئے جس نے سب سے پہلے ابراہیم و نمرود کا قصہ بیان کیا۔ اُس نے یقیناً اس کو یا تو اپنے دل سے گڑھا یا بازاری لوگوں کے قول پر اعتبار کر لیا اور خود اس کی تحقیق نہ عالمان یہود سے کی، نہ اُن کی کتابوں سے۔ اس قصے میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ جو یہ عوام میں مشہور ہے کہ نمرود ایک مچھر کے ناک میں گھس جانے کیوجہ سے ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ قصہ یہودی طیطس فاتح القدس کے بارے میں بیان کرتے تھے۔ طیطس کے قصے کو نمرود سے خلط مبحث کرنا جاہلوں کا کام ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی یہودیوں نے وادی خفرون (KEDRON) کے پرانے معابد کے دیوتا اڈوانی کی روایتیں تھیں جن کی جاہل یہودی پرستش کرنے لگے تھے اور ان سے مرادیں مانگنے جاتے تھے۔ اس میں دیوتا کے نام کو اُن کے معابد سے منتقل کر دیں۔ رفتہ رفتہ خفرون سے مراد ایک ایسے عجیب الخلقت انسان سے ہو گئی جو کبھی مرتا نہیں۔ ہر سال بہار میں نئی جوانی سے اُٹھتا ہے اور جو لوگ صحرا یا دریا میں مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں اُنکی امداد کو موجود ہوتا ہے۔ یہودیوں کی یہی خرافات اب مسلمانوں کے قصہ خضر کا مایہ ناز ہیں۔ اب بھی صحرائے شام کے بدوی خضر کی پرستش کرتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ مسلمانوں نے یہود کی باتیں سنی سنائی اخذ نہ کیں بلکہ اُن کی کتابوں کو پڑھ کر اُن کے بعض خرافات قصوں کو لیا۔ مثلاً حدیث میں جو یہ قصہ مشہور ہے کہ فرعون کی ایک عورت جس کا نام آسیہ (بر پائے مجہول) تھا وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لائیں۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ یہودیوں میں قصے کی ایک کتاب ہے جسکا نام یوسف و آسنہ ہے مگر اس کا نام "ن" سے لکھا جاتا ہے۔ یہ "ے" ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پڑھنے والے نے آسنہ کو آسیہ پڑھ لیا۔ اور وہ نام خضر و نمرود کی طرح غلط سلط مشہور ہو گیا۔ ایسا ہی آصف برخیا کو حضرت سلیمان کا وزیر بنا دیا حالانکہ وہ ٹھیک زمانے میں ثمر کی

Marfat.com

طرف سے ماوراء فرات کا حاکم تھا۔

محدثین نے یہودیوں کے خرافات قصوں ہی سے اعتنا نہیں کیا۔ اُنھوں نے وہ باتیں بھی اخذ کیں ہیں جو اعمال و عقائد سے متعلق ہیں اور جنکا قرآن میں کہیں کنائتاً یا صراحتاً بھی ذکر نہیں مثلاً بہشت ارضی جس کے حدود اربعہ نیل و فرات و سیحون و جیحون ہیں (جیسا بائبل کی روایت ہے) یا قیامت کے روز مردوں کا حشر کرنا' پانی برسنے کے بعد روئیدگی نباتات کیطرح جیسا تالمود میں ہے اور جس کی بازگشت حدیث کی اس روایت میں ملتی ہے۔

" رسول اللہ صلعم نے فرمایا صور کے دن پھونکوں کے بیچ میں چالیس کا فرق ہوگا۔ لوگوں نے کہا اے ابوہریرہ چالیس دن کا۔ اُنھوں نے کہا میں نہیں کہتا۔ پھر آسمان سے ایک پانی برسے گا اس سے لوگ ایسا اُگ آوینگے جیسے سبزہ اُگ آتا ہے۔ اُنھوں نے کہا آدمی کے بدن میں کوئی ایسی چیز نہیں جو گل نہ جاوے مگر ایک ہڈی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اسی ہڈی سے قیامت کے دن لوگ پیدا ہونگے۔ (مسلم و بخاری)

یا ایک روایت میں قبر میں آزمائش ہونے کا عقیدہ اسطرح مرقوم ہے:۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں:" رسول اللہ صلعم میرے پاس تشریف لائے اور ایک عورت یہودیہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگی تم کو معلوم ہے قبر میں تم آزمائے جاؤگے۔ یہ سنکر رسول اللہ صلعم کانپ گئے اور فرمایا یہ یہود کے واسطے ہوگا۔ حضرت عائشہ نے کہا پھر چند راتیں ہم ٹھہرے بعد اس کے رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم کو معلوم ہے۔ میرے اوپر وحی اُتری ہے کہ قبر میں تمھاری آزمائش ہوگی۔ اس دن سے رسول اللہ صلعم پناہ مانگا کرتے تھے عذاب قبر کی"

خوش قسمتی سے یہ آیت قرآن شریف کی نہ کسی مدنی سورہ میں ہے اور نہ کسی مکی سورہ میں ہے ورنہ ہمارے دشمنوں کو کافی وجہ رسول اللہ صلعم کی وحی کی حقیقت دکھلانے کی ملجاتی۔ ابتدائی مکی سورتوں میں ایک جگہ الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر آیا ہے۔ مگر اس میں قبر کے اندر آزمائش کا ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ قرآن میں متعدد بار عالم برزخ کا ذکر آیا ہے اور اس کے متعلق جو کچھ آیتیں ہیں وہ بالکل اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ اور سب سے بڑا لطف یہ ہے کہ موجودہ یہود میں بھی ایسا کوئی عقیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں قدیم کفار مصر میں یہ عقیدہ البتہ ملتا ہے جب مردے " عزیہ دیوتا کے سامنے پیش ہوں گے اور اُن سے سوال و جواب ہوگا۔ اسی عقیدے کی آواز بازگشت ہمارے حدیثوں میں ہے جسکے راوی حسب معمول ابوہریرہ ہیں یا وہ وضاعین و کذابین ہیں جنھوں نے انکے نام و شہرت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ نکیرین کے سوال و جواب و عذاب قبر کی روایت اس سے زیادہ سہل ہے جتنی قدیم مصریوں میں تھی۔ یہاں مردہ قبر میں زندہ کرکے بٹھایا جائیگا۔ اس سے پوچھا جائیگا کہ تیرا رب کون ہے۔ اور جواب پر اسکا عذاب و ثواب موقوف ہوگا۔ اسواسطے پرانے خیال کے مولوی میت کے اوپر کا تختہ اتنا اونچا رکھتے ہیں کہ مردہ اُٹھ کر بیٹھ سکے اور اسکا سر تختہ سے نہ ٹکرائے۔ سبحان اللہ!

Marfat.com

ان مثالوں سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ واضعین حدیث نہ توریت سے واقف تھے اور نہ خود اپنے قرآن سے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک مثال ترمذی اور نسائی کی ایک حدیث ہے۔ جو توریت کے احکام عشرہ کے متعلق ہے۔ روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو۔ سُن لیگا تو اُس کی چار آنکھیں ہو جائینگی۔ اس کے بعد وہ آپکی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ حضرت موسیٰ کو نو آئتیں کونسی دی گئی تھیں۔ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں :۔ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا۔ زنا نہ کر۔ کسی بیگناہ کو قتل نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جادو نہ کر۔ کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھا۔ سود نہ کھا۔ کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگا۔ میدان جہاد سے نہ بھاگ اور خاص تمھارے لئے اے یہود دسواں حکم یہ کہ سبت کے دن زیادتی نہ کر۔ یہ سنکر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا"

کیا واضع اس سے واقف نہیں کہ حضرت موسیٰ نو نشانیاں[۱] لیکر فرعون کے پاس گئے تھے اور احکام عشرہ بنی اسرائیل پر اسوقت نازل ہوئے ہیں جب وہ مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں سرگردانی کر رہے تھے۔ کیا قرآن کا پڑھنے والا اس سے واقف نہیں کہ وہ نو نشانیاں کیا ہیں۔ کیا وہ ید بیضا۔ عصا رموسیٰ۔ آفات قمل۔ ضفادع ودم وغیرہ کو نہیں جانتا تھا۔ جسکا قرآن اور توریت میں اسدرجہ ذکر ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ واضع حدیث کس دنیا میں رہتا تھا پھر احکام عشرہ وہ نہیں ہیں جنکو وہ بیان کر رہا ہے۔ وہ تو اسقدر مشہور ہیں کہ جس یہودی سے وہ جا بتنا دریافت کر کے صحت کر لیتا۔ احکام عشرہ میں سود نہ کھانا۔ میدان جہاد سے بھاگنا۔ جادو نہ کرنے کا کوئی حکم نہیں۔

قرآن شریف میں تصاویر و تماثیل کے متعلق کوئی وعید نہیں۔ حالانکہ انھیں احکام عشرہ میں ایک حکم میں اس بات کی خاص ممانعت ہے کہ کوئی پتھر کا بُت گڑھا نہ جائے۔ قرآن شریف میں اس کے خلاف حضرت سلیمان کے قصے میں آیا ہے۔ یعملون لہٗ مایشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیٰت اعملوا ال داؤد شکرا وقلیل من عبادی الشکور۔ شاہی ربیوں نے ہر قسم کی تصاویر بنانے کی سخت ممانعت کر دی۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور رومیوں کی آخری جنگ جس میں بیت المقدس تباہ ہوا وہ اس بات پر شروع ہوئی تھی کہ رومیوں کے جھنڈوں پر عقاب کی تصویر تھی اور یہود اس کے بیت المقدس میں لگانے کی مخالفت میں بغاوت کر بیٹھے۔ جب رومی غالب آئے اور اُنھوں نے ہیکل کو مسمار کیا تو یہودیوں کی وجہ بغاوت کے پاداش میں یہ حکم دیا گیا کہ ریقہ کا بت مذبح یہود پر قائم کیا جائے۔ باوجودیکہ خود رسول اللہ صلعم کا جھنڈا رایت العقاب کہلاتا تھا کہ اس پر رومی عقاب کی تصویر تھی

---

[۱] ولقد اٰتینا موسیٰ تسع اٰیٰت بینٰت فسئل بنی اسرائیل اذ جاءھم فقال لہٗ فرعون انی لاظنک یٰموسیٰ مسحورا (بنی اسرائیل ۱۲)

Marfat.com

اور بقول مقریزی خلیفہ عبدالملک نے بیت المقدس میں جو مسجد بنوائی تھی اسکے دروازے پر آنحضرت صلعم کی شبیہ مبارک بنائی گئی تھی (دیکھو اسلامک ریویو۔ وکنگ فروری ۱۹۴۱ء صفحہ ۶۲)

مسلم میں صحیح سے روایت ہے" میں مسروق کے ساتھ ایک گھر میں تھا۔ میں نے عبداللہ ابن مسعود سے سنا وہ کہتے تھے رسول اللہ صلعم نے فرمایا سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن تصویر بنانے والے کو ہوگا" تو گویا اس حساب سے حضرت سلیمان پر بھی نعوذ باللہ عذاب ہوگا۔ پھر حدیث کی رُو سے عذاب بھی ہوگا تو کس وجہ سے۔ اسلئے نہیں کہ تصویر بنانے والا شاید بتوں کی پرستش کی رسم جاری کرنے کا سبب ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اللہ میاں اس سے کہیں گے کہ میری نقل کی ہے تو ڈالدے اس میں روح اور وہ ہکا بکا ہوکر رہجائیگا۔ اور اسلئے مار کھا جائیگا اور ہمارا عالم جب اپنی وعظ گوئی کی مزدوری میں روپیہ لیتا ہے تو اُس کو اُٹھا کر اسلئے نہیں پھینکدیتا کہ اسپر بادشاہ وقت کی حرام تصویر ہے۔ چونکہ اس میں سر کٹا ہوا ہے۔ اسلئے وہ پہلے ہی سے مردہ بنایا گیا ہے۔ اس میں روح بھی پڑیگی تو زندہ نہ ہوسکے گا۔ اسلئے ایسے مصوّر مبلغ کا استعمال جائز!

واضع جب اپنی وہم وحماقت کو رسول اللہ صلعم سے منسوب کرے تو اسکا جواب یہ ہے کہ ایسے عمل کو ردعمل کے لئے قصداً کرنا چاہیئے۔ خدا کی پناہ۔ کیا اس احمق کے نزدیک خدا ہم سے بھی گیا گزرا ہے کہ وہ ایسی وجہ عذاب اپنے بندے کے لئے پیدا کرے۔ کون ایسا انسان ہے جو تصویر بنانے پر خدا کی نقل بنانے کا مدعی ہوتا ہے پھر انسانی تصویر پر کیوں عذاب ہے۔ پھول وشجر کی تصویر میں بھی تو اسکی نقل ہوتی ہے۔ مزامیر یا خوش الحانی کا گانا حدیث نے حرام ٹھیرایا ہے۔ حالانکہ حرام ہونے کی کوئی چیز تھی تو شاعری جسکی مذمت قرآن شریف میں ہے۔ گانے کے خلاف قرآن نے کنایۃً اور اشارتاً بھی ایک لفظ نہیں کہا بلکہ داؤد علیہ السلام جنکا یہ خاص مشغلہ تھا۔ اسکی توصیف کی ہے کہ پہاڑ اور وحوش بھی اس سے مست ہوجاتے تھے۔

یہودیوں میں ہندوؤں کی طرح کھان پین میں بھی مذہب وایمان کا دخل تھا۔ چنانچہ کتاب ثنیہ میں ماکولات لحم کی ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست ہے۔ جس کے کھانے سے مذہب برباد ہوجاتا ہے۔ قرآن شریف میں خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہودیوں پر یہ حلال وحرام اسلئے تھا کہ وہ اس سے زیادہ کی اہلیت مذہب میں نہ رکھتے تھے۔ مگر مسلمانوں نے یہود کی تقلید میں قرآن کو فراموش کرکے یہ حدیث وضع کردی کہ رسول اللہ صلعم نے ہر پنجے دار جانور ہر کنچلی دار جانور کو مذہباً حرام قرار دیا ہے۔ امام رازی نے اس حدیث سے انکار کرتے ہوئے کیسی حق بات کہی ہے" وھذا الایۃ و علی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر الی اخرہ دال علی حل ھذا الحیوانات علی المسلمین وعندنا ھذا بقول ماروی انہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم کل ذی ناب من السباع وذی مخلب من الطیور۔ ضعیف۔ لانہ خبر واحد علی خلاف کتاب اللہ فوجب الایکون مقبولا وعلیٰ ھذا التقدیر یقوی قول مالک فی ھذا

Marfat.com

المسئلہ (تفسیر رازی جلد ۴ صفحہ ۱۶۵، ۱۶۶) یعنی کہ یہ آیت وعلی الذین ھادوا حرمنا مسلمانوں پر ان حیوانات کی حلت پر دلالت کرتا ہے اور جب یہ بات ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جو رسول اللہ صلعم کی روایت ہے کہ آپ نے درندوں میں سے ہر کچلی والے اور پرندوں میں سے ہر ناخن دار کو حرام قرار دیا ہے۔ ضعیف ہے اسلئے کہ کتاب اللہ کے خلاف ایک خبر واحد ہے۔ سو واجب ہے کہ یہ مقبول نہ ہو اور اس مسئلے میں اس تقدیر پر امام مالک کا قول پختہ ہے۔ قربانی کے اوپر میں اپنی کتاب فلسفہ مذہب[له] میں بحث کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک قربانی کی ترغیب اور اُس کے عبادتوں در افضل ہونے کی دلائیں یہ سب یہود کا اثر ہے۔ قرآن شریف میں صاف صاف ہے کہ خدا کو جانوروں کا گوشت و خون نہیں پہنچتا کہ وہ اس سے خوش ہو بلکہ اس کو تمھارے تقویٰ کی ضرورت ہے۔

مہاجنی سود جس طرح یہودیوں پر حرام تھا۔ ویسا ہی مسلمانوں پر بھی حرام ہوا۔ مگر دنیا میں سب سے بڑا سود خوار یہودی ہے اور یہود نے اس کو اس طرح مباح کیا ہے کہ وہ غیر یہود کے مال کو ہضم کرنے اور غصب کرنے میں کوئی گناہ نہیں جانتے۔ اور اسلئے غیر یہود سے وہ نہایت سختی سے سود در سود لیتے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی سود کے جواز میں جو صورت نکالی ہے وہ بالکل ہو بہو یہود کی تقلید ہے۔ اور ایک کابلی جو شاید جوش مذہب میں ایک داڑھی منڈانے والے مسلمان کو قتل کر دینا ثواب کا کام جانے گا ہندستان میں آکر وہ سود لیتا ہے کہ مہاجن بھی پناہ مانگے قرآن شریف میں ہے یاایھا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم اور ایک ایسا محکم اصول اور کلیہ بتایا ہے کہ ہم سود کی ممانعت اور جواز کی حقیقت کو سمجھ کر حرام و حلال سود کا خود فیصلہ کر سکیں یعنی بنک کے منافع اور مہاجنی سود میں تمیز کر سکیں۔ مگر مسلمان دارالحرب میں اس سود کے لینے سے نہیں بچتے جو منفعت کی یقیناً ایک بدترین صورت ہے اور جہاں مہاجن مقروض کے لئے ایسا ہی موذی مرض ہے جیسے انسان کے لئے مرض دق کہ شاید اسکا دفعیہ سب سے زیادہ خدمت مخلوق سمجھی جائے اور ایسے منافع کا حاصل کرنا جس میں یہ خرابیاں نہیں وہ اُن کے نزدیک حرام۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جس مطلب کے لئے سود حرام ہوا تھا وہ مطلب تو فوت ہوگیا اور دنیا کی معاشرت و تجارت میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اسکا الزام وہ مذہب کو دیتے ہیں۔ فقہائے مسئلہ سود میں کیا کیا جدتیں کی ہیں۔ اور کیسی کیسی شرعی باریکیاں نکالی ہیں۔ اس کے لئے حسب ذیل تحریر جو ایک متداول کتاب فقہ سے نقل کی گئی ہے۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگی:۔

"سودی لین دین کا بڑا بھاری گناہ ہے۔ قرآن مجید میں اور حدیث میں اس کی بڑی برائی اور اس سے بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ حضرت رسول اللہ صلعم نے سود دینے والے اور سود لینے والے اور بیچ میں پڑ کر سود دلانے

---

[له] فلسفہ مذہب صفحہ ۱۲۲-۱۲۵

Marfat.com

والے اور سودی دستاویز لکھنے والے۔ گواہ اور شاہد سب پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے کہ سود دینے والا اور لینے والا گناہ میں دونوں برابر ہیں۔ اسلئے اس سے بہت بچنا چاہیئے۔ اس کے مسائل بہت نازک ہیں۔ ذرا ذرا سی بات میں سود کا گن ہوجاتا ہے اور انجان لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کیا گناہ ہوا۔ ہم ضروری مسئلے یہاں بیان کرتے ہیں لین دین کے وقت ہمیشہ اس کا خیال رکھو:۔

مسئلہ۔ چاندی سونے کے خریدنے کی کئی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ چاندی کو چاندی اور سونے کو سونے سے خریدا جیسے ایک روپیہ کی چاندی خریدنا منظور ہے یا آٹھ آنہ کی چاندی خریدی اور دام میں اٹھنّی دی یا اشرفی سے سونا خریدا۔ غرضیکہ دونوں طرف ایک ہی قسم کی چیز ہے تو ایسے وقت میں دو باتیں واجب ہیں۔ ایک تو یہ کہ دونوں طرف کی چاندی یا دونوں طرف کا سونا برابر ہو دوسرے یہ کہ جدا ہونے سے پہلے ہی پہلے دونوں طرف سے لین دین ہوجاوے کچھ ادھار باقی نہ رہے۔ اگر دونوں بات میں سے کسی بات میں خلاف کیا تو سود ہوگیا۔ اسی طرح اگر تم نے روپیہ تو دیدیا لیکن اُس نے ابھی چاندی نہیں دی۔ تھوڑی دیر میں تم سے الگ ہوکر دینے کا وعدہ کیا یا اسی طرح تم نے اپنے روپیہ میں کیا یا چاندی اُدھار لے لی تو یہ سود ہے۔

مسئلہ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرف ایک قسم کی چیز نہیں بلکہ ایک طرف چاندی اور ایک طرف سونا ہے تو اُس کا یہ حکم ہے کہ وزن کا برابر ہونا ضروری ہے۔ ایک روپیہ کا چاہے جتنا سونا ملے جائز ہے۔ اسی طرح ایک اشرفی کی چاہے جتنی چاندی ملے جائز ہے۔ لیکن جدا ہونے سے پہلے ہی پہل لین دین ہوجانا کچھ اُدھار نہ رہنا یہاں بھی واجب ہے۔ جیسا کہ ابھی بیان ہوا۔

مسئلہ۔ بازار میں چاندی کا بھاؤ بہت تیز ہے۔ یعنی اٹھارہ آنہ کی روپیہ بھر چاندی ملتی ہے۔ روپیہ کی روپیہ بھر کوئی نہیں دیتا۔ یا چاندی کا زیور بہت عمدہ تیار ہوا ہے اور دس روپیہ بھر میں اس کا وزن ہے مگر بارہ سے کم میں نہیں ملتا تو سود سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ روپیہ سے نہ خریدو بلکہ پیسوں سے خریدو۔ اور اگر زیادہ لینا ہو تو اشرفیوں سے خریدو۔ یعنی اٹھارہ آنہ پیسوں کے عوض میں روپیہ بھر چاندی لے لو۔ یا کچھ ریزگاری یعنی ایک روپیہ سے کم اور کچھ پیسے دیکر خرید لو۔ تو گناہ نہوگا لیکن ایک روپیہ نقد اور دو آنے نہ دینا چاہیئے نہیں تو سود ہوجائیگا اسی طرح اگر آٹھ روپے بھر چاندی نو روپیہ میں لینا منظور ہو تو سات روپیہ اور دو روپیہ کے پیسے دیدو تو سات روپیہ کے عوض میں سات روپیہ بھر چاندی ہوگی باقی سب چاندی ان پیسوں کے عوض میں آگئی۔ اگر دو روپے کے پیسے نہ دو تو کم سے کم اٹھارہ آنے پیسے ضرور دیدینا چاہیئے یعنی سات روپئے اور چودہ آنہ کی ریزگاری اور اٹھارہ پیسے دئے تو چاندی کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آئی اور جو کچھ بچی وہ سب پیسوں کے عوض میں ہوگئی۔ اگر آٹھ روپیہ اور ایک روپیہ کے پیسے دوگے تو گناہ سے بچ نہ سکوگے۔ کیونکہ آٹھ روپیہ کے عوض میں آٹھ روپیہ بھر

چاندی ہوئی۔ پھر یہ پیسہ کیا! اسلئے سود ہوگیا۔ غرضیکہ اتنی بات ہمیشہ خیال رکھو کہ جتنی چاندی لی ہے تم اس سے کم چاندی دو اور باقی پیسے دو۔ اگر پانچ روپیہ بھر چاندی لی تو پورے پانچ روپیہ نہ دو۔ دس روپے بھر چاندی لی ہو تو پورے دس روپے نہ دو۔ کم دو۔ باقی پیسہ شامل کردو تو سود نہ ہوگا اور یہ بھی یاد رکھو کہ اسطرح ہرگز سودا نہ طے کرو کہ نو روپے کی اتنی چاندی دیدو بلکہ یوں کہو سات روپے اور دو روپوں کے پیسوں کے عوض میں چاندی دیدو اور اگر اسطرح نہ کیا تو سود ہوگیا۔ خوب سمجھ لو۔

**مسئلہ** :۔ اور اگر دونوں لینے والے رضامند ہوجائیں تو ایک آسان بات یہ ہے کہ جسطرف چاندی وزن میں کم ہو اُسطرف پیسے شامل ہونے چاہئیں۔

**مسئلہ** :۔ اور ایک اس سے بھی زیادہ آسان بات یہ ہے کہ دونوں آدمی جتنے چاہیں روپیہ رکھیں اور جتنی چاہیں چاندی رکھیں کہ ہم اس چاندی اور اس پیسے کو اس روپیہ اور اس پیسے کے بدلے لیتے ہیں۔ سارے بکھیڑوں سے بچ جاؤگے ؛؛

یہ ہے اصل اسپرٹ فقہ کی بیگلزم کی پوری شان دیکھنا چاہو تو مسائل طلاق و نکاح۔ ذبیحہ قربانی۔ طہارت صلوٰۃ۔ صیام۔ زکوٰۃ کے دیکھو۔ ایسے دقائق حل کئے ہیں جو فریسی کے باپ کو بھی نہ سوجھیں گے۔ یعنی دنیا کا کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو فقہ کی ترکیب جاننے سے جائز نہ ہوسکے اور عبادت کیسے بھی دل لگا کر کی جائے اگر ایک انگلی نہیں اُٹھی تو سب غت ربود۔ زنا۔ قتل۔ غبن کے لئے بھی شرعی جواز بن سکتے ہیں۔ ہر حکم سے اُس کے مقصد و اسپرٹ کو علیحدہ کردو۔ اور لفظ کی کھینچ تان کرو۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ ایک صوفی باصفا کی طبیعت ایک خوبصورت لڑکے پر آگئی اور وہ اُسکا بوسہ لینے پر بیتاب ہوئے۔ لڑکے سے فرمایا کہو لا الہ الا اللہ لڑکے کے مُنہ سے یہ جملہ ادا ہوتے ہی اُنھوں نے چٹ سے اسکا بوسہ لے لیا۔ پھر فرمانے لگے۔ کون ایسا کمبخت ہوسکتا ہے جو ایسے مبارک کلمے کے مخرج پر عقیدت کے بوں کو مس نہ کرے (تلبیس ابلیس)

ایک متشرع عالم کو چاندی کے ظروف کا بڑا شوق تھا۔ مگر چونکہ ان کی شرع میں اسکا استعمال حرام تھا وہ یہ کیا کرتے تھے کہ چاندی کے برتن سے چیز نکال کر اُس کو کاغذ پر رکھ لیتے اور پھر اسکا استعمال کرتے۔

مولوی نذیر احمد الحقوق و الفرائض

اور کسی کی عورت سے متمتع ہونا اگرچہ وہ نکاحی ہو اس کے لئے ایسی ایسی آسان صورتیں ہیں کہ احمق ہے جو شخص زنا کا ارتکاب کرے۔ کسی کی عورت اُس کے نکاح سے بغیر اس کے قصداً طلاق دئے ہوئے ہی نکاح سے باہر ہوسکتی ہے۔ اسکی تفصیلات مسائل طلاق و ارتداد میں کافی دی ہوئی ہیں۔ اور مقصد برآری کے بعد بلاتکلف طلاق دی جاسکتی ہے۔ صرف چند آنوں کا مہر کافی ہوگا۔ جانبین کا ایجاب وقبول تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ کیا اصحاب رسول نے کہ

Marfat.com

چادر پر جنگ خیبر میں نکاح نہیں کیا۔

پھران فقہانے اپنے قیاس و وہم کے آگے قرآن کو تو برطرف کرہی دیا تھا۔ بسا اوقات حدیث کو بھی ٹھکا
لگادیا۔ مثلاً ایک مروجہ پردے ہی کو لے لو۔ حدیث میں اسکی مطلق تاکید نہیں بلکہ ذکر تک نہیں (دیکھو حدیث بہ تف
آیت و لقد علمنا المستقدمین ولقد علمنا المستاخرین) اور قرآن کا قول تو معلوم ہے کہ اس نے مرد
اور عورتوں دونوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گھوریں نہیں بلکہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اسکے جواب
ہم نے اپنی عورتوں کے لئے ایک نہایت بدوضع بدشکل لباس برقعہ کی صورت میں ایجاد کیا ہے۔ جسکو دیکھ کر مرد تو
سے آنکھیں پھیر لیگا مگر عورت مرد کو بہت غور سے جالی کے پیچھے سے جھانکے گی اور اپنے شوہر کی خوبصورتی سے
کرکے اپنے دل کا دوبارہ سودا کرے گی۔

ہاں تو میں بھول گیا۔ سود کی وعیدوں کی بھی حدیث کی رُو سے جان لو جس کا اس فقیہہ نے ذکر کیا ہے:۔

(۱) رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ سود ستر گناہوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ادنیٰ گناہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ما
سے نکاح کرے۔

(۲) رسول اللہ صلعم نے فرمایا ایک زمانہ لوگوں پر ایسا آویگا کہ کوئی ان میں ایسا باقی نہ رہیگا۔ جس نے سود نہ کھ
ہو جو کوئی سود نہ کھاویگا اُس کو بھی سود کا غبار لگ جاویگا (ان دونوں حدیثوں کو ملاکر پڑھو اور ان بدنصیب
مسلمانوں پر خون کے آنسو بہاؤ جو ہمارے فقیہہ کی ترکیب پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے قیامت کے دن اس حالت میں
اُٹھیں گے کہ اُن کے ناصیہ پر "مادر.....» لکھا ہوگا) اللھم احفظنا!

مگر صرف یہودی ہی نہ تھے جن کی روایتیں محدثین نے لیکر رسول اللہ کا نام لگا دیا ہے۔ شام و عراق میں نصا
کی بھی جماعت کثیر تھی۔ جنکا محبوب مشغلہ یا رہبانیت تھی یا قیامت اور حضرت مسیح کی آمد کا انتظار اور ان کا دجال سے
مقاتلہ یا معجزات مسیح کا ذکر۔ آثار قیامت عیسائیوں میں ایک باضابطہ مضمون ہوگیا تھا جسکو اپاکولپسی یا ملاحم کہتے
ہیں۔ مسلمانوں میں آثار قیامت کی روایتیں اس کثرت سے پھیلیں کہ حدیث کا ایک بڑا حصہ انھیں آثار کے لئے وقف
ہوگیا۔ سب سے بڑا اور دلچسپ قصہ تو خروج دجال کا تھا جسپر میں اس کتاب میں علیحدہ بحث کرونگا۔ مگر مسلمانوں نے
اس میں جدّت یہ کی کہ اپنے زمانے کے سرکش و عجیب الخلقت آدمیوں اور اپنے وقت کی ہولناک معرکہ آرائیوں کو آثار
قیامت کی روایتوں میں شامل کرلیا بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ یہودیوں کے تاریخی واقعہ جنگ کو اپنے زمانہ کے وا
جنگ سے گڈمڈ کرکے آثار قیامت کی روایت بنالی۔ جیسا کہ اس روایت میں ہے:۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم نے سنا ہے ایسا شہر جس کے ایک جانب خشکی ہے اور ایک جانب سمندر ہے۔ اصحا
نے کہا ہاں یا رسول ہم نے سنا ہے (یعنی قسطنطنیہ) آپ نے فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ لڑینگے اس

سے بنی اسحاق کے ہزاروں لوگ۔ سو جب اس شہر کے پاس آوینگے تو اُتر پڑینگے۔ سو ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ تیر مارینگے لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہیں گے تو اُس کے ایک طرف کی دیوار گر پڑے گی۔ پھر دوسری بار تکبیر کہیں گے تو اُس کے دوسری طرف کی دیوار گر پڑے گی۔ پھر تیسری بار تکبیر کہیں گے تو ہر طرف سے کھل جاویگا سو اس شہر میں گھس پڑیں گے اور لوٹیں گے سب لوٹ کا مال۔"

دیکھو اریحا (یشوع ۶ باب) کے فتح کا جو قصہ کتاب یوشع میں ہے اُس کو کہاں چسپاں کیا۔ معلوم نہیں مسلمانوں نے قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت جو ولید۔ معاویہ۔ مہدی اور ہارون رشید کے وقت میں ہوا تھا۔ اس ترکیب پر عمل بھی کیا اور اس کا کیا نتیجہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روایت محض عسکر کا جو سردی کی شدت سے پریشان ہو گئی تھی دل بڑھانے کے لئے وضع کی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ نو مسلم نصاریٰ نے اپنی کتابوں کی بہت سی باتیں حدیث میں داخل کر دی ہیں۔ مسلم کی یہ روایت جو بالکل بائبل کے اقوال کا چربہ ہے اسکی دلیل ہے:۔

"رسول اللہ صلعم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماویگا قیامت کے دن اے آدم کے بیٹے میں بیمار ہوا تو نے میری خبر نہ لی۔ وہ کہیگا اے میرے پروردگار میں تیری خبر کیونکر لیتا۔ تو ایک ہے سارے جہان کا پروردگار۔ وہ فرمایگا تجھ کو معلوم نہیں میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو نے اس کی خبر نہ لی۔ اگر تو اسکی خبر لیتا تو مجھ کو پاتا اس کے نزدیک۔ مجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہ کھلایا۔ اگر تو اُس کو کھلاتا تو اسکا ثواب میرے پاس جاتا۔ اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے پانی نہ پلایا۔ بندہ بولے گا میں تجھے کیونکر پلاتا تو ایک ہے سارے جہان کا پروردگار۔ فرماویگا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اسکو نہیں پلایا اگر تو اُس کو پلاتا تو اُس کا بدلہ میرے پاس پاتا۔" (مسلم)

یا رسول اللہ صلعم نے فرمایا میرے پاس خواب میں کوئی شخص آیا اور کہنے لگا۔ مناسب یہ ہے کہ آنکھیں سوتی رہیں اور کان سنتے رہیں اور دل جاگتا رہے۔ لہذا یہی صورت ہوئی کہ میری آنکھ سوتی رہی۔ کان سنتے رہے اور دل جاگتا رہا پھر اس نے کہا کہ ایک سردار نے گھر تیار کیا اور اس میں کھانے کا سامان مہیا کر کے ایک شخص کو لوگوں کے بلانے کے واسطے بھیجا پس جس شخص نے اسکی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں آکر کھا گیا اور وہ سردار بھی اس سے خوش ہوا۔ اور جس نے بلانے والے کی بات کو قبول نہ کیا تو وہ محروم بھی رہا اور سردار بھی اس سے ناخوش ہوا۔ لہذا سردار خداوند تعالیٰ ہے۔ داعی محمد صلعم ہیں۔ مکان اسلام ہے اور کھانا جنت ہے۔"

غالباً یہ بھی کسی نصرانی کا قول ہے جو حضرت مسیح کو سردار انبیاء سے فضیلت دیتا ہے۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جس کو شیطان کونچہ نہ مارے وہ پیدائش کے وقت چلاتا ہے اسکے کونچنے سے مگر ابن مریم اور ان کی ماں۔" پھر راوی نے کہا اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: انی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطان الرجیم

Marfat.com

ابتدا میں نصاریٰ جو رومیوں کے ہاتھوں ستائے اور قتل کیے جاتے تھے اُن کو سریانی اصطلاح میں "شہ
کہتے ہیں۔ جسکا لفظی ترجمہ یونانی زبان میں "مارٹر" (MARTYR) ہے۔ اگرچہ سریانی میں اسکا لفظی ترجمہ اور لغوی
وہی ہے جو عربی میں ہے یعنی شہادت دینے والا مگر اصطلاحی معنی اس کے خدا کی راہ میں مقتول کے اسلئے ہوگ
وہ لوگ حضرت عیسیٰ پر گواہی دینے کی پاداش میں قتل کیے گئے تھے۔ قرآن شریف کے نازل ہونے کے وقت اس اص
سے مسلمان واقف نہ تھے اور نہ خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کو قرآن شریف نے شہید کہا ہے۔ مگر حدیثوں میں
کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے جو عیسائیوں میں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث رسول اللہ صلعم کے اقوال کے بجا
ان لوگوں کے اقوال پر مبنی ہے جو شام و عراق میں یہود و نصاریٰ کی صحبت میں رہ کر اُن کے اصطلاحی الفاظ سیکھ
تھے۔ اسی طرح فقہ کا لفظ رومی لفظ (PRUDENTI) کا لفظی ترجمہ ہے۔ بازنطائن کی مسیحیت جو یونانی فلسفہ
ساتھ عراق و شام و مصر میں پھیلی ہوئی تھی اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ خلق قرآن۔ کلام (لوگس) تنزیہہ و تشبیہہ۔ صفات باریتعا
نور محمدی وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں جس کا پرتو ہمارے عقائد کی کتابوں میں ہے۔

البتہ نصاریٰ کی رہبانیت کا جو اثر حدیثوں پر ہے اس کا اتنا مفید نتیجہ تو ضرور ہوا کہ رسول اللہ صلعم جن کو بنی اُم
و بنی عباس کے امرائے کامرانی اور جنگجوئی کے رنگ میں رنگوایا تھا اُن کو بہت جلد رہبانیت و مسکینیت کے رنگ میں
رنگ دیا گیا۔ رسول اللہ صلعم سے مہینوں صوم وصال رکھائے ہر ساعت پر نماز پڑھوائی۔ فاقوں کی شدت سے اُن کے
پیٹ پر پتھر بندھوائے۔ اُمہات المومنین کو ایک جوڑے کپڑے اور ایک کھجور کے دانے پر عمر بھر قناعت کرائی۔ اصحاب
رسول کو کھجور کی گٹھلیاں اور خاردار پتیاں کھلوائیں۔ کھارا پانی پلوایا۔ ایک دھجی کپڑے سے اُن کا ستر ڈھکوایا۔ غرض
زہد و رہبانیت کا وہ طومار باندھا کہ قرآن کی آیت " انا اعطینٰك الكوثرَ " ووجدك عائلاً فاغنىٰ
"قل من حرم زينة الله" کی پوری تردید کر دی۔

پھر معجزات کا جو دفتر کھلا تو الاماں۔ لکڑی و پتھر تک سے کلمہ کہلوا دیا۔ پس ہماری حدیثوں میں نصاریٰ کا اثر
ان عقائد و اعمال میں ہے۔

(۱) خروج دجال (۲) نزول مسیح (۳) آثار قیامت۔ (۴) معجزات نبوی (۵) خلق قرآن وکلام (۶)
شہادت فی سبیل اللہ (۷) مسائل کون و تقدیر و صفات باری تعالیٰ (۸) رہبانیت و کثرت عبادت (۹) شفاعت
رسول و انبیا و اولیاء۔

ابوالامداد ابراہیم نے حاشیہ نخبتہ الفکر میں لکھا ہے :۔

" جو صحابہ بنی اسرائیل کے واقعات ماخوذ کرنے والے نہیں ہیں وہ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان " اور
حضرت علی ہیں اور جو اصحاب ان سے لیا کرتے ہیں وہ عبداللہ بن سلام اور بعض نے کہا عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں ک

جب شام کا ملک فتح ہوا تو اُن کو ایک بار اونٹ یہود و نصاریٰ کی کتابوں کا ہاتھ لگا۔ اور لگے وہ اس میں سے واقعات بیان کرنے۔ پس عمرو بن عاص سے لوگ ان واقعات کو ماخوذ کر لیا کرتے تھے۔ اسواسطے ان کی حدیثیں کم ہیں۔ مگر وہ باتیں جو کثرت سے اُن سے منقول ہیں وہ صرف اخبار قصص بنی اسرائیل اور روایات اہل کتاب کی ہیں کہ اُن کی حدیثیں ابی ہریرہ سے بھی زیادہ ہیں۔"

جلال الدین سیوطی الاتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں۔

"عبداللہ بن عمرو بن عاص نے بہت واقعات جو قصص و اخبار آخرت سے تعلق رکھتے ہیں اور جن ان کے مثل سب کے سب چونکہ وہ اُن کو اہل کتاب سے ملے تھے۔ لہذا روایت کر دئے۔"

ملا علی قاری نے کہا ہے "وہ حدیثیں کہ جن کو ان اصحاب نے بیان کیا جو اسرائیلیات میں نظر رکھتے تھے جیسے عبداللہ بن سلام اور عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں پس اُن کو واقعہ یرموک سے بہت سی کتابیں اہل کتاب کی دستیاب ہوئیں تو وہ لوگ امور غیبیہ مثلاً احوال قیامت وغیرہ روایت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض صحابہ بعض اوقات کہہ دیا کرتے تھے کہ ہم سے رسول خدا کی حدیث بیان کرو صحیفوں میں سے قصے بیان نہ کرو۔"

حافظ ابن حجر کا قول ہے:۔

"یہ لوگ (یعنی واضعین) کہا کرتے تھے دوسروں کے کلام کو ماسوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسے بعض سلف صالحین کی باتیں یا قدیم زمانے کے حکما کا کلام یا بنی اسرائیل کے واقعات اور جب کسی خبر روایت کی سند کو نہیں پاتے تو اسکو سند صحیح سے ترکیب دے ڈالتے۔"

امام حنبل کا قول ہے:۔

"حدیث میں تین چیزیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ تفسیر، ملاحم، مغازی۔"

Marfat.com

# زندیقیت

جب عرب نے عجم کو مفتوح و مغلوب کیا اور عرب کی قوت کا مقابلہ نہ پا کر عجمیوں نے بخوشی یا باکراہ اسلام قبول کیا تو ان میں بہت جلد ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگیا جو بباطن اپنے قدیم مذہب مجوس پر قائم رہے اور بظاہر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے رہے۔ ان لوگوں کو عرب اور اُن کے مذہب اور اُنکے قرآن سے حد درجہ بغض و عناد تھا۔ خصوصاً ان اصحاب رسول سے جن کے فاتحانہ ہاتھوں سے عجم کی تمام شان و شوکت و غرور خاک میں ملادی گئی تھی تو اُن کو ایسا کینہ رہا ہے کہ جب کبھی اُن کو موقعہ ملا تو ان پر علانیہ بدترین اتہام لگانے سے باک نہیں کیا۔ بنی اُمیہ کے زمانے تک تو وہ خلافت کے دبدبے سے صرف تقیہ پر اکتفا کرتے تھے۔ مگر بنی امیہ کے بعد جب بنی عباس کا زمانہ آیا تو گویا اُن کے بخت جاگ پڑے۔ یہ تو تاریخ سے ثابت ہے کہ ابو مسلم خراسانی جس نے بنی عباس کی امداد اور بنی اُمیہ کی مخالفت کے لئے اپنی قوم عجم کے ساتھ خراسان سے خروج کرکے عالم اسلامی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ خود بھی ان زنادیق کے طبقہ میں شامل تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ خلافت بنی اُمیہ میں جو شورشیں سلطنت کے خلاف عراق میں نمودار ہوئیں اور جن میں امام حسین کو بھی آلہ کار بنایا گیا۔ وہ سب زنادقہ کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا۔ ان لوگوں نے حب علی کی آڑ میں عرب کی سلطنت و مذہب پر ایسی کاری ضرب لگائی ہیں کہ اگر خدا اُن کے اشرار کو برابر دفع نہ کرتا رہتا تو تعجب نہیں کہ یہ لوگ عجم اور اسکے ساتھ عراق و شام کے ایک بڑے حصے کو قدیم مذہب مجوس یا مانویت پر لوٹا لیجاتے۔

یہ زنادقہ ہی کے فتن تھے جو متنبع۔ بابک خرمی۔ حسن بن صباح۔ قرامطہ۔ مختار۔ عبداللہ شعیی کی صورت میں عجم۔ عراق۔ شام و مصر میں ظاہر ہوئے اور جس نے ایک وقت میں دریائے سندھ سے مراکش اور حلب شام سے یمن تک مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ آخری ہولناک واقعات ہیں جو فاطمیوں و صفویوں کے ہاتھوں سے مصر و ایران میں ظہور پذیر ہوئے جبکہ مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت مع زن و فرزند کے پہاڑوں سے گرا کر ہلاک کی گئی اور بقیۃ السیف نے ماوراء النہر۔ ہند۔ افغانستان و کردستان کے پہاڑوں میں پناہ لی۔

مجوس میں صرف برامکہ کا ہی خاندان ایسا نہ تھا جو بنی عباس کے زمانے میں عروج کو پہنچا ہو بلکہ مجوسیوں کے ایسے خاندان متعدد تھے جن کو وہ مرتبہ نصیب ہوا جو اُن کو خواب میں بھی نہ ملتا۔ خلیفہ ہادی کے زمانے میں دہاقین مجوس کے خاندان جو برائے نام مسلمان ہوگئے تھے وہ منصور کے موالیوں کے زمرے میں شامل ہوکر فوج کے

Marfat.com

اعلیٰ مناصب پر مقرر کیے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعضوں کو خوزستان ایسے مشہور ملک کے خراج و نظم و نسق پر اختیار کلی دیدیا گیا۔ یہ حب علی نہ تھا بلکہ بغض معاویہ یعنی زنادقہ کی یہ سرفرازی محض اس ضد کا نتیجہ تھی جو بنی عباس کو بنی امیہ سے تھی۔ اور چونکہ بنی اُمیہ عربی عصبیت کی وجہ سے عجمیوں کے ساتھ ذلت کا سلوک روا رکھتے تھے اسواسطے ضداً جسکو بنی اُمیہ نے ذلیل کیا اُن کی بنی عباس نے حرمت کی۔ عربوں کو یہ عجم پرستی گوارا نہ تھی اور شروع میں بعض عربوں نے اشعار ہجویہ کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے عجمیوں کے خلاف خوب پھوڑے ہیں۔ بجز خلیفہ مہدی کے جس نے زنادقہ پر احتساب قائم کیا تھا یا متوکل کے تمام خلفائے عباسیہ نے عجم کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جو شاید خود شاہان ساسان روا نہ رکھتے۔ ہادی۔ ہارون اور مامون کے تمام وزرا عجمی نسل کے لوگ تھے۔ بغداد میں عجم کا لباس دربار کا لباس قرار پایا اور ایرانی کلاہ قلنسوۃ نے کفیہ اور ادغال کی جگہ لے لی۔ خود متوکل جو زنادیق کا دشمن تھا وہ بھی اپنے سکوں میں عجمی لباس میں ملبوس نظر آتا ہے۔ عرب کی سوسائٹی پر عجم کے اس اثر کا بدیہی و لابدی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی خیالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔ یہ اُمرائے عجم ظاہرا مسلمان ہوتے تھے۔ مگر باطن مانویہ عقیدہ رکھتے تھے۔ ابتدائی عباسی زمانے میں اُن کی تعداد عراق میں کثرت سے پھیلی۔ بصرہ جو خلافت کا سب سے بڑا بندرگاہ اور تجارتی مرکز تھا اس کی آبادی میں غیر عربی النسل لوگ کثرت سے تھے۔ اسی جگہ نسلوں اور مذہب کے امتزاج سے اسلام نے رفتہ رفتہ وہ صورت اختیار کر لی جو بنی اُمیہ کے اصل تمسک بالقرآن مذہب سے مختلف تھا۔ بصرہ ہی سے اعتزال۔ مسئلہ جبر و قدر کی بحثیں شروع ہوئیں جن سے مذہب کیفرنسے وہ عام بے اتفاقی پیدا ہوئی جس کی آواز بازگشت خلافت کے دربار میں مچ رہی ہے۔ انھیں آزاد خیالوں میں بشار ابن برد تھا جو ایک نابینا شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ یہ شاہان عجم کی نسل سے تھا۔ اس کا باپ کسی جنگ میں گرفتار ہو کر غلام کی حیثیت سے بکا۔ اس کی مالکہ نے جو ایک شریف عرب خاتون تھی اس کو آزاد کر کے اپنا مولیٰ بنایا۔ یہ شخص بصرہ میں رہتا تھا۔ لیکن اکثر بغداد میں خلفا کے دربار میں بھی حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس جماعت میں واصل ابن عطا، جریر بن حزم۔ عمر ابن عبید بھی شامل تھے۔ پہلے زندیق وہ لوگ کہلاتے تھے جو علانیہ مذاہب مجوس کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن لوگوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا جو منافقین تھے یعنی بظاہر مسلمان اور در پردہ مجوسی یا ثنوی عقیدہ کے پیرو رفتہ رفتہ جب اس آخری طبقے کی نسلیں اپنے آباؤ اجداد کے زرتشت کو بھول گئیں مگر ان کے ساتھ اُن کا بغض و عناد اسلام کے ساتھ ویسا ہی باقی رہا تو یہ لفظ ہر قسم کے ملحد و لامذہب و دشمن دین لوگوں کے لیے مستعمل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے خلیفہ ولید ابن یزید کا اُستاد بھی زندیق تھا۔ اور اسی کے اثر سے ولید شراب کا عادی اور مذہب سے لاپروا ہو گیا تھا۔ خلفائے عباسیہ کے بہت مصاحب تو علانیہ زندیق تھے اور ان میں سب سے زیادہ مشہور اجرد ہے۔ یہ شخص کوفہ میں پیدا ہوا اور شروع میں ایک عرب خاندان نے اُسکو مولیٰ بنایا۔ اجرد کے ایک معاصر نے اس کے بارے میں لکھا ہے "اجرد کو میں خیال کرتا ہوں کہ شاید زندیق اسوجہ سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے اشعار میں اکثر مذہب سے لاپرواہی ظاہر کرتا ہے اکبار

Marfat.com

میں کوفے کے اس مجلس خانے میں رکھا گیا جو زنادقہ کے لئے مخصوص تھا۔ اور میں نے ان میں اجرد کو دیکھا کہ وہ زندیقیوں کی نماز میں شریک ہوتا تھا۔ اور نماز میں یہ جماعت جو پڑھتی تھی اس کے اشعار اجرد کے تصنیف کئے ہوئے ہوتے تھے" اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ زنادقہ کی جماعت کوفے میں بھی کم نہ تھی اور اس سے اس قیاس میں مدد ملتی ہے کہ جن کوفیوں نے امام حسین کو بلا کر شہید کرایا وہ لوگ بھی زنادقہ جماعت کے افراد تھے۔ یہ لوگ مجوس کی طرح دو خداؤں کے پرستار تھے۔ اس زمانے کے بعض عربوں کی تحریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زنادقہ مانوی فرقے کے لوگ تھے۔ مانوی فرقہ مجوس و نصاریٰ کے مذاہب کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے۔ جس طرح سکھ مذہب اسلام و ہنود کے مذاہب کے امتزاج سے بنا ہے۔ اس فرقے کے بعض اعمال عجیب طرح اسلام کے مماثل تھے۔ یعنی یہ لوگ نماز سے پہلے وضو کرتے تھے۔ اپنی کتاب کو اس عنوان سے شروع کرتے تھے جو بجنسہٖ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ تھا۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے اور سال میں ایک مہینہ روزے رکھتے تھے۔ فون کریمر کا خیال ہے کہ رسول عربی نے اپنی شریعت میں مانوی اعمال کو نمونہ قرار دیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ قرآن سے پانچ وقت کی نماز اور تیس دن کے روزے ثابت نہیں ہیں۔ یہ فرائض مسلمانوں میں بعد کو جاری ہوئے ہیں۔ میں اس کتاب میں اس مضمون پر علیحدہ بحث کرونگا۔

بہت سے عرب بھی مانویہ عقائد سے متاثر ہوگئے تھے۔ چنانچہ مشہور شاعر صالح ابن قدوس زندیقیت کے الزام میں قتل کیا گیا۔ اسی طرح عرب کا مشہور شاعر مطیع بن الیاس جو خلیفہ مہدی کے زمانے میں تھا اس کی لڑکی جب ہارون رشید کے دربار میں لائی گئی اور اس کے عقیدے کے بارے میں اس سے استفسار ہوا تو اس نے اس بات کا اقرار کیا کہ اسکی تعلیم مانویہ طریقے پر ہوئی ہے اور اس فرقے کی کتابیں اس کو پڑھائی گئی ہیں۔ بلکہ مشہور عرب مصنف یعنی صاحب کتاب الفہرست کا قول ہے کہ خاندان برامکہ سارے کا سارا دل سے مانوی عقیدے کا مؤید تھا۔ ماموں کے زمانے میں تو ایک بار یزداں بخت جو مے کی جماعت مانویہ کا سرگروہ تھا اس سے اور علمائے اسلام سے کھلم کھلا مباحثہ ہوا۔ جب یزداں بخت حسب شرط ہار جانے پر مسلمان نہ ہوا تو ماموں رشید نے اس کو مجبور نہیں کیا۔ خلیفہ معتصم کا سپہ سالار افشین تو لاریب زندیق تھا اور جب اس پر مقدمہ چلایا گیا تو اس نے اقرار کیا کہ وہ خود ہی نہیں بلکہ خانی ایران و ترکستان کے تمام امرا در پردہ منافق و زندیق ہیں۔ گو کہ یہ بات مبالغے سے بیان کی گئی ہے۔ اسواسطے کہ افشین کے بعد زنادقہ کا نام کم سننے میں آیا ہے شاید اس سبب سے کہ خود عرب کے دل سے مذہب کا جوش و تعصب جاتا رہا۔ یا یہ کہ زنادقہ نے اپنے آبائی مذہب کو بھلا کر اسلام اختیار کر لیا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ لوگ ایک قسم کا اسلام اختیار کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوگئے تھے مگر ان کا نسلی بغض و عناد عرب کی طرف سے کبھی نہ مٹا۔ اور عرب میں ان کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جس نے عرب کو تقویت دی اور عجم کو ذلیل کیا اور سب سے بڑا دست وہ ہے جس نے اپنی قوم کے خلاف بغاوتیں کیں اور عربوں کی سلطنت کو ضعف پہنچا کر عجم کو تقویت دی۔

Marfat.com

زندیقیت کی یہ مسموم فضا تھی جس میں حدیث کے دفاتر تیار ہو رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ان حدیثوں میں جو بجائے عقل و درائت کی کسوٹی پر پرکھنے کے زید نے سنی اور زید سے بکر نے اور بکر سے عمرو نے اور عمرو سے فلاں نے اور فلاں نے فلاں سے سنیں وہ حدیثیں بھی شامل ہوگئیں جو اس قسم کی ظنی و سماعی شہادتوں کے لئے کچھ عجیب نہ تھیں مگر جن میں اسلام و قرآن پر صریح قدحت و حملے۔ رسول اکرم کی علانیہ توہین یا ہجو ملیح ہے یا اُن کے اصحاب رضوان اللہ پر بیجا اتہام ہے غالباً ان ہی لوگوں کی وہ حدیثیں ہیں جو اسلام کے منور و خوشنما و صاف چہرے کو مسخ کرنے کے لئے خرافات و مضحکہ خیز اوہام و اساطیر جاہلیت پر مشتمل ہیں۔ جن کو رسول اللہ صلعم سے نسبت دینا آپ کی شان میں بدترین گستاخی سے کم نہ ہوگی۔ انھیں زندیقوں میں ایک عبدالکریم بن ابی عوجہ تھا کہ جب وہ زندیقیت کی پاداش میں قتل کیا گیا تو اُس نے اقرار کیا کہ اُس نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔ جن میں حلال کو حرام کیا ہے اور حرام کو حلال۔ مسلمانوں کو خلاف وقت نماز پڑھائی ہے اور خلاف دن روزہ رکھایا ہے۔ خود حدیث ہی کی بعض روایتوں سے گرفت ہو جاتی ہے کہ راوی اپنے مذہب مکتوم کی کس طرح پاسداری کر رہا ہے۔

مجوس میں نحوست و نظر بد کا عقیدہ ہے۔ حدیث میں جا بجا ایسی روایتیں ملتی ہیں جن میں نحوست و نظر بد کی تائید کی گئی ہے اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وہی طریقے بتائے گئے ہیں جو مجوس میں رائج تھے۔ مثلاً مسلم کی یہ حدیث ہے:۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا نظر لگنا حقیقت ہے اور جو کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھ سکتی تو نظر ہی بڑھ جاتی۔ اور تم سے کہا جائے کہ غسل کرو تو غسل کرو (مجوس کا عقیدہ تھا کہ نظر بد کو دور کرنے کے لئے غسل کر لینا چاہئے اور اس پانی کو آگ میں جلائی جائے)

یا مجوس کا خیال تھا کہ گھوڑے کی نعل بابرکت ہے۔ حدیث میں ہے:۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا گھوڑے کی پیشانی میں برکت اور خوبی ہے۔

مجوس اپنے سامنے سیاہ کتے کے نکل جانے کو بہت بُرا شگون جانتے تھے۔ سیاہ کتے[۵] کو وہ اہرمن کا ساتھی یا مرکب

---

ف۵ کتوں کی پاکی و ناپاکی کا سوال قرآن میں کہیں پیدا نہ ہوا۔ برخلاف اسکے سورہ کہف میں اسکو اصحاب کہف کا ساتھی بنایا گیا۔ سورہ مائدہ میں اسکے شکار کو حلال کیا ہے۔ تیسری جگہ کتے کی عادت کا ذکر ہے کہ وہ ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے اور زبان نکالے رہتا ہے چاہے تم اس کو بھگا دو یا خاموش کھڑا رہنے دو۔ مگر کہیں بھی حدیث کی طرح اس کو مغضوب الٰہی و مردود ملائکہ نہیں سمجھا گیا ہے کے ساتھ یہ روایت ایسے ایسے جانور کی جو انسان کا سب سے بڑا رفیق و محافظ مال و جان ہے یا تو مجوس کے خیالات کا اثر تھا یا پھر کوئی وقتی حکم خیال حفظان صحت کہ کتوں کی کثرت دیوانگی سے انسانی جان کو خطرہ ہو جاتا ہے۔ یا انکا بے ہنگام رات کو شور و واویلا مچانا سونے والوں کے راحت اور ساجدین کے وظائف میں خلل انداز ہوتا ہے ابوہریرہ نے جب یہ حدیث بیان کیا کہ جو شخص کتا پالتا ہے الا کھیتی کی حفاظت کے لئے تو خدا اسکی کھیتی کو ہر روز ایک قیراط گھٹا دیتا ہے تو ابن عمر نے طنزاً کہا: شاید ابوہریرہ کی کھیتی میں ایسا ہوا ہو۔

جانتے تھے۔ اس حدیث میں اس خیال کا اثر پایا جاتا ہے۔

"رسول اللہ صلعم نے فرمایا سیاہ کتا اور حائضہ عورت سامنے سے نکل جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے"

مجوس کا عقیدہ تھا کہ دوزخ کے اوپر ایک پل ہے جس پر سے گذر کر با ایمان لوگ بہشت میں جائینگے۔ اس کو وہ پل شنواط کہتے ہیں۔ قرآن میں اس پل کا کہیں ذکر نہیں مگر حدیثوں میں متعدد جگہ پل صراط (جو یقیناً شنواط سے بگڑا ہو لفظ ہے) کا ذکر آیا ہے۔

مجوس میں مردہ چھو جانے کے بعد آدمی کو طہارت کرنا پڑتی ہے۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ یہ اعتقاد رکھتا ہے۔

خطیب بغدادی نے اپنی سند سے حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے کہ مجھ کو ایک شیخ رافضی کے ذریعے سے خبر ملی کہ حدیث وضع کرنے کے لئے کمیٹیاں کرتے تھے (اخبرنی شیخ من الرافضۃ انھم کانوا یجتمعون علی وضع الاحادیث)

عقیلی نے حماد بن زید کی طرف منسوب کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ فرقہ زنادیق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف چودہ ہزار حدیثیں وضع کرکے منسوب کی ہیں۔

میسرہ بن عبد ربہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی فضیلت میں نشر حدیثیں وضع کی۔

ابو زرارہ نے ائمہ کی طرف سے دو ہزار حدیثیں صرف اس بات میں وضع کیں کہ قرآن میں جابجا نقص و تحریف ہے۔ اور یہ کہ موجودہ قرآن قابل اعتبار نہیں[1]۔ اصل قرآن قیامت کے روز مہدی غائب لاوینگے۔ بعض زنادیق نے ایک قرآن بھی تصنیف کر ڈالا۔ جس میں بعض سورتوں کے نام اس طرح ہیں۔ سورہ علی۔ سورہ فاطمہ۔ سورہ حسن۔ سورہ حسین وغیرہ۔

---

[1] مسلم ہی میں ایک روایت اس قسم کی ہے۔ ابن محیفہ نے کہا میں نے حضرت علی سے پوچھا کیا تمھارے پاس کوئی ایسا علم ہے جو اوروں کے پاس نہیں ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ خدا کی قسم ہمارے پاس وہی علم ہے جو اوروں کے پاس ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بعض بندوں کو قرآن میں ایک سمجھ دی ہے اور چند باتیں ہیں جو اس کتاب میں نہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص مجھ کو بتائیں۔ اس کتاب میں دیتوں کا بیان تھا اور یہ تھا کہ مسلمان کافر کے بدلے نہ مارا جائے

عاصم نے کہا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کوئی شخص بھی ہے جو یہ خیال کرتا ہو کہ خدا کی حرام کردہ وہی چیز ہے جو قرآن میں موجود ہے جان لو کہ میں نے تم کو سمجھا دیا اور میں نے بہتروں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور منع بھی کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میرے پاس قرآن کے علاوہ اور کتاب بھی ہے (جس میں حکم ہے) کہ تم لوگوں پر بغیر اجازت اہل کتاب کے، ان کے گھروں میں جانا جائز نہیں اور نہ اپنی بیویوں کو مارنا اور نہ اس جزیہ میں سے کھانا جو کفار پر لازم ہے اور وہ تم کو ادا کرتے ہیں۔

صحاح کی حسب ذیل حدیثیں میرے خیال میں زنادقہ کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں :-

## اوّل - وہ حدیثیں جنمیں اسلام کے زوال و پامال کی آرزوئیں ہیں یا مسلمانوں کے ہلاک کرنیکی خفیہ تدبیریں!

(۱) اسلام غربت سے شروع ہوا ہے اور پھر ایسا ہی لوٹ آویگا جیسا شروع ہوا ہے اور مدینے میں اسطرح سمٹ کر بیٹھ جاویگا جیسے سانپ (نعوذ باللہ) سمٹ کر اپنے بل میں بیٹھ جاتا ہے۔

(۲) مسلمانوں کا حال یہود کی طرح ہوگا۔ حتیٰ کہ یہود اگر ایک پتھر کے پیچھے پناہ لیگا یا ایک بل میں گھسے گا تو مسلمان بھی ویسا ہی کرے گا۔

(۳) یہود و نصاریٰ بہتر فرقے ہوئے۔ مسلمان تہتر فرقے ہوجائینگے۔ جن میں ایک فرقہ ناجی ہوگا باقی ناری۔

(۴) بخار کی تپش آتش دوزخ سے ہے پس تم میں سے جس کو بخار آوے۔ چاہئے کہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرے۔

## دوم - وہ حدیثیں جن میں اصحاب رسول پر طعن وافترا ہے

(۱) حضرت فاطمہ رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی نے حضرت ابوبکر صدیق کے پاس کسی کو بھیجا اپنا ترکہ مانگنے کو رسول اللہ صلعم کے ان مالوں میں سے جو اللہ تعالےٰ نے اُن کو مدینے اور فدک میں دئے اور جو کچھ بچا تھا خیبر کے خمس سے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا اور جو ہم چھوڑ دیں وہ صدقہ ہے۔ اور محمد کی اولاد اس مال سے نہ کھاویگی۔ اور میں تو قسم خدا کی رسول اللہ صلعم کے صدقے کو کچھ نہیں بدلوں گا اس حال سے جیسے رسول اللہ صلعم کے زمانہ مبارک میں تھا اور میں اس سے وہی کام کرونگا جو رسول اللہ صلعم کرتے تھے غرضیکہ ابوبکر صدیق نے انکار کیا حضرت فاطمہ کو کچھ دینے سے۔ اور حضرت فاطمہ کو غصہ آیا اور انھوں نے حضرت ابوبکر سے ملاقات چھوڑ دی۔ اور بات نہ کی یہاں تک کہ وفات ہوئی اُن کی۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے خاوند علی بن ابی طالب نے اُن کو رات کو دفن کیا اور حضرت ابوبکر صدیق کو خبر نہ کی۔ اور ان پر حضرت علی نے نماز پڑھی۔ اور جب تک حضرت فاطمہ زندہ تھیں لوگ حضرت علی کی طرف مائل تھے۔ جب وہ انتقال کر گئیں تو حضرت علی نے دیکھا لوگ میری طرف سے پھر گئے۔ انھوں نے ابوبکر سے صلح کر لینا چاہا وغیرہ

(۲) رسول اللہ صلعم خطبہ پڑھنے کو کھڑے ہوئے ہم میں سے وعظ کا خطبہ تو فرمایا اے لوگو تم اللہ کی طرف حشر کیے جاؤگے ننگے پاؤں غیر مختون۔ جیسے ہم نے پیدا کیا اول بار ویسے ہی دوبارہ پیدا کرینگے۔ یہ وعدہ ہے ہم کو ہم کرنیوالے ہیں۔ آگاہ ہو سب سے پہلے مخلوقات میں حضرت ابراہیم کو کپڑے پہنائے جائینگے اور آگاہ ہو میری امت کے کچھ لوگ لائے جاوینگے۔ پھر اُن کو بائیں طرف بٹھایا جائے گا۔ میں عرض کروں گا کہ اے مالک یہ تو میرے اصحاب

له گویا قرآن کی اس آیت کے جواب میں [illegible]
[illegible]

ہیں۔ جواب میں کہا جاویگا۔ تم نہیں جانتے انھوں نے تمھارے بعد کیا کیا۔ میں وہی کہونگا جو ایک بندے نے کہا ہے تو
تو ان لوگوں پر اسوقت تک گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ جب تو نے مجھ کو اُٹھا لیا تو تو ان پر نگہبان تھا۔ اور تو
ہر چیز پہ گواہ ہے۔ اگر تو اُن کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور جو تو اُن کو بخشدے تو تو غالب ہے حکمت
والا۔ پھر مجھ سے کہا جاویگا کہ یہ لوگ مرتد ہوگئے تھے جب تو ان سے جدا ہوا تھا۔

## سوم۔ وہ حدیثیں جو قرآن کو ناقص اور منسوخ بتاتی ہیں۔

(۱) پہلے قرآن میں یہ آیت تھی۔ پھر اسکا پڑھنا موقوف ہوگیا۔ حرام نہیں کرتا مگر دس بار دودھ پینا یا پانچ
دودھ پینا (عورت کا) (مسلم)

(۲) رجم کی آیت اُتری اور بڑے آدمی کو دس بار دودھ پلادینے کی اور یہ دونوں آیتیں پتّی پر لکھی تھیں
جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور ہم ان کی دفات میں مشغول تھے تو گھر کی پلی ہوئی بکری آئی اور
اس پتّی کو جو میرے تخت کے نیچے پڑی ہوئی تھی کھا گئی۔ (مسلم)

(۳) قرآن میں ایک آیت تھی جو ہم رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں سورہ توبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اسطرح تھی
اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو نہریں ہوں تو وہ تیسری کی آرزو کریگا اور اگر اس کے پاس تین ہوں تو چوتھی کی
آرزو کریگا اور ابن آدم کا پیٹ سوائے خاک گور کے کسی سے نہ بھریگا (مسلم کی روایت میں جنگل کا لفظ ہے) (مسلم)

(۴) حضرت عمر نے کہا میں ڈرتا ہوں کہ زمانہ زیادہ گزر جاوے اور کوئی کہنے والا کہے کہ میں اللہ کی کتاب
میں رجم نہیں پاتا ہوں۔ پھر گمراہ ہوجاویں اللہ کے فرضوں میں سے ایک فرض ترک کرکے آگاہ ہو کہ رجم حق ہے جب مرد
محصن ہو اور گواہ قائم ہوجاویں یا حمل ہو یا اقرار کرے زناکار اور میں نے رجم کی اس آیت کو پڑھا ہے الشیخ
والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا البتۃ اور آنحضرت نے رجم کیا اور ہم نے آپ کے بعد رجم کیا۔

(۵) بددعا کی رسول اللہ صلعم نے ان لوگوں پر جنھوں نے قتل کیا تھا بیر معونہ کے لوگوں کو تیس دن تک
بددعا کرتے تھے آپ فرعل وذکوان اور لحیان اور عقبہ پر کہ نافرمانی کی اُنھوں نے اللہ اور اسکے رسول کی۔ انس نے کہا
اللہ تعالےٰ نے اُتارا ان مقتولوں اور شہیدوں کے حال میں جو بیر معونہ پر قتل ہوئے تھے اس آیت کو۔ پھر پڑھا
ہم نے اس کو قرآن کی طرح پھر منسوخ ہوگئی۔ ان بلغوا قومنا ان قد رضینا ربنا فرضی عنا ورضینا عنہ۔

(۶) ابی الاسود نے کہا۔ ابو موسیٰ اشعری نے بصرہ کے قاریوں کو بلا بھیجا۔ اور وہ سب تین سو قاری انکے
پاس آئے۔ اور اُنھوں نے قرآن پڑھا۔ اور ابو موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم بصرہ کے سب لوگوں سے بہتر ہو۔ اور وہاں
کے قاری ہو۔ سو قرآن پڑھتے رہو۔ اور بہت مدت گزر جانے سے سُست نہ ہوجاؤ کہ تمھارے دل سخت ہوجاویں

جیسے تم سے اگلے لوگوں کے دل سخت ہوگئے تھے۔ اور ہم ایک سورہ پڑھا کرتے تھے جو طول اور سخت وعیدوں میں سورۂ براءۃ کے برابر تھی پھر میں اسکو بھول گیا مگر اتنی بات یاد رہی کہ اگر آدمی کے دو میدان ہوتے مال کے تب پھر تیسرا ڈھونڈھتا۔ اور اسکا پیٹ نہیں بھرتا ہے مگر مٹی سے اور ہم ایک اور سورہ پڑھتے تھے اور اس کو مسبحات کے ایک سورۃ کے برابر جانتے تھے۔ وہ بھی میں بھول گیا۔ مگر اس میں سے یہ آیت یاد ہے۔ اے ایمان والو کیوں کہتے ہو جو بات نہیں کرتے ہو۔ اور جو بات ایسی کہتے ہو کہ کرتے نہیں وہ سب تمہاری گردنوں میں لکھ دی جاتی ہے گواہی کے طور پر [illegible] سوال ہوگا قیامت کے دن۔

## چہارم۔ ایسی حدیثیں جو قرآن کی آیت کی رکیک تاویل اور مضحکہ خیز تفسیر [illegible]

(۱) رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم جانتے ہو جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو کہاں جاتا ہے۔ لوگوں نے کہا اللہ اور اسکا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے آتا ہے اور وہاں سجدے کرتا ہے اور ٹھہرتا ہے پس اس سے کہا جاویگا کہ جا واپس جا جہاں سے نکلا تھا۔ پس وہ مغرب کی سمت سے ایک روز طلوع ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا والشمس تجری لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم۔

(۲) ہم نے اس آیت کا مطلب پوچھا ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا تو آپ نے فرمایا شہیدوں کی روحیں سبز چڑیوں کا قالب اختیار کرکے جنت میں چگتی پھرتی ہیں۔ پھر شام کو ان قندیلوں میں [illegible] جو عرش سے لٹکی رہتی ہیں۔

(۳) ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھا کرتی تھی جو حسینوں کی [illegible] الناس) بعضے لوگ اول صف میں بڑھ جاتے تاکہ اس کو دیکھ سکیں اور بعضے پیچھے [illegible] یہاں تک کہ [illegible] میں کھڑے ہوتے۔ جب رکوع جاتے تو اس طرح سے کرتے یعنی بغل کی طرف سے اس عورت کو دیکھتے۔ تب اللہ نے یہ آیت اتاری لقد علمنا المستقدمين منكم ولقد علمنا المستاخرين۔

(۴) رسول اللہ صلعم نے فرمایا قیامت کے روز ایک بڑا موٹا تازہ شخص آئیگا کہ خدا کے نزدیک اسکی حیثیت ایک مچھر سے زیادہ نہ ہوگی۔ ابوہریرہ نے کہا اگر تم کو یقین نہ آئے تو یہ آیت پڑھ لو ولا نقيم لهم يوم القيمة وزنا۔

## پنجم۔ ایسی حدیثیں جن میں آنحضرت کی ذات مبارک پر صراحتاً یا کنایتاً طعن وابہام [illegible]

[illegible]

ہے اور خوف ہے کہ ان احادیث [illegible]

Marfat.com

عقلی تردید جو مجھ سے ممکن ہے اس سے بھی گریز نہ کروں۔)

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودی مسحور کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلعم پر بنی زریق کے ایک یہودی نے سحر کیا جس کو لبید بن اعصم کہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو وہم ہوجاتا تھا کہ میں یہ کام کر رہا ہوں اور نہ کرتے تھے وہ کام۔ ایک دن یا ایک رات آپ نے دعا کی۔ پھر دعا کی۔ پھر فرمایا کہ اے عائشہ مجھے معلوم ہوا۔ اللہ جل شانہٗ نے مجھ کو بتلایا۔ جو میں نے اس سے پوچھا۔ میرے پاس دو آدمی آئے۔ ایک میرے سر کے پاس بیٹھا۔ دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھا۔ جو میرے سر کے پاس بیٹھا تھا اُس نے دوسرے سے کہا۔ اس شخص کو کیا بیماری ہے۔ وہ بولا اس پر جادو ہوا ہے اس نے کہا کس نے جادو کیا ہے۔ وہ بولا لبید بن اعصم نے۔ پھر اُس نے کہا کاہے کا ہے میں جادو کیا۔ وہ بولا کنگھی میں اور بالوں میں جو کنگھی سے چھٹے۔ اور نر کھجور کے بالی کے غلاف میں۔ اُس نے کہا یہ کہاں رکھا ہے۔ وہ بولا ذی اردان کے کنوئیں میں۔ حضرت عائشہ نے کہا پھر رسول اللہ صلعم چند اصحاب کے ساتھ اس کنوئیں پر گئے۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ خدا کی قسم اس کنوئیں کا پانی ایسا تھا جیسے مہندی کا زلال اور وہاں کے درخت کھجور کے ایسے تھے جیسے شیطان کا سر۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے اُن کو جلا کیوں نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا مجھ کو اللہ نے اچھا کر دیا۔ اب مجھے بُرا معلوم ہوا لوگوں میں فساد بھڑکاؤں۔ میں نے حکم دیا وہ کاٹا گیا۔

میرے خیال میں اس روایت کی تردید کے لئے قرآن شریف کی آیتیں پڑھ دیجائیں۔

وقال الظلمون ان تتبعون الا رجلاً مسحورا (اور کفار کہتے ہیں کیا تم ایک مسحور شخص کی پیروی کرتے ہو)

وما انت بنعمت ربك بکاهن ولا مجنون (اور خدا کے فضل سے نہ تم کاہن ہو نہ مجنون)

والنجم اذا هوی ماضل صاحبکم وما غوی (اور ستارے کی قسم جب وہ چھپتا ہے۔ تمہارا ساتھی (محمدؐ) نہ گمراہ ہے اور نہ مسحور۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہشات نفسانی کے لئے خدائے تعالیٰ وحی اُتارنے میں جلدی کرتا ہے۔

حضرت عائشہ کہتی تھیں کہ یہ عورت شرم نہیں کرتی تھی جو اپنے تئیں بخشدیتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے یہ آیت اُتاری ترجی من تشاء منھن الی آخرہ تب میں نے کہا آپ کا رب آپکی خواہش کے مطابق (وحی اُتارنے میں) جلدی کرتا ہے۔

میں نے اس حدیث کو دل پر بہت جبر کر کے نقل کیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس قبیل کی کوئی دوسری حدیث نقل کروں۔ اگرچہ قرآن کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ آیت کس موقعہ کی ہے اور کس کے متعلق ہے۔ راویوں نے حدیث میں آنحضرت کی اہلی زندگی میں جو روایتیں بیان کی ہیں۔ اس میں خود اپنے زمانے کے امراء اور خود اپنی ذہنیت کا

Marfat.com

فوٹو کھینچا ہے اور ہرگز ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ یہ عادت نہ تھی کہ :-

(۱) ہمیشہ خوبصورت عورت کو نکاح میں لانے کے خواہشمند رہتے (قصہ عمرہ بنت جون - جویریہ - صفیہ)

(۲) جو بیوی جوانی سے ڈھل چکی ہوتی اُسکو آپ طلاق دینے پر تیار ہوجاتے (واقعہ سودہ بنت زمعہ)

(۳) کسی اجنبی عورت کا حسن دیکھ کر بیقراری سے گھر آکر جو بیوی سامنے آجاتی اگرچہ وہ کام کاج میں مشغول ہوتی حاجت برآری کر لیتے اور مسلمانوں کو بھی ایسے ہی نصیحت فرماتے (واقعہ زینب)

(۴) خلاف وقت اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے اور اسکی وجہ سے بیویوں میں تکرار رنجی ہوجاتی (واقعہ زینب - حفصہ و ماریہ قبطیہ)

(۵) ایک ہی شب میں اپنی نو بیویوں کے پاس ہوآتے (روایت انس)

یہ سب زنادقہ و منافقین کا کذب و افتراء ہے - خدا ہی ان سے سمجھے اور خدا ان پر رحم کرے جنھوں نے [illegible] مکر و خدع سے دھوکا کھایا اور مسلمانوں کو اضطراب میں ڈالا -

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ سال کے سن میں حضرت عائشہ سے نکاح کیا -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے منگنی کی اسوقت میری عمر ۶ برس کی تھی - پھر ہم مدینے میں آئے [illegible] بن خزرج کے محلے میں اُترے - مجھے بخار آیا تو میرے بال جھڑ گئے - اس کے بعد پھر ایک جھوٹا سا گچھا [illegible] ہوگیا - اس کے بعد میری ماں ام رومان میرے پاس آئیں - اور میں جھولے میں تھی - میرے ساتھ کی [illegible] پاس تھیں - وہ میرے اوپر چیخیں - میں اُن کے پاس گئی - مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چاہتی تھیں - آخر [illegible] میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مکان کے دروازے پہ کھڑا کر دیا - اسوقت میرا دم چڑھ رہا تھا - [illegible] ٹھہری - پھر میری ماں نے تھوڑا سا پانی لیا اور اس سے میرا مونہہ اور سر پونچھا - [illegible] کی عورتیں تھیں - اُنھوں نے کہا علی الخیر والبرکت وعلی خیر طائر - [illegible] انھوں نے میرا سنگار کیا - پھر میں نہیں ڈری یکایک کسی چیز سے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] لائے - اور ان عورتوں نے مجھ کو آپ کے سپرد کر دیا - اس دن میری عمر ۹ برس کی تھی -

نکاح کے لئے بلوغ کی شرط نہ صرف قرآن کے خلاف [illegible] کیا ہے بلکہ دنیا کا کوئی متمدن ملک ایسا نہیں ہے جو نکاح کے لئے بلوغ کی شرط کو ضروری نہ سمجھتا ہو [illegible] میری مراد منگنی کی نہیں ہے بلکہ خلوت صحیحہ و جماع جیسا اس حدیث سے ظاہر ہے - حتیٰ کہ ہندستان جیسے ملک میں جہاں کہا جاتا ہے کہ لڑکی گیارہ برس میں بالغ ہوجاتی ہے ایسی لڑکی سے جماع تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۶ (ضمن ۵) کا جرم قرار دیا گیا ہے یعنی بلوغ کی عمر ۱۲ برس سے کم قرار نہیں دی - اور اسلام میں تو نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک

Marfat.com

عورت بالغ نہ ہو کیونکہ ایجاب وقبول کے لئے عقل رشید کو پہنچنا شرط ہے۔ عرب میں آج ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں ہندستان سے زیادہ بلوغ کی عمر ہوتی ہے کیونکہ عرب کی آب وہوا گرم وخشک ہے جو عورت کے بلوغ کے لئے زیا عمر چاہتی ہے اور میرا اپنا ذاتی مشاہدہ ہے کہ عرب میں نو برس کا بچہ اسقدر کمسن ہوتا ہے کہ اس کے بلوغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر یہ راوی کا وہم نہیں ہے تو کیا ہم اس حدیث کو صحیح مان لیں۔ حاشا۔ یا تو راوی ستہ تسعہ کے ساتھ عشرہ کا لفظ ملانا بھول گیا ہے یا اسکا قول بالکل ناقابل اعتبار ہے اور اسکا مقصد ایک ایسے فعل کو سنت رسول بتانا ہے جو شرعاً۔ عرفاً ہر طرح مذموم وناروا ہے۔ اسکی تردید کئی طرح سے ہوسکتی ہے۔

اوّل۔ حضرت اسمار حضرت عائشہ کی بڑی بہن تھیں جو حضرت زبیر کی بیوی تھیں اور ان دونوں کی عمروں میں دس سال کا تفاوت تھا (دیکھو اکمال فی اسمار الرجال) حضرت اسمار کا انتقال ۷۳ھ میں خلافت عبدالملک میں ہوا تھا۔ اُسوقت اُنکی عمر سو سے متجاوز ہوچکی تھی خود اُن کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر کا سن اُن کی وفات کے وقت ۷۸ برس کا تھا۔ اور وہ حضرت اسمار سے قبل قتل ہوئے تھے۔ حضرت اسمار کے ایک دوسرے لڑکے عبدالرحمٰن بن زبیر تھے جو آنحضرت کے سامنے جوانی کو پہنچ گئے تھے اور ایک مطلقہ عورت سے انھوں نے نکاح بھی کیا تھا۔ اور یہ ہی وہ عورت تھی جس نے اپنے ان شوہر کی شکایت آنحضرت سے کرتے ہوئے اُن کو کپڑے کے کھونٹ سے مشابہت دی تھی۔ جس میں ایک لطیف اشارہ انکی ناقابلیت نکاح کا تھا۔ اگر حضرت اسمار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک جوان بیٹے کی ماں ہوچکی تھیں اور ہجرت کے سال اُن کا دوسرا لڑکا پیدا ہوا جو حضرت عبداللہ بن زبیر تھے تو یہ صحیح ہے کہ اُن کی عمر ۷۳ھ ہجری میں سو سے متجاوز ہوچکی تھی۔ اسلئے ہجرت کے سال انکی عمر ۲۶ یا ۲۷ سال سے کم نہ تھی اور حضرت عائشہ کا سن ہجرت کے وقت ۱۶ سال کا تھا۔

دوم۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر فتوحات شام کے ایام میں مسلمانوں کے لشکر کے قائد اعظم تھے وہ حضرت عائشہ سے چھوٹے تھے اور اس قدر چھوٹے تھے کہ حضرت عائشہ اُن کو وضو کرنے کا طریقہ بتایا کرتی تھیں۔ اگر حضرت عائشہ کا سن ہجرت میں ۹ سال کا رکھا جاوے تو اس حساب سے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا فتوحات شام (۱۲ھ) میں مسلمانوں کی قیادت کرنا نہایت کمسنی میں پایا جاتا ہے جو محال ہے۔

سوم۔ یہ ثابت ہے کہ واقعہ جنگ جمل میں حضرت عائشہ گھر چھوڑ کر بصرے گئیں اور شرکت کی۔ امہات المومنین کو گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت تھی بجز اس کے کہ وہ اتنی بوڑھی ہوچکی ہوں جبکہ اُن کو پردہ کی حاجت باقی نہ رہے اگر حضرت عائشہ کی مفروضہ عمر تسلیم کی جائے تو واقعہ جمل میں اُن کا بڑھاپا اچھی طرح سے نہ آیا تھا اور اسوقت وہ قرآن کی اس اجازت میں نہیں آسکتی تھیں اور بعید ہے کہ حضرت عائشہ قرآن کے حکم سے انحراف کرتیں۔

چہارم۔ روایت شاذ ہے یعنی صرف حضرت عائشہ کا اپنا قول ہے۔ جبکہ صحابہ میں سے صرف حضرت جابر کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا اور حدیث میں مشہور لوگوں کی عمروں اور وفات میں اس قدر متضاد روایتیں ہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صحیح طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس سن میں آپ نے ہجرت کی۔ اور کس سن میں وفات پائی یا آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کا کس سن میں نکاح ہوا۔ یا کس سن میں انتقال ہوا۔ حضرت عائشہ کا خود اپنی عمر نہایت کم ظاہر کرنا۔ اس کو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نسوانی فطرت ہے۔

(۴) شیطان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و منہ میں جگہ کرتا ہے۔

(۱) رسول اللہ صلعم کے پاس جبرئیل آئے اور آپ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ انھوں نے آپ کو پکڑا اور پچھاڑا اور دل کو چیر کر نکالا۔ پھر اُس میں سے ایک پھٹکی جُدا کر ڈالی اور کہا کہ اتنا حصہ شیطان کا تھا۔ [illegible] پھر اس کو دھویا سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے۔ پھر جوڑا اس کو اور اپنی جگہ میں رکھا اور لڑکے دوڑتے ہوئے اپنی ماں کے پاس آئے اور کہا کہ محمد مار ڈالے گئے۔ یہ سنکر لوگ دوڑے۔ دیکھا تو آپ کا رنگ بدل گیا تھا۔ [illegible] کہا میں نے اس سیون کا نشان آپ کے سینے پر دیکھا ہے۔

(۲) تلک الغرانیق العلیٰ کی تفسیر و شان نزول (زیادہ وضاحت اور تردید کے لئے دیکھو سیرۃ نبوی جلد اوّل علامہ شبلی صفحہ ۲۴۲)

(۵) رسول اللہ صلعم (نعوذ باللہ) مکر و خدع سے اپنے مخالفین کو قتل کرا دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کون مارتا ہے کعب بن الاشرف کو۔ بیشک اس نے ستایا [illegible] تو محمد بن مسلمہ نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسکو قتل کر ڈالوں۔ آپ نے فرمایا [illegible] کہا تو اجازت دیجئے مجھ کو کہنے کی۔ آپ نے فرمایا کہہ۔ پھر محمد بن مسلمہ کعب کے پاس آئے [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بیان کیا اور کہا اس شخص نے صدقہ لینے کا قصد کیا ہے اور ہم کو تکلیف میں ڈالا ہے جب کعب نے سنا تو کہنے لگا ابھی اور قسم خدا کی تم کو تکلیف ہوگی۔ محمد بن مسلمہ نے کہا اب تو ہم اس کے ساتھ شریک ہوگئے اور اب اسکا چھوڑ دینا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے۔ جب تک ہم اس کا انجام بھی نہ دیکھ لیں کہ کیا ہوتا ہے محمد بن مسلمہ نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ کو قرض دو۔ کعب نے کہا اچھا تم کیا چیز گروی کرو گے محمد بن مسلمہ نے کہا تم کیا چاہتے ہو کعب نے کہا تم اپنی عورت گروی کرو۔ محمد بن مسلمہ نے کہا تم تو عرب میں سب سے زیادہ خوبصورت ہو ہم اپنی عورتیں تمھارے پاس کیونکر گروی کردیں۔ البتہ ہم اپنے ہتھیار تمھارے پاس گروی رکھیں گے۔ کعب نے کہا اچھا پھر محمد بن مسلمہ نے اس سے وعدہ کیا کہ میں حارث کو اور ابو عبس کو [illegible] کو لے کر آؤں گا [illegible] سب لوگ آئے اور اس کو رات کو بلایا۔ وہ اترا عورت کے ساتھ [illegible] روایت میں ہے کہ اس کی عورت نے کہا

آواز تو خونی آواز معلوم ہوتی ہے۔ کعب نے کہا واہ یہ تو میرے بھائی محمد بن مسلمہ اور میرے دودھ بھائی ابو نائلہ ہیں اور مرد کا کام یہ ہے کہ اگر رات کو زخم مارنے کے لئے بھی اسکو بھی بلاویں تو چلا آوے۔ محمد نے کہا کہ جب کعب آ تو میں اپنا ہاتھ اُس کے سر کی طرف بڑھاؤنگا اور جب اچھی طرح سے اس کے سر کو تھام لوں تو تم اس کا کا تمام کر دینا۔ پھر کعب اُترا چادر کو بغل میں لئے ہوئے۔ ان لوگوں نے کہا کیسی عمدہ خوشبو ہے جو تم سے آرہی ہے۔ کعب نے کہا میرے پاس فلانی عورت ہے وہ عرب کے سب عورتوں میں زیادہ معطر رہتی ہے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا اگر اجازت دو تو میں تمھارا سر سونگھوں۔ کعب نے کہا اچھا۔ محمد نے اس کا سر سونگھا۔ پھر کہا اجازت دو تو پھر سونگھوں اور زور سے اسکا سر تھاما اور یاروں سے کہا تو انھوں نے اسکا کام تمام کر دیا۔"

یہ روایت مسلم و بخاری میں متن میں یکساں ہے مگر اسناد میں مختلف اور دراصل یہ جناب واقدی کی مفصّل روایت کا خلاصہ ہے۔ جس کو اوّل بخاری نے لیا اور اسکو لفظ بہ لفظ مسلم نے نقل کیا۔ واقدی کی روایت اُنکی کتاب کے کئی صفحوں میں ہے۔ بخاری و مسلم نے صرف غیر ضروری واقعات کو حذف کر دیا ہے۔ مثلاً آنحضرت کا مسجد کے دروازہ پر محمد بن مسلمہ کا منتظر کھڑے رہنا۔ محمد بن مسلمہ اور اُن کے ساتھیوں کا ہنگامہ و شور و شغب میں فرار کرنا۔ آنحضرت کا اُن کو مسجد میں چھپانا۔ پھر قتل کی مشہری کرانا اور یہودیوں پر خوف غالب ہونا وغیرہ۔ لہذا روایت کی تنقید میں ہم کو واقدی کی مفصل روایت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

میرے نزدیک رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک پر یہ ایک بدترین اور مکروہ اتہام راوی نے لگایا ہے۔ یقیناً رسول اللہ صلعم نہ اس قتل کے محرک تھے اور نہ آپ کو اس واقعہ قتل کا کوئی علم تھا۔ کعب کو اس کے کسی دشمن نے بوجہ عناد ذاتی چپکے سے قتل کر دیا ہوگا۔ اور چونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بغض رکھتا تھا دشمنان نبوت نے اس کے قتل کی تہمت آپکے سر لگا دی۔

اوّل سوال تو یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ کون صاحب تھے۔ اگر یہ صحابی تھے اور یقیناً جیسا روایت سے ظاہر ہے صحابی ہیں تو خود اُنکی روایت ہم تک براہ راست بغیر ایک دوسرے صحابی کی سند کے کیوں نہیں پہنچی۔ کیوں حضرت جابرؓ[1] سے یہ روایت

---

[1] حضرت جابر سے سریہ بطن بواط کی روایت بھی منسوب ہے۔ جس میں خود رواتیوں میں اس درجہ تضاد ہے کہ سارا واقعہ مشتبہ ہو جاتا ہے بلکہ اس میں عنبر یا دھیل کا جو ذکر ہے۔ وہ بھی بداہتاً صحیح نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مغازیات کی روایت میں اس قدر غلط اور خلاف قیاس باتیں حضرت جابر کی طرف کیوں منسوب ہیں۔ واضح ہو کہ سریہ بطن بواط کے اس عجیب واقعہ کو واقدی نے بھی روایت نہیں کیا۔

مشہور لیکن غلط روایت جو زنادقہ نے عترت رسول کے لئے وضع کی تھی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم میں ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر اسکو پکڑے رہوگے تو گمراہ نہ ہوگے یعنی قرآن اور اپنی عترت جس میں سے ایک دوسرے سے عظیم المرتبہ ہے (نعوذ باللہ) اسکے بھی راوی جابر ہیں حالانکہ اس حدیث کے ماننے کے بعد اسلام کے بجائے نفس کو تقویت ہوتی ہے۔ جو زنادقہ کا خاص حربہ تھا کہ وہ اسکی آڑ میں عرب اور اسلام کا قلع قمع چاہتے تھے۔

بیان کرائی گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ محمد بن مسلمہ کا انتقال جابر سے پہلے ہو چکا تھا تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ خود واقدی کی روایت سے یہ پایا جاتا ہے کہ مروان کے زمانے تک محمد بن مسلمہ موجود تھے اور جب کعب بن الاشرف کا قصہ مروان کے سامنے بیان کیا گیا تو ایک قریظی نے کہا کہ کعب بن الاشرف مکر و خدع سے قتل کئے گئے تھے تو محمد بن مسلمہ نے بگڑ کہا کہ کیا تیرے نزدیک محمد صلعم غادر ہیں۔ پھر انھوں نے مروان سے کہا کہ آج سے میں تیرے ساتھ ایک چھت کے نیچے جمع نہ ہونگا اور قریظی سے کہا کہ اب تو اپنی خیر منا۔ میں تجھے بغیر قتل کئے ہوئے نہ چھوڑونگا۔ یہانتک کہ ایک روز کسی کے جنازے پر محمد بن مسلمہ اور اس سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ محمد بن مسلمہ نے کفن سے لکڑیاں نکال کر باوجود لوگوں کے روکنے کے قریظی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کعب بن الاشرف کو قتل کیا تھا اسوقت انکی عمر کیا تھی۔ اگر وہ جوان تھے اور جیسا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوان تھے تو آیا محمد بن مسلمہ پیدائشی مسلمان تھے یا خود ایمان لائے تھے۔ بہرصورت اُن کا حضرت کا ہمنام ہونا عجیب معنی رکھتا ہے کیونکہ عرب میں آنحضرت کے پہلے محمد کسی کا نام نہیں رکھا گیا اور جب تک آنحضرت نے اجازت نہیں دیدی عرصے تک فرط ادب سے آنحضرت کے نام پر نام رکھنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ جیسا اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہم میں سے ایک شخص کے لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے اس کا نام محمد رکھا۔ اس کی قوم نے کہا ہم تجھے یہ نام نہیں رکھنے دینگے۔ تو رسول اللہ صلعم کا نام رکھتا ہے۔ پھر وہ شخص اپنے بچے کو اپنی پیٹھ پر لاد کر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ میرا یہ لڑکا پیدا ہوا ہے میں نے اس کا نام محمد رکھا ہے میری قوم کے لوگ کہتے ہیں ہم تجھے نہیں چھوڑنے کے تو رسول اللہ صلعم کا نام رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اچھا میرا نام رکھو۔ میری کنیت نہ رکھو۔ کیونکہ میں قاسم ہوں۔ تقسیم کرتا ہوں جو کچھ ملتا ہے۔

پھر اس روایت کی سند کا یہ حال ہے کہ

واقدی نے عبدالحمید بن جعفر سے سنا انھوں نے یزید بن رومان سے انھوں نے زہری سے انھوں نے کعب بن مالک و ابراہیم بن جعفر سے انھوں نے جابر بن عبداللہ سے۔

مسلم نے اسحٰق بن ابراہیم الحنظلی سے انھوں نے زہری سے انھوں نے ابن عیینہ سے انھوں نے سفیان سے انھوں نے عمرو سے انھوں نے جابر سے۔

بخاری۔ علی بن عبداللہ سے انھوں نے سفیان سے۔ انھوں نے عمرو سے۔

یعنی باوجودیکہ تینوں کے متن میں ایک حرف کا فرق نہیں ہے۔ اسناد میں محققین نے اس درجہ اختلاف کیا ہے کہ اس میں شک ہے کہ اس روایت کو واقعی کس نے کس سے سنا۔ بخاری نے تو سب سے زیادہ غضب کیا ہے کہ علی بن عبداللہ کو سفیان سے ملا دیا۔ اس کو حدیث میں تدلیس کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ابراہیم بن جعفر کعب

واقدی کی روایتوں کے اصل ہیں اور اُنکی طرح ناقابل اعتبار۔ مسلم نے اسی واسطے زہری سے آگے اُنکی سند بدل
اور بخاری نے تو زہری سے لیکر ابوسفیان تک سب کو اُڑا دیا۔ میرے خیال میں اس تدلیس سے بہتر تو یہ ہوتا
وہ روایت میں اسکا حوالہ دیتے کہ انھوں نے کس کی کتاب سے نقل کیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے پر اُن کی حدیثوں
وقعت کیا رہ جاتی۔

درائتاً یہ روایت اسلئے ناقابل اعتبار ہے کہ کعب بن الاشرف کا واقعہ قتل بدر کے بعد پیش آیا۔ یا بقول
شبلی ۳ھ شوال میں۔ کعب بن الاشرف قبیلہ بنی نضیر کا سردار تھا۔ قبیلہ بنی نضیر سے آپ کی کوئی اسوقت مخالف
نہ تھی۔ اُن کے عہد و پیمان کی شکستگی کا واقعہ جس میں ابتدا بنی نضیر کی طرف سے ہوئی تھی جنگ احد کے بعد کا
ہے۔ جبکہ انھوں نے دو مسلمانوں کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ اور جب آنحضرت اُن کے پاس خوں بہا لینے
گئے تو اُنھوں نے آپ کو بھی دھوکے سے قتل کرنے کی سازش کی۔ اس کے بعد وہ لوگ جلاوطن کئے گئے۔ اگر
کعب بن الاشرف کا واقعہ جنگ بدر کے بعد کا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کعب بن الاشرف کے قتل کے بعد بنی نضیر
آپ سے عہد و پیمان شکست کیوں نہ کر لیا اور کیوں نہ انکی ساری جماعت جو اسوقت میں مسلمانوں سے زیادہ باقوت
واثر تھے۔ مخالفت پر کمربستہ ہو گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ کے خوف سے لرزہ براندام تھے تو آنحضرت نے کعب
بن الاشرف کو اس دھوکے سے قتل کرانے میں کیا مصلحت دیکھی۔ مسلمانوں سے انکی دشمنی عیاں تھی۔ آپ ایسے طاغوت
اور فتنہ پرداز شخص کو تادیباً اور قصاصاً برسرعام گرفتار کرا کے قتل کرا سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ قلعہ بند تھا اور
مسلمانوں کی مسلح جماعت اس کو گرفتار نہ کر سکتی تھی تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ بقول واقدی وہ تو تنہا مکہ گیا تھا
کہ قریش کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے۔ اگر آنحضرت اسوقت باقوت نہ تھے اور اپنی مخالفت خواہ نخواہ کسی جماعت
سے اسوقت نہ کرانا چاہتے تھے تو واقدی کی ساری روایت کس قدر مہمل ہو جاتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ
آنحضرت نے قتل کعب بن الاشرف کی تشہیر کرائی اور تمام یہودیوں پر آپ کا خوف غالب ہو گیا۔

مورخین میں سے یعقوبی نے اس معارضہ کو تسلیم کرتے ہوئے گو کہ واقعہ سے انکار نہیں کیا۔ اس کو تاریخ واقعہ
سے انکار ہے اور اسکا قیاس ہے کہ کعب بن الاشرف جنگ احد کے بعد اسوقت قتل کیا گیا۔ جب آنحضرت نے
بنی نضیر پر حملہ کیا۔ اسوقت تو بالکل اس مکر و خدع کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسواسطے کہ جنگ احد کے بعد آپ نے
سارے بنی نضیر کو بیک بینی و دو گوش نکال باہر کیا۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
بنی نضیر کے قبیلے کے پاس اُن کی عہد شکنی کی شکایت کرنے گئے اور دو مسلمانوں کا خون بہا لینے کے لئے مدعی ہوئے
تو بنی نضیر کے کسی شخص نے اُٹھ کر یہ جواب نہ دیا کہ عہد شکنی کا اقدام تو آپ کی طرف سے ہوا ہے کہ آپ نے ہمارے
سردار کو دھوکے سے قتل کرا دیا۔ نہ آنحضرت نے اپنی بریت میں یہ جواب دیا کہ اس نے مسلمانوں کے خلاف

جماعت قریش سے ساز باز کی تھی۔ میرے نزدیک آنحضرت پر اگر یہ اتہام یہودی لگاتے تو کوئی وجہ شکایت نہ تھی۔ شکایت تو یہ ہے کہ اس مکر و خدع کا الزام ہم مسلمان لگا رہے ہیں صرف اس لئے کہ یا تو یہ مسلمان در پردہ زندیق تھے یا خلفائے جابرہ بلکہ علماء و رؤسا و والیان ملک اپنے اپنے مخالفین کو دھوکے و فریب سے قتل کروانے کے لئے ایک سند چاہتے تھے اور اس حدیث نے مسلمانوں میں ہمیشہ بزدلی۔ مکر و دغا سے اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کی مذموم رسم ڈالی۔

(ب) آنحضرت سخت عذاب و بیدردی سے اسیروں سے انتقام لیتے تھے۔

اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں میں کثرت جنگ و فتوحات و خونریزی سے یہ ذہنیت پیدا ہو گئی تھی کہ کسی شخص کے شرف و بزرگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حد درجہ جنگجو۔ سنگدل و شہوت ران ہو یعنی کہ وہ نہ صرف [illegible] بلکہ بزورِ دشمنوں کی کثیر تعداد کو خاک میں ملا دے اور اُن کی عورتوں کو تصرف میں لاوے۔ اسی ذہنیت میں بہت سی حدیثیں وضع کی گئی ہیں۔ چونکہ اس قسم کی حدیثیں ایک خاص ماحول و زمانہ اور ذہنیت میں وضع ہوئی تھیں اس وقت ان پر خوب واہ واہ ہوئی مگر جب وہ زمانہ اور ذہنیت بدلی تو وہ حدیثیں بجائے آنحضرت صلعم کی بزرگی قائم کرنے کے اُن پر اتہام کی صورتوں میں مبدل ہو گئیں۔ یہودیوں نے بھی اپنے مشاہیر کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد۔ حضرت سلیمان و حضرت یوشع اسی رنگ میں دکھلائے گئے۔ جب یہودی مسکنت کا زمانہ آیا اور وہ بجائے حاکم کے محکوم ہوئے تو انبیاء بھی مسکینی اور ناتوانی کے رنگ میں دکھلائے جانے لگے اور یہی اُن کا شرف ہو گیا۔ جیسے حضرت مسیح و یحییٰ۔ حضرت دانیال۔ یہی سلوک ہندوؤں نے رام اور کرشن کے ساتھ اور یونانیوں نے سکندر اور ہرقل کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں پر تاتار کا غلبہ ہوا تو [illegible] صوفیائے زہد و نفس کشی کا تھا۔ اور اسی رنگ میں بہت جلد آنحضرت اور آپ کے اصحاب [illegible] خوش قسمتی سے اس قسم کا مواد یا تو مغازیات میں تھا یا [illegible] ملفوظات [illegible] تک خالی تھیں۔ مگر ان میں بھی ایک روایت نہایت اضطراب پیدا کر دینے والی ہے اور وہ [illegible] جوانس سے یوں مرقوم ہے۔

"ترجمہ: کہ کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آئے۔ اُن کو مدینے کی ہوا موافق نہ آئی آپ نے فرمایا کہ کاش تم ہمارے اونٹوں میں چلے جاؤ۔ اور اُن کا دودھ پیو اور موت پیو انھوں نے ایسا ہی کیا اور جب وہ اچھے ہوگئے تو مرتد ہو گئے اور آنحضرت کے چرواہے کو مار ڈالا اور اونٹوں کو بھی ہنکا لے گئے۔ آپ نے اُن کو پکڑنے کے لئے آدمیوں کو بھیجا۔ وہ لائے گئے۔ آپ نے اُن کے پاؤں اور ہاتھ کاٹے۔ اور اُن کی آنکھوں میں سلائی پھیری۔ اور اُنکو جلتی زمین پر تڑپنے ڈال دیا۔"

Marfat.com

ہمارے دشمنوں نے اس حدیث سے جو فائدہ اسلام کے خلاف تبلیغ کرنے کا اٹھایا ہے اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر زویمر ایک امریکی مشنری نے اپنی کسی کتاب میں بخاری کی اس روایت کو ہو بہو فوٹو سے چھاپا ہے لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ ہمارے واقدی علیہ الرحمہ نے جو اس قسم کی روایتوں کے سب سے زیادہ مشتاق ہیں اس کا مطلق ذکر ہی نہیں کیا حالانکہ اگر یہ غزوہ نہ تھا تو ایک سرایا سے کم بھی نہ تھا۔ پھر بخاری و مسلم نے جنکی روایتیں مغازیات میں بالعموم واقدی کی مرہون منت ہیں۔ اس کو کہاں سے پایا۔ اُن کی حدیث کے ایک جملے سے سارا راز کھل جاتا ہے۔ بخاری و مسلم کے زمانے میں زنادقہ کے متواتر فتن سے عالم اسلام پیچ و تاب کھا رہا تھا اور مرتدین و معاندین اسلام کے ہولناک ہلاکت کے لئے فتاویٰ مشتہر ہو رہے تھے۔ جن کو نہایت بیدردی اور عذاب سے قتل کیا جائے تاکہ دوسرے دشمنان دین کو عبرت ہو۔ اسلئے اس روایت کے ساتھ ایک جملہ اور آتا ہے ولم یحسمهم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المحاربین من اھل الردۃ حتی ھلکوا تو اصل مدعا تو یہ تھا کہ منفع و باک نرمی کے قتال میں اگر کوئی زندیق ہاتھ آجائے تو اسکو ویسے ہی وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا جائے جیسے وہ مسلمانوں کو قتل کرتے تھے اور اسلئے ضرورت ہوئی کہ ایسے نامشروع فعل کے لئے سنت رسول پیدا کی جائے اوّل تو یہ روایت انس کے سوا کسی صحابی سے مروی نہیں۔ انس آنحضرت کے نوعمر خادم تھے جو واقعہ کے وقت سن شعور کو نہ پہنچے تھے۔ اس کی سند میں بھی اختلاف ہے۔ ایک سند میں ہے اوزاعی نے یحییٰ سے سنا۔ یحییٰ نے ابو قلابہ سے۔ دوسری میں ہے موسیٰ بن اسمٰعیل نے وہیب سے اُنھوں نے ایوب سے اُنھوں نے ابو قلابہ سے۔ اسناد میں ہی اختلاف نہیں بلکہ متن میں بھی اختلاف ہے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ اُن کو پیاسا تڑپا کر مارا گیا۔ کہیں کہا گیا کہ اُن کی آنکھوں میں کانٹے چبھوئے گئے اور وہ اس شخص کے ہاتھوں سے جو جانوروں کو بھی تڑپا کر ہلاک کرنا روا نہیں رکھتا۔ اور جس نے اپنے چچا حمزہ کے مثلہ کا بدلہ نہیں لیا۔ جو بقول قرآن مجسم رافت و رحمت ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جاں نثاران نبی نے ان چوروں کا تعاقب کیا ہو اور اُن کو تعاقب میں ادھ موا کر کے چھوڑ کر چلے آئے ہوں مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ آنحضرت کے سامنے لائے جاتے اور اس طرح اُن کو عذاب دیا جاتا۔ اس روایت کے ایک جملے سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ اسکا واضع خود بھی کوئی زندیق تھا۔ زندیق کی ابتک یہ عادت ہے کہ مسلمانوں کو ناپاک و غلیظ اشیاء دھوکے سے کھلا دیتا ہے تو فلیشربوا من ابوالھا والبانھا اگر عرب کا کوئی خاص اصطلاح نہیں ہے جس کے معنی سے اونٹوں کی عام خدمت کرنا مراد ہو جس کا مجھے علم نہیں تو کیسے مسلمانوں کو جانوروں کا پیشاب پینے کا حکم رسول اللہ صلعم نے دیا۔ استغفراللہ۔ یہ چیز تو یقیناً مردار اور خون سے زیادہ حرام ناپاک و نجس ہے۔

Marfat.com

## ششم۔ وہ روایتیں جو ایمان کیلئے سم قاتل ہیں۔

۱۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت کے روز حجر اسود اس صورت میں اٹھایا جائے گا کہ اسکے دو آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے گفتگو کریگا۔ جن لوگوں نے اسکو چھوکر (بوسہ دیا ہے) ان پر سچی گواہی دے گا۔ (مشکوٰۃ)

۲۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا حجر اسود جنت سے جب نازل ہوا تو دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسکو سیاہ کر دیا۔ (مشکوٰۃ)

(اگر اس چیز کا نام انصاب پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ ویعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم

حضرت ابراہیم نے جب خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو آپ نے اسکا سات بار طواف کیا تاکہ تعمیر میں خامی نہ ہو۔ اس کے کونے میں ایک کالا پتھر جو عرب کے پہاڑوں میں کثرت سے ملتے ہیں اٹھا کر رکھ دیا۔ جاہلیت کے لوگوں نے اسکو چومنا چاٹنا شروع کر دیا اور حدیث کے بدولت اسلام میں یہ رخنہ اب تک بند نہ ہوا۔ حضرت عمر نے ایک بار کہا بھی اے حجر اسود میں جانتا ہوں کہ تو پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر میں رسول اللہ کو تجھے استلام کرتے بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو تجھ کو اکھاڑ کر پھینکدیتا۔ مگر نبی کا استلام کیا اس سے زیادہ چیز تھی کہ ایک قدیم یادگار ابراہیمی کو اس نظر سے ہاتھ لگاتے جیسا ہم قدیم اور نادر اشیاء کو عجائب خانے میں شوق اور استعجاب سے چھوتے ہیں)

۳۔ حضرت انس کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر لگ جانے میں اور ڈنک کی بیماری میں اور نملہ کی بیماری میں منتر پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ (مشکوٰۃ)

۴۔ عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے ہم ایام جاہلیت میں منتر پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا اسکو پڑھ کر سناؤ۔ اگر اس میں کوئی کفر و شرک کا جملہ نہ ہو تو جائز ہے۔

(کیا معنی ہوئے۔ اسلام کی اوہام پرستی کی طرف رجعت قہقری)

۵۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں رسول اللہ صلعم کے پاس اعرابیوں نے آکر قیامت کا سال دریافت کیا۔ آنحضرت نے ان میں سے ایک چھوٹے لڑکے کی طرف دیکھ کر فرمایا اگر یہ زندہ رہا تو بوڑھا نہ ہوسکے گا کہ قیامت آجائیگی۔ (مشکوٰۃ)

واضع نے ایک جنبش زبان میں ایمان پر تین کاری ضرب لگادی۔ اول تو قرآن شریف کی رو سے کہ قیامت کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کہ ایسا کبھی واقعہ نہ ہوا۔ تیسرے

آنحضرت کی توہین کہ وہ کہتے کچھ تھے اور اسکے معنی کچھ اور لیتے تھے۔

۶۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں ایک روز صبح کو رسول اللہ صلعم سیاہ نقشی کملی اوڑھے ہوئے برآمد ہوئے اتنے میں حسین بن علی آگئے۔ حضور نے انکو کملی میں داخل کر لیا پھر حسین آئے تو انکو بھی داخل کر لیا پھر حضرت فاطمہ تشریف لائیں تو انکو بھی داخل کر لیا۔ پھر علی تشریف لائے تو ان کو داخل کر لیا اسکے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی

لیذھب عنکم الرجس اہل البیت ویطہرکم تطہیرا۔

(واضع حدیث جو بلا شک و شبہ زندیق و شیعہ ہے (بفحوائے ضرب المثل انظر ما قال ولا تنظر من قال) گویا قرآن کی اس آیت کو کبھی سیاق عبارت کے ساتھ پڑھا ہی نہ تھا۔ فہمائش ازواج مطہرات کو ہو رہی ہے اور وہی اسکے مخاطب ہیں۔ عرب کی اصطلاح میں اہل بیت کا مفہوم بھی بیویوں سے ہے مگر یہ کم بخت اپنی بے عقلی اور بے علمی کے گدھے لگا رہا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اپنے نمدہ جہالت میں ہمارے محدثین کو بھی لپیٹ دیا ہے۔ اسطرح حدیث ثقلین اور آیات المودۃ فی القربیٰ کی دو روایتیں اور ہیں اور جو ہمارے صحاح ستہ میں منقول ہیں۔ خدا بھلا کرے مولنا عبدالشکور کا کہ انھوں نے اسکی تاویل کر کے اسکی اصلی حقیقت دکھلادی ورنہ ہمارا تو ایمان ہی ختم ہو جاتا۔ بھلا جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ قرآن اور اولاد رسول ہم پلہ ہیں۔ پھر کیسے اولاد رسول کہ ان میں بعض سرے سے مسلمان ہی نہیں اور اکثر شورہ پشتی۔ مفسدہ پردازی اور بدمعاشی و نفاق میں سب سے پیش پیش ہیں یا رسول اللہ صلعم نعوذ باللہ عام آدمیوں سے بھی گئے گذرے ہوئے کہ اپنی تبلیغ کی مزدوری مانگیں وہ کب مسلمان کہا جا سکتا ہے۔

تعجب تو ان جامعین حدیث پر ہے کہ انکی آنکھوں پر کیسا سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا کہ انکو حدیثوں میں شیعوں کا ہاتھ کبھی نظر نہ آیا۔ حالانکہ ہمارے زمانے کا ایک معمولی عالم دین جسکے مقالات بطور تتمہ اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں اسکی قلعی کھول دیتا ہے۔ پس جائے تعجب کیا کہ اسلام کے یہ بے وقوف دوست کبھی زمانے کے ہاتھوں آرام نہ اٹھا سکے۔ اہل شام نے نسائی کو اس حدیث کے نقل کرنے پر قتل کر دیا کہ جو علی سے جنگ کرے وہ مجھ سے جنگ کرے اور جو اسکا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو اسکا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔ یا احمد بن حنبل کو اہل بغداد نے ایسی ایذا دی کہ وہ جاں بر نہ ہو سکے کہ انکے ہاتھوں روایات حدیث کا فتنہ ایسا بڑھا کہ صالحین کے ہوش جاتے رہے اور طرح طرح کے اباطیل و اوہام و بداعتقادی نے انکے بعد رواج پایا بلکہ بعض تو ایمان ہی کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

حدیثوں نے بنی قریظہ کے قتل عام کا الزام بھی رسول اللہ صلعم کے سر تھوپ دیا ہے۔ چونکہ مجھے اسکی تردید میں کوئی تاریخی مواد نہ مل سکا۔ میں نے جبراً قہراً اسکو قبول کر لیا۔ لیکن دل میں ہمیشہ کھٹک باقی رہی کہ پھر آنحضرت خدا سے

"رؤف" کا خطاب پانے کے مستحق کیسے ہوگئے۔ دشمن نے جب سپر ڈال دی اور اپنے کو فاتح کے رحم کے حوالے کر دیا تو انکو چن چن کر قتل کرا دینا اور انکی عورتوں کو غصب کر لینا شرعاً جائز سہی مگر رافتہ۔ مروتاً و شرافتہ تو جائز نہیں ہو سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اسکی تردید کا مواد اس سے زیادہ مل گیا جتنا قتل کعب بن الاشرف کا تھا اور وہ یہ ہے کہ بنی قریظہ کے یہودی ابتک یمن میں آباد ہیں اور اب وہاں سے ہجرت کر کے فلسطین چلے گئے ہیں۔ انکا بیان ہے کہ ان کے آبا و اجداد مدینے سے جلا وطن کر دیے گئے تھے۔ واقدی نے بھی اسکا اقرار کیا ہے کہ قریظی لوگ انکے زمانے میں موجود تھے پھر یہ کہاں سے آگئے اگر انکے تمام آدمی قتل کر دیے گئے تھے کیا قریظی ان عورتوں سے پیدا ہوگئے جو عربوں کے حرم میں داخل ہو چکی تھیں۔ مگر عرب میں تو باپ سے نسب چلتا ہے نہ کہ ماں سے۔

یقیناً حدیث میں بہت سی اچھی باتیں بھی ہیں مگر ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ ہم کسی حدیث کے متعلق یہ قطعی حکم نہیں لگا سکتے کہ اسکا سلسلہ روایت واقعی آنحضرت تک پہونچتا بھی ہے۔ پس کیا ہمارے لئے یہ زیبا ہے کہ ہم ان چند باتوں کی خاطر اس اعتراف پر بھی مجبور ہوں کہ رسول اللہ نعوذ باللہ۔ کاذب۔ جاہل۔ احمق۔ ظالم۔ جنگ جو۔ شہوت راں تھے یا اپنے نواسوں۔ بیٹی اور داماد پر ایسے دلدادہ کہ گویا خدا اور امت سے انکا کوئی بڑا تعلق نہ تھا۔ کیا ابو ہریرہ نے خصوصاً جو اسرائیلیات و خرافات آنحضرت کی طرف منسوب کی ہیں۔ انکو سنکر ایک یہودی یا ایک اہل عقل و علم انکا مضحکہ نہ اڑائے گا اور انکی نسبت بدگمان نہ ہو جائے گا۔ ہم میں سے کس کو یہ سن کر اضطراب نہ ہوگا کہ رسول اللہ صلعم اپنے دشمنوں سے بے پناہ بدلہ لیتے تھے۔ انکی آنکھوں میں کانٹے چبھواتے تھے انکے سینوں پر چقماق سے آگ جھڑواتے تھے اور وہ بھی اسلام کی خاطر نہیں بلکہ مال کی خاطر جو وہ لوٹ سے گئے یا چھپا دیا۔ اگر تم اسکو مان سکتے ہو تو یہ حدیثیں تم کو مبارک ہوں میں تو ان پر تبرا بھیج چکا ہوں اور قرآن کے متعلق سیدنا عمر کا ہم قول ہوں۔ وحسبنا کتاب اللہ پھر میں پوچھتا ہوں کہ ان اچھی باتوں میں سے کون سی اچھی باتیں ہیں جو قرآن سے بہتر ہیں یا قرآن میں نہیں۔ کیا نعوذ باللہ وہ قرآن کا تکملہ ہیں اور بغیر انکے قرآن ناقص ہے فاین تذھبون۔

میں تو قرآن کی معمولی باتوں میں قیامت تک کے راز سربستہ کا انکشاف پاتا ہوں۔ اور اسی واسطے میرے ایمان کو اسکے وحی الٰہی ہونے پر قوی کر دیتی ہے۔ تم نے وجعلوا القرآن عضین تو اکثر پڑھا ہوگا۔ اور ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا کو بھی یہ بھی پڑھا ہوگا واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا اور اليوم اکملت لکم دینکم اور لیظھرہ علی الدین کلہ کو بھی۔ اگر تم غور کرو کہ ان سیدھے سادے الفاظ میں کیا جادو بھرا ہے تو تم اس نتیجے پر پہونچوگے کہ سوائے ایک علام الغیوب کے کسی کو ایسا کہنے کی مجال نہیں وجعلوا القرآن عضین پر میں نے غور کیا۔ میری سمجھ میں اگر کچھ آیا تو میں نے اسکو اپنے لقب دکو بالتی پہ منسوب کیا ہے اس سے وضاعین حدیث مراد ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث پرستی میں کسی متاخرین یا متقدمین سے کم نہیں۔ ازالۃ

الخفار میں بے ساختہ کہہ گئے" خدا انکے (یعنی شیعہ وضاعین حدیث کے) عضو عضو کو جدا کرے۔ جیسا اُنھوں نے قرآ
کے ٹکڑے ٹکڑے کردئے ہیں" قرآن سے مہجوری آنحضرت کے زمانے اور قرن اولے میں نہ تھی۔ شروع ضرور ہوئی و
قرآن کیوں ایسی بات کہتا مگر جب قرآن کو جزودان میں تہ کرکے رکھ دیا گیا اور اسکی جگہ وضع روایات کا فتن
برپا ہوا اور دین کا وہی دستور العمل قرار پایا۔ واعتصموبحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا یہ اس ہونے والی بات کا
دے رہی ہے کہ ایک زمانہ مسلمانوں پر ایسا آئے گا کہ خدا کی رسّی کی گرفت انکے ہاتھوں میں انھیں روایتوں
بدولت ایسی ڈھیلی پڑجائے گی کہ انکی غرقابی اسکا لازمی نتیجہ ہوگا۔ تکمیل دین و اظہار دین کا وعدہ قرآن نے کیوں
وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کے اندر ایک خفیہ جماعت ایسی پیدا ہوگی جو روایتوں سے تفرقہ سازی کریگی۔ مجددیت
مہدویت۔ امامیت۔ احباریت ورہبانیت اسلامی جسم کا حصہ لگائینگے۔ اسلام جغرافی حدود میں بند کیا جائیگا اور
نام دارالاسلام رکھا جائیگا اور آخر میں اسلام کے لئے یہ آرزو ہوگی کہ وہ معاذ اللہ سانپ کیطرح مدینہ میں سمٹ
رہ جائے گا۔ زنادیق کی ان آرزؤں کو پامال اور افسردہ کرنے کے لئے۔ پھران روایتوں کو جو قرآن کی اسطرح مخالف
ہوں ہم انکو سینے سے لگائے رہیں صرف اسلئے کہ تمھارے آباواجداد ایسا کرتے چلے آئے جو یا تو جاہل ولایعقل تھے
دشمنان دین کی سازشوں کا پتہ نہ لگا سکے کیا تمھارے ہوش وخرد کے لئے زیبا ہے۔

کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر حدیث کا رواج نہ ہوتا تو مسلمانوں میں مذہب کی کلید برداری ایک مخصوص جماعت
میں نہ رہ جاتی اور نہ وہ اسکے اجارہ دار سمجھے جاتے۔ جنکی وجہ سے اسلام ویسا ہی سرنگوں ہوا جیسا مذہب یہود و
نصاریٰ فقیہہ و فریسی یا احبار و رہبان کے ہاتھوں سے۔ حدیث وضع کرنے کے بعد اسکو ایک علم وہنر کے درجہ
پہونچا دینا۔ ظاہر ہے کہ ہرکس وناکس اسکا حامل نہیں ہوسکتا اور جب مذہب روایات حدیث پر قائم ہوچکا تو یہ کیسے
ہوسکتا ہے کہ اسکے نبض شناس ہماری رہبری نہ کریں اور ہم ان کی پرستش نہ کریں جیسا یہود و نصاریٰ نے کی واتخ
احبارھم من دون اللہ ارباباً۔ اگر اب بھی تم کو شک ہے کہ یہ ٹوپی تم پر اور تمھارے مولوی پر ٹھیک نہیں اترتی
تو اپنے چاروں طرف نظر دوڑاؤ ملت اسلام کو شبلی کے اس شعر کا مصداق پاؤگے ؎

آپ جائیں گے جہاں قوم کو پائیں گے ذلیل　　اس میں تخصیص عراق وعرب وشام نہیں

# دجّال

خروج دجال کی تحقیق دو فائدے سے خالی نہیں۔ اول تو مذہبی حیثیت سے کہ عقائد اسلامی میں اسکا کیا درجہ ہے۔ دوسرے تاریخی حیثیت سے کہ یہ روایت عقائد اسلامی میں کیونکر داخل ہوئی۔ اسلئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے ان اسلامی روایتوں پر نظر ڈال لی جائے جو دجال کے متعلق صحاح میں ہیں۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ ان کا سررشتہ کہاں ہے۔

حسب ذیل حدیثیں جو مسلم سے ماخوذ ہیں۔ ان میں دجال کی تین جدا صورتیں ہیں۔

اوّل۔ ابن صیاد والی حدیثیں۔

دوم۔ وہ حدیثیں جن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ دجال کانا ہوگا اسکی پیشانی پر ک۔ ف۔ ر لکھا ہوگا۔ قریب قیامت نکل کر فتنے پھیلائے گا۔ اور پھر حضرت مسیح کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔

سوم۔ تمیم الداری کا دجال جو سمندر کے ایک جزیرے میں مقید ہے۔

## ابن صیاد والی حدیثیں

۱۔ حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چند لوگوں کے ساتھ ابن صیاد کے پاس گئے۔ پھر اسکو دیکھا لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے بنی مغالہ کے قلعے کے پاس۔ ان دنوں ابن صیاد جوانی کے قریب تھا۔ اسکو خبر ہوئی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ پھر آپ نے اس سے پوچھا کہ تو گواہی دیتا ہے اس بات کی کہ میں اللہ تعالے کا رسول ہوں۔ ابن صیاد نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو اس بات کی کہ میں اللہ تعالی کا رسول ہوں۔ رسول اللہ صلعم نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا (اس سے درخواست نہ کی مسلمان ہونے کی اور اسکو اسکے حال پر[۵] چھوڑ دیا)۔

---

[۵] میرے پاس مسلم کا مصری اڈیشن ہے جو مطبوعہ بولاق ہے اور جس کے حاشیہ پر نووی کی شرح کا خلاصہ ہے۔ اس میں فرفضہ کے ض پر نقطہ لگا ہوا ہے۔ اگر یہ ض ہے تو اس کے معنی وہی ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں۔ لیکن اگر ص سے پڑھا جائے تو اسکے معنی ہونگے آپ نے اس کو لات ماری۔ دیکھو ایک نقطے سے معنی میں کیا ردو بدل ہوگیا۔

Marfat.com

اور فرمایا میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر رسول اللہ صلعم نے اس سے پوچھا۔ تجھے کیا دکھائی دیتا ہے
بولا میرے پاس کبھی سچا آتا ہے اور کبھی جھوٹا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تیرا کام گڑبڑ ہو گیا ہے پھر آپ نے فرمایا میں
تجھ سے پوچھنے کے لئے ایک بات دل میں چھپائی ہے۔ ابن صیاد نے کہا وہ شے ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا
ہو تو اپنی قدر سے کہاں بڑھ سکتا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا مجھے چھوڑیے۔ یا رسول اللہ میں اسکی گردن مارتا ہوں۔ رسول
اللہ صلعم نے فرمایا اگر یہ وہی ہے تو تو اس کو نہ مار سکے گا اور جو وہ نہیں تو تجھے اسکا مارنا بہتر نہیں۔ سالم بن عبداللہ
نے کہا میں نے ابن عمر سے سنا ہے۔ اسکے بعد رسول اللہ صلعم اور ابی بن کعب اس باغ میں گئے جہاں ابن صیاد
جب آپ باغ میں گھسے تو کھجور کے درختوں کی آڑ میں چھپنے لگے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ ابن صیاد کو دھوکا دیں اور
اس کی کچھ بات سنیں اس سے پہلے کہ ابن صیاد آپ کو دیکھے۔ تو رسول اللہ صلعم نے ابن صیاد کو دیکھا وہ لیٹا ہوا
تھا۔ ایک بچھونے پر ایک کملی اوڑھے ہوئے کچھ گنگنا رہا تھا۔ اس کی ماں نے رسول اللہ صلعم کو دیکھ لیا۔ اور آپ
چھپ رہے تھے کھجوروں کے درختوں کی آڑ میں۔ اس نے ابن صیاد کو پکارا اور صاف صاف نام لیا ابن صیاد کو
محمد آن پہنچے۔ ابن صیاد اُٹھ کھڑا ہوا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کاش تو اس کو ایسا ہی رہنے دے۔ پھر رسول اللہ
صلعم لوگوں میں کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جیسی اُس کے لائق ہے۔ پھر دجال کا ذکر کیا اور فرمایا میں
تم کو اس سے ڈراتا ہوں اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو۔ یہاں تک کہ حضرت
نوح نے بھی اپنی قوم کو اس سے ڈرایا۔ لیکن میں تم کو ایسی بات بتلائے دیتا ہوں جو کسی نے اپنی قوم کو نہیں بتائی
جان لو کہ وہ کانا ہوگا اور ہمارا اللہ عزوجل کانا نہیں ہے (ابن عمر)

۲۔ اوپر والی روایت عبداللہ ابن مسعود سے بھی مروی ہے اور اسقدر اور ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں
نے تیرے لئے ایک بات چھپائی ہے اور آپ نے اس آیت کا تصور کیا یوم تاتی السماء بدخان۔ ابن صیاد
بولا "دخ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چل مردود تو اپنے اندازے کبھی نہ بڑھ سکے گا۔

۳۔ نافع سے روایت ہے۔ ابن عمر ابن صیاد سے مدینہ کی کسی راہ میں ملے۔ تو ابن عمر نے کوئی ایسی بات
کہی جس سے ابن صیاد کو غصہ آگیا اور وہ اتنا پھولا کہ راہ بند ہو گئی۔ ابن عمر ام المومنین حفصہ کے پاس گئے
اُن کو یہ خبر پہونچ چکی تھی۔ اُنھوں نے کہا اللہ تجھ پر رحم کرے تو نے ابن صیاد کو کیوں چھیڑا۔ تجھ کو معلوم نہیں
رسول اللہ صلعم نے فرمایا دجال جب نکلے گا تو اسی وجہ سے کہ غصہ ہوگا۔

۴۔ ابن عمر کہتے تھے میں ابن صیاد سے دو بار ملا۔ ایک بار ملا تو میں نے لوگوں سے کہا تم کہتے تھے کہ ابن
صیاد دجال ہے۔ اُنھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا خدا کی قسم تم نے مجھے جھوٹا کیا آج کے دن۔ وہ کہتے ہیں
پھر ابن صیاد نے ہم سے باتیں کی۔ پھر میں جُدا ہوا ابن صیاد سے اور دوبارہ ملا۔ تو اُس کی آنکھ پھولی ہوئی تھی

Marfat.com

نے کہا یہ تیری آنکھ کا کیا حال ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ بولا مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا تیرے سر میں آنکھ ہے اور تجھے معلوم نہیں۔ وہ بولا اگر خدا چاہے تو میری اس لکڑی میں آنکھ پیدا کردے۔ پھر ایسی آواز نکالی جیسے گدھا زور سے آواز دیتا ہے۔ نافع نے کہا عبداللہ بن عمر آئے۔ اور اُم المومنین حفصہ کے پاس گئے۔ اُن سے یہ حال بیان کیا۔ اُنھوں نے کہا تیرا کیا کام تھا ابن صیاد سے۔ تو نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اوّل جو چیز دجال کو بھیجیگی لوگوں پر وہ اُسکا غصہ ہوگا۔

۵۔ سعید الخدری نے کہا۔ میں ابن صیاد کے ساتھ گیا مکّہ تک۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں دجّال ہوں۔ اور کیا تم نے رسول اللہ صلعم سے نہیں سنا کہ دجّال کے اولاد نہ ہوگی اور میرے تو اولاد ہے اور آپ فرماتے تھے کہ وہ مکہ اور مدینہ میں نہ آویگا میں نے کہا ہاں سُنا ہے۔ ابن صیاد نے کہا میں تو مدینہ میں پیدا ہوا اور اب تو مکہ جاتا ہوں اور کیا رسول اللہ صلعم نے نہیں فرمایا کہ دجال یہودی ہوگا اور میں تو مسلمان ہوں۔ اور آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے مکّہ کو حرام کیا ہے دجال پر اور میں نے تو حج کیا ہے۔ ابوسعید نے کہا پھر اخیر میں ابن صیاد کہنے لگا قسم خدا کی میں جانتا ہوں دجال کہاں پیدا ہوگا۔ اور اب وہ کہاں ہے۔ ابوسعید نے کہا تو مجھ کو اُس نے شبہ میں ڈال دیا۔

۶۔ میں نے جابر بن عبداللہ کو دیکھا قسم کھاتے ہوئے کہ ابن صیاد دجال ہے۔ میں نے کہا تم اللہ کی قسم کھاتے ہو اس امر پر اُنھوں نے کہا میں نے حضرت عمر کو دیکھا وہ قسم کھاتے تھے اس امر پر رسول اللہ صلعم کے سامنے۔ آپ نے اس سے انکار نہ کیا۔ (محمد بن المنکدر)

## (۲) مسیح الدجّال والی حدیثیں

۱۔ ابن شہاب زہری نے کہا مجھ سے عمر بن ثابت انصاری نے بیان کیا۔ اُن سے رسول اللہ صلعم کے بعض اصحاب نے بیان کیا کہ جس روز رسول اللہ صلعم نے لوگوں کو دجال سے ڈرایا یہ بھی فرمایا کہ اُسکی دونوں آنکھوں کے بیچ میں کافر لکھا ہوگا۔ وہ شخص جو ان کاموں کو بُرا جانے گا اس کو ہر ایک مومن پڑھ لیگا۔ اور آپ نے فرمایا تم یہ جان رکھو کہ تم میں سے کوئی اپنے رب کو نہ دیکھے گا جب تک مر نہ لیگا۔

۲۔ رسول اللہ صلعم نے دجال کا ذکر کیا لوگوں میں اور فرمایا اللہ تعالیٰ کانا نہیں۔ اور خبردار ہو دجال مسیح کی داہنی آنکھ کانی ہے۔ گویا اس کی آنکھ ہے ایک انگور پھولا ہوا۔

۳۔ یعقوب بن عاصم سے روایت ہے۔ میں نے عبداللہ بن عمر سے سنا اُن کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا یہ حدیث کیا ہے جو تم بیان کرتے ہو کہ قیامت اتنی مدت میں ہوگی۔ اُنھوں نے کہا سبحان اللہ یا لا الٰہ الا اللہ اور

Marfat.com

کوئی کلمہ مانند اس کے۔ پھر کہا کہ میرا قصد ہے کہ اب کسی سے کوئی حدیث بیان نہ کرونگا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تم تھوڑے ز
کے بعد ایک حادثہ دیکھوگے جو گھر کو جلا دیگا اور وہ ہوگا اور ضرور ہوگا پھر کہا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دجال میری اُمت
میں نکلے گا اور چالیس تک رہیگا۔ میں نہیں جانتا کہ چالیس دن فرمایا یا چالیس مہینے یا چالیس سال۔ پھر اللہ تعالیٰ حض
عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا۔ اُن کی شکل عروہ بن مسعود کی سی ہے۔ وہ دجال کو ڈھونڈھیں گے اور اُس کو مارینگے۔ پھر سات
سال تک لوگ ایسے رہینگے کہ دو شخصوں میں کوئی دشمنی نہ ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک ٹھنڈی ہوا بھیجے گا شام کی طرف سے
تو زمین پر کوئی ایسا شخص نہ رہیگا۔ جس کے دل میں رتی برابر ایمان یا بھلائی ہو مگر یہ ہوا اسکی جان لیگی یہاں تک کہ
اگر تم میں سے کوئی شخص پہاڑ کے کلیجے میں گھس جاویگا تو یہاں بھی یہ ہوا پہنچکر اس کی جان لے گی[1]۔ عبداللہ نے کہا۔ میں
رسول اللہ صلعم سے سنا آپ فرماتے تھے پھر میرے بعد لوگ دنیا میں رہجاوینگے جلد باز چڑیوں کیطرح یا بے عقل درندوں
طرح اُن کے اخلاق ہونگے۔ نہ وہ اچھی بات کو اچھا کہہ سکیں گے نہ بری بات کو بُرا۔ پھر شیطان اُن کے پاس ایک
سوانگ بناکر آویگا اور کہیگا تم شرم نہیں کرتے۔ وہ کہیں گے پھر تو کیا حکم دیتا ہے۔ شیطان کہیگا بُت پرستی کرو۔ وہ بُت
پوجیں گے۔ اُن کی روزی کشادہ ہوگی اور مزے سے زندگی بسر کریں گے۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ اسکو کوئی نہ سُنے گا
ایک طرف سے گردن جھکا دیگا اور دوسری طرف سے اُٹھا لیگا۔ اور سب سے پہلے صور کو وہ سنے گا جو اپنے اونٹوں کے
حوض پر پانی پلاتا ہوگا۔ وہ بیہوش ہوجاویگا اور دوسرے لوگ بھی بیہوش ہوجاوینگے۔ پھر اللہ تعالےٰ پانی برسا دیگا

---

[1] غالباً یہ اُس وبا کی طرف اشارہ ہے جو شام میں پھیلی تھی اور جو تاریخ میں طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے بڑے بڑے صحابہ کبار
مسلمانوں کی کثیر جماعت اس طاعون کی نذر ہوگئی۔ یہ فتوحات شام کے آخر زمانے کا واقعہ ہے۔ مگر راوی نے واقعات میں مقدم و مؤخر کا خیال
نہیں کیا۔ مشکوٰۃ میں عوف ابن مالک سے جو روایت ہے۔ اس میں البتہ معاویہ کے زمانے تک کے واقعات جبکہ قسطنطنیہ کا پہلی بار محاصرہ ہوا تھا
اور رومیوں سے صلح ہوگئی تھی۔ ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی بقول اُن بزرگ کے آنحضرت نے حسب ذیل علامتوں کو قیامت سے پہلے بتا
یعنی اوّل وفات آنحضرت۔ دوسرے فتح بیت المقدس، تیسرے ایسی وبا کا پھیلنا جیسے بکریوں میں پھیل جایا کرتی ہے۔ پھر مال کا اس کثرت سے
کہ کوئی سو دینار کی پرواہ نہ کریگا۔ پھر ایسے فتنہ کا واقع ہونا جس سے عرب کا کوئی مکان خالی نہ ہوگا۔ پھر رومیوں میں صلح ہونا اور جس دن وہ
کے ساتھ آئیں گے اسوقت دس نشان اُن کے ساتھ ہونگے اور ہر نشان کے نیچے بارہ بارہ ہزار آدمی ہوں گے ان محدثین کے عقل پر تعجب
ہے کہ باوجودیکہ واقعات جو اپنے سامنے گذر رہے تھے راوی بیان کر رہا ہے۔ مگر اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف منسوب
کرنے کیلئے بیچین تھے حالانکہ کبھی کسی محدث نے کسی ایسے واقعہ کو دریافت نہ کیا جو راوی کے مرنے کے بعد مسلمانوں میں برپا ہونے والے تھے۔ حدیثوں
راوی قسطنطنیہ کی فتح پر بہت کچھ دجال کے خروج کا دارومدار رکھ رہے تھے۔ قسطنطنیہ کب کا فتح ہوچکا مگر دجال اس حیلے کے ساتھ ابتک نہ
ان روایتوں کے پڑھنے کے بعد کسی حدیث کے نسبت یہ گمان باقی نہیں رہ سکتا کہ اسکی سند رسول اللہ صلعم تک پہونچتی ہے۔

نطفہ کیطرح ہوگا۔ اس سے لوگوں کے بدن اُگ آوینگے۔ پھر صور پھونکا جاویگا تو سب لوگ کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔ پھر پکارا جاویگا اے لوگو اپنے مالک کے پاس آؤ۔ اُن سے سوال ہوگا۔ پھر کہا جاویگا اے لشکر نکالو دوزخ کے لئے پوچھا جاویگا کتنے لوگ۔ حکم ہوگا ہر ہزار میں نو سو ننانوے دوزخ کے لئے۔ پوچھا جاویگا کتنے لوگ۔ حکم ہوگا ہر ہزار میں نو سو ننانوے دوزخ کے لئے۔ آپ نے فرمایا وہی وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا اور یہ ہی وہ دن ہوگا جب پنڈلی کھلے گی (سختی سے)

۴۔ یسیر بن جابر سے روایت ہے۔ ایک بار کوفے میں لال آندھی آئی۔ ایک شخص آیا جسکا تکیہ کلام یہی تھا اے عبداللہ ابن مسعود قیامت آئی۔ یہ سُن کر عبداللہ ابن مسعود بیٹھ گئے وہ پہلے تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے کہا قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ترکہ نہ بٹے گا اور لوٹ سے خوشی نہ ہوگی۔ پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا شام کے ملک کیطرف اور کہا دشمن جمع ہونگے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے اور مسلمان بھی اُن سے لڑنے کے لئے جمع ہوں گے میں نے کہا دشمن سے تمھاری مراد نصاریٰ ہے۔ انھوں نے کہا ہاں اور اسوقت سخت لڑائی قائم۔ (اس کے بعد ابن مسعود نے اس لڑائی کی کیفیت بیان کی جو چار روز تک قائم رہے گی۔) پھر مسلمان اسی آفت میں ہونگے کہ ایک اور بڑی آفت کی خبر سنیں گے۔ ایک آواز اُنکو آویگی کہ دجال اُن کے پیچھے اُن کے بال بچوں میں آگیا۔ یہ سنتے ہوئے مال غنیمت جو اُن کے ہاتھوں میں ہوگا اُس کو چھوڑ کر روانہ ہونگے اور دس سواروں کو طلایہ کے طور پر روانہ کرینگے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں ان سواروں اور اُن کے باپوں کے نام جانتا ہوں۔ اور ان کے گھوڑوں کے رنگ جانتا ہوں وہ ساری زمین کے بہتر سوار ہونگے اس دن یا بہتر سواروں میں سے ہونگے۔

۵۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دجال کے ساتھ ہوجاویں گے اصفہان کے ستر ہزار یہودی چادریں اوڑھے ہوئے (انس)

۶۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں دجال نہ جاوے سوائے مکہ اور مدینہ کے۔ مدینے کے راستے پر فرشتے صف باندھے کھڑے ہونگے اور پہرہ دینگے پھر دجال اور سرزمین میں اُتریگا اور مدینہ تین بار کانپے گا اور جو اس میں کافر یا منافق ہوگا وہ دجال کے پاس چلا جائے گا۔

۷۔ ابوہریرہ نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت قائم نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ روم کے نصاریٰ کا لشکر اعماق یا دابق میں نہ اُترے۔ پھر مدینے میں ایک لشکر نکلے گا اُن کی طرف جو تمام زمین والوں میں بہتر ہوگا۔ پھر جب صف باندھیں گے دونوں لشکر تو نصاریٰ کہیں گے تم الگ ہو جاؤ اُن لوگوں سے جنھوں نے ہمارے جورو لڑکے پکڑے اور لونڈی غلام بنائے۔ ہم ان سے لڑینگے۔ مسلمان کہیں گے۔ نہیں خدا کی قسم ہم کبھی اپنے بھائیوں سے الگ نہ ہونگے۔ پھر لڑائی ہوگی تو مسلمانوں کا ایک تہائی لشکر بھاگ جاویگا۔ اُن کی توبہ اللہ کبھی قبول نہ کرے گا۔ اور

Marfat.com

تہائی لشکر مارا جاویگا۔ وہ سب شہیدوں میں افضل ہوں گے۔ اور اُنھوں نے اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں میں لٹکا دیا ہوگا۔ اتنے میں شیطان آواز دے گا کہ دجال تمھارے بچوں میں تمھارے پیچھے اُترا۔ مسلمان وہاں سے نکلیں گے۔ حالانکہ یہ خبر جھوٹ ہوگی۔ جب شام کے ملک میں پہونچیں گے تب دجال نکلے گا اسوقت مسلمان لڑائی کی صفیں باندھے ہونگے۔ نماز کی تیاری ہوگی۔ اُسوقت حضرت عیسیٰ اتریں گے اور مسلمانوں کے امام بنکر نماز پڑھاویں گے۔ پھر جب اللہ کا دشمن دجال حضرت عیسیٰ کو دیکھے گا تو اسطرح گھل جاویگا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔ اور جو عیسےٰ یوں ہی چھوڑ دیں گے تو وہ خود بخود گل کر ہلاک ہو جاویگا۔ لیکن اللہ تعالےٰ اس کو قتل کریگا حضرت عیسےٰ کے ہاتھوں پر اور اسکا خون دکھلائیگا عیسیٰ علیہ السلام کی برچھی میں۔

۸۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی یہانتک کہ جھوٹے دجال پیدا ہونگے ہر ایک یہ کہے گا۔ میں اللہ کا رسول ہوں (ابوہریرہ)

۹۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دجال بائیں آنکھ کا کانا ہوگا۔ گھنے بالوں والا۔ اس کے ساتھ باغ ہوگا اور آگ ہوگی۔ سو اس کی آگ تو باغ ہے اور اسکا باغ آگ ہے۔ اس کے ساتھ دو نہریں ہونگی بہتی ہوئی۔ ایک تو دیکھنے میں سفید پانی معلوم ہوتی ہوگی اور دوسری دیکھنے میں بھڑکتی آگ۔

۱۰۔ رسول اللہ صلعم نے دجال کا ایک دن صبح کو ذکر کیا تو کبھی نہ تو اس کو بڑھایا اور نہ اس کو گھٹایا۔ اور میں نے ہجرت نہ کی مگر اسوجہ سے کہ جب کوئی ہم میں ہجرت کر لیتا تو رسول اللہ صلعم سے کچھ نہ پوچھتا۔ جب ہم پھر آپ کے پاس شام کو گئے تو آپ نے ہمارے چہروں پر اس کا اثر معلوم کیا۔ آپ نے فرمایا تمھارا کیا حال ہے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ آپ نے دجال کا ذکر کیا۔ اُس کو نہ گھٹایا نہ بڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم کو گمان ہوگیا کہ دجال اس جھنڈ کھجور کے موجود ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا مجھ کو دجال کے سوا اور باتوں کا خوف تم پر زیادہ ہے۔ اگر دجال نکلا میں تم لوگوں میں موجود ہوا تو تم سے پہلے میں اس کو الزام دوں گا اور تم کو اس کے شر سے بچاؤں گا۔ اور اگر وہ اور میں تم لوگوں میں موجود نہ ہوا تو ہر مرد مسلمان اپنی طرف سے اس کو الزام دیگا۔ اور حق تعالیٰ میرا خلیفہ اور نگہبان ہر مسلمان پر۔ البتہ دجال نوجوان گھونگریالوں والا ہے اُس کی داہنی آنکھ میں ٹینٹ ہے۔ گویا میں اس کی مشابہت دیتا ہوں عبدالعزیٰ بن قطن کے ساتھ۔ سو جو شخص تم میں سے دجال کو پاوے اس کو چاہیئے کہ سورۂ کہف کے سرے کی آیتیں اس پر پڑھے۔ مقرر وہ نکلے گا عراق کے درمیان کی راہ سے تو خرابی ڈالے گا داہنے اور فساد اٹھائیگا بائیں۔ اے خدا کے بندے ایمان پر قائم رہنا۔ اصحاب بولے یا رسول اللہ وہ زمین پر کتنی مدت رہیگا۔ فرمایا چالیس دن تک۔ ایک دن اُن کا ایک سال کے برابر ہوگا۔ اور دوسرا ایک مہینے کے اور تیسرا ایک ہفتہ کے اور باقی دن جیسے تمھارے دن ہیں۔ اصحاب نے کہا یا رسول اللہ جو دن سال بھر کے برابر ہوگا اسدن ہم کو ایک ہی دن کی نماز کفایت کریگی۔ آپ نے فرمایا نہیں

Marfat.com

انداذہ کرلینا اس دن میں بقدر اس کے۔ اصحاب نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ دجّال کی چال زمین میں کیونکر ہوگی۔ آپ نے فرمایا جیسے وہ مینہ جس کو ہوا پیچھے سے اُڑاتی ہے۔ سو وہ ایک قوم کے پاس آویگا تو اُن کو کفر کی طرف بلاویگا وہ اس پر ایمان لاوینگے اور کفر کی بات مانیں گے تو آسمان کو حکم کریگا وہ پانی برساویگا اور زمین کو حکم کریگا وہ اُن کے لئے گھاس اور اناج اُگاویگی تو شام کو مویشی آویں گے پہلے سے زیادہ اُن کے تھن بھرے ہونگے۔ پھر دجال دوسری قوم کے پاس آویگا۔ اُن کو بھی کفر کی طرف بلاویگا۔ لیکن وہ اس کی بات کو نہ مانیں گے تو اُن کی طرف سے ہٹ جاویگا اُن پر قحط سالی و خشک سالی ہوگی۔ اُن کے ہاتھوں میں اور اُن کے مالوں میں سے کچھ نہ رہیگا اور دجال ویران زمین پر نکلے گا تو اس سے کہیگا اے زمین اپنے خزانے نکال تو وہاں کے مال اور خزانے آکر اس کے پاس جمع ہوجاوینگے۔ جیسے شہد کی مکھیاں بڑی مکھیوں کے گرد ہجوم کرتی ہیں۔ پھر دجال ایک جوان مرد کو بلاویگا اور اُس کو تلوار سے ماریگا اور وہ ٹکڑے ہوکر گر پڑیگا۔ پھر اس کو زندہ کرکے پکاریگا۔ سو وہ جوان سامنے آویگا۔ اس کا چہرہ دمکتا اور ہنستا ہوا تو دجال اسی حال میں ہوگا کہ ناگاہ اللہ تعالیٰ ابن مریم کو بھیجے گا۔ حضرت عیسیٰ سفید منار پر اُترینگے دمشق کے شہر میں مشرق کی طرف زرد رنگ کا جوڑا پہنے ہوئے۔ اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوں پر رکھے ہوئے۔ جب حضرت عیسیٰ اپنا سر جھکادینگے تو پسینہ ٹپکے گا۔ اور جب اپنا سر اُٹھادینگے تو موتی کی طرح بوندیں بہیں گی۔ جس کافر کے پاس حضرت عیسیٰ اترینگے تو اُس کو اُن کے دم کی بھاپ لگے گی وہ مرجاویگا اور اُن کے دم کا اثر وہاں تک جویگا جہاں تک نظر پہنچے گی۔ پھر حضرت عیسیٰ دجال کو تلاش کرینگے۔ یہاں تک کہ اُس کو باب لُد پر پائیں گے۔ سو اس کو قتل کرینگے۔ پھر حضرت عیسیٰ اُن لوگوں کے پاس آوینگے جن کو خدا نے دجال سے بچایا۔ سو شفقت سے اُن کے منہوں کو نہلادینگے اور اُن کو خبر کردیں گے اُن درجوں کی جو بہشت میں اُنکے لئے رکھے گئے ہیں۔ وہ اسی حال میں ہونگے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ پر وحی بھیجے گا کہ میں نے اپنے ایسے بندے نکالے ہیں کہ کسی کو اُن سے لڑنے کی طاقت نہیں وغیرہ (روایت النواس بن سمعان الکلابی)

## (۳) تمیم الداری کا دجّال

عامر بن شرجیل سے روایت ہے۔ اُنھوں نے فاطمہ بنت قیس سے کہا جو ضحاک بن قیس کی بہن تھیں اور ان عورتوں میں سے تھیں جنھوں نے پہلے ہجرت کی تھی کہ مجھ سے بیان کرو ایک حدیث جو تم نے سنی ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور مت واسطہ کرنا اس میں کسی کا۔ وہ بولیں اگر تم چاہتے تو میں بیان کرونگی۔ اسکے بعد اُنھوں نے اپنی طلاق[1] اور عدت

---

[1] یہ وہی روایت ہے جس کو سنکر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ میں ایک عورت کی حکایت پر قرآن شریف کی آیت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

کا ذکر کیا) جب میری عدت گزر گئی تو میں نے پکارنے والے کی آواز سنی وہ پکارنے والا منادی تھا رسول اللہ صلعم کا۔ پکا
تھا نماز کے لئے جمع ہو جاویں۔ میں بھی مسجد کی طرف نکلی اور میں نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں اس صف
میں تھی جس میں عورتیں تھیں لوگوں کے پیچھے۔ جب آپ نے نماز پڑھ لی تو ممبر پر بیٹھے اور آپ ہنس رہے تھے۔ آپ
فرمایا ہر ایک آدمی اپنی نماز کی جگہ رہے۔ پھر فرمایا تم جانتے ہو میں نے تم کو کیوں اکٹھا کیا۔ وہ بولے اللہ اور اُ
رسول خوب جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا قسم خدا کی میں نے تم کو رغبت دلانے یا ڈرانے کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ
لئے جمع کیا ہے کہ تمیم الداری ایک نصرانی تھا۔ وہ آیا۔ اس نے بیعت کی اور مسلمان ہوا۔ اور مجھ سے ایک حدیث
بیان کی جو موافق پڑی اس حدیث کے جو میں تم سے بیان کرتا تھا دجال کے باب میں۔ اس نے بیان کیا کہ وہ شخص
(یعنی تمیم الداری) سوار ہوا سمندر کے جہاز میں تیس آدمیوں کے ساتھ جو لخم اور جذام کی قوم سے تھے۔ سو ان سے
ایک مہینے بھر لہر کھیلا کی سمندر میں۔ پھر وہ لوگ جا لگے سمندر میں ایک ٹاپو کی طرف سورج ڈوبتے وقت پھر وہ جہاز سے
کشتی میں بیٹھے۔ اور جزیرہ میں داخل ہوئے۔ وہاں ہم کو ایک جانور بھاری دم بہت بالوں والا ملا۔ اس کا آگا پیچھا
نہ ہوتا تھا بالوں کے ہجوم سے۔ لوگوں نے کہا اے کم بخت تو کیا چیز ہے۔ اُس نے کہا میں جاسوس ہوں۔ ہم نے
جاسوس کیا۔ اس نے کہا چلو اس مرد کے پاس جو دیر میں ہے کہ البتہ وہ تمھاری خبر کا مشتاق ہے۔ سو ہم تیری طر
دوڑتے ہوئے آئے اور ہم اس سے ڈرے کہ کہیں بھوت پریت نہ ہو۔ پھر اُس مرد نے کہا مجھ کو خبر دو بیابان سے
نخلستان سے۔ ہم نے کہا کونسا حال اس کا پوچھتا ہے۔ اس نے کہا میں اس کے نخلستان سے پوچھتا ہوں کہ پھل
ہم نے اس سے کہا کہ ہاں پھلتا ہے۔ اُس نے کہا کہ خبردار ہو کہ سو عنقریب ہے کہ وہ نہ پھلے گا۔ اُس نے کہا
مجھ کو بحر طبریہ سے۔ ہم نے کہا کونسا حال اس دریا کا پوچھتا ہے۔ وہ بولا اس میں پانی ہے۔ میں نے کہا اس میں
پانی ہے اُس نے کہا البتہ اس کا پانی عنقریب جاتا رہیگا۔ پھر اُس نے کہا خبر دو مجھ کو زغر کے چشمے سے۔ لوگوں نے
کیا حال اسکا پوچھتا ہے۔ اس نے کہا اس چشمے میں پانی ہے اور وہاں کے لوگ اس پانی سے کھیتی کرتے ہیں۔
اس سے کہا ہاں اس میں بہت پانی ہے اور وہاں کے لوگ کھیتی کرتے ہیں۔ اُس نے کہا خبر دو مجھ کو عرب کے
سے۔ اُنھوں نے کہا وہ مکہ سے نکلے اور مدینہ گئے۔ اُس نے کہا کیا عرب کے لوگ اُن سے لڑے۔ ہم نے کہا
اُس نے کہا خبردار ہو۔ یہ بات اُن کے حق میں بہتر ہے کہ پیغمبر کے تابعدار ہوں۔ اور البتہ تم سے میں اپنا حال کہوں
دجال ہوں یعنی مسیح الدجال یعنی دجال تمام زمین کا پھرنے والا۔ اور البتہ وہ زمانہ قریب ہے جب ہم کو اجازت
نکلنے کی۔ سو میں نکلوں گا اور سیر کروں گا اور کسی بستی کو نہ چھوڑوں گا۔ جہاں نہ جاؤں چالیس رات کے اندر۔ سوا
اور طیبہ کے۔ وہاں جانا مجھ پر حرام ہے یعنی منع ہے۔ جب میں چاہوں گا ان بستیوں میں سے کسی کے اندر جانا
آگے بڑھ آویگا فرشتہ اور اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوگی۔ وہ مجھ کو وہاں جانے سے روک دیگا۔ البتہ اُن

Marfat.com

کے پر فرشتے ہونگے جو اس کی چوکیداری کرینگے ۔ پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پشت خار سے ممبر کو ٹھونکا اور فرمایا یبہ یہ ہی ہے ۔ طیبہ یہ ہی ہے ۔ خبردار رہو ۔ بھلا میں تم کو اس حال کی خبر دے چکا ہوں ۔ اصحاب نے کہا ہاں حضرت ملی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ کو اچھی لگی تمیم کی بات جو موافق پڑی اس چیز کے جو میں تم کو دجال اور مدینہ اور مکہ کے مال سے کہا کرتا تھا ۔ خبردار رہو ۔ البتہ دریائے شام یا دریائے طبریہ وہ نہیں ہے بلکہ پورب کی طرف ہے وہ پورب ما طرف ہے ۔

---

تنقیح طلب امر یہ ہے کہ دجال کا ذکر قرآن شریف میں کیوں نہیں ہے ۔ جبکہ قرب قیامت کی نشانیوں میں یاجوج جوج اور دابۃ الارض کا ذکر ہے ۔ پھر جب قرآن اس دجال کے قصے سے خالی ہے ۔ تو رسول اللہ صلعم کو دجال کے صے وحی سے معلوم ہوئے یا نصاریٰ سے ۔ اسکا جواب تو محدثین دیں ۔ میرے نزدیک تو نہ آپ پر دجال کے قصے کی ۔ی نازل ہوئی اور نہ آپ نے کسی نصرانی کی صحبت میں بیٹھ کر دجال کے قصوں کو سنا اور نہ ہی دجال کا چرچا مکہ و مدینہ ں آنحضرت کی زندگی میں ہوا ۔ البتہ جب شام کے نصاریٰ کا بہت بڑا گروہ مسلمان ہوا ۔ تو انھوں نے اپنی پرانی .وایتوں کو بالکلیہ فراموش نہ کردیا ۔ بلکہ وہ اسکو اسلامی روایت بنا کر بیان کرنے لگے اور محدثین نے اُن کی روایتوں میں پھر ایسی دلچسپی پائی کہ اُنھوں نے اس پر سند لگا کر رسول اللہ صلعم تک پہنچا دی ۔ جب مسلمان شام سے ایران تک بڑ ذ وہاں بھی ایک فرقے کے لوگ پائے گئے جو مجوس و نصاریٰ کے عقائد کا ایک معجون مرکب تھا ۔ یعنی فرقہ ۔نویہ ۔ اور جیسا میں ابھی دکھلاؤں گا چونکہ دجال کے روایت کا سلسلہ نسب مجوس تک پہنچ چکنا ثابت ہے ۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں نو مسلم نصاریٰ اور مجوس کا سب سے محبوب مشغلہ دجال کی روایتیں تھیں ۔ دجال کی روایتیں صرف زبانی ہی بیان نہ کی جاتیں بلکہ اس زمانے میں دجال کے قصے حبشی و سریانی و ایرانی زبان سے عربی میں ترجمہ ہو کر بھی آ گئے تھے ۔ چنانچہ اس زمانے کی کتابیں دجال کے قصوں پر عربی میں حبشی و سریانی زبان سے ترجمہ کی ہوئیں دستیاب ہوئی ہیں جو اب برٹش میوزیم میں ہیں ۔

حدیثوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرب قیامت میں شیطان مجسم ہو کر ایک آخری لڑائی خدا سے لڑے گا اور خدا کچھ دنوں کے لئے میدان خالی کر دیگا کہ اس کے بندوں کو جس طرح چاہے عذاب دے اور بہکائے ۔ پھر آخر میں خدا کی فتح ہوگی اور اس کا قلع قمع ہوگا ۔

اب دیکھو یہ عقیدہ کس مذہب کا ہے ۔ یہود کا ؟ نہیں ۔ نصاریٰ کا ؟ نہیں ۔ بودھ کا ؟ نہیں ۔ اسلام کا ؟ نہیں ۔ مجوس کا ؟ ” ہاں “

Marfat.com

# قربِ قیامت میں خدائے خیر و شر کی جنگ

کتاب بنداہش میں جو مجوسیوں کی کتاب ہے اس میں یوں ذکر ہے کہ ابتدا میں نیکی و بدی کے دو مخالف خداؤں نے اپنی علٰحدہ علٰحدہ مخلوق بنائی۔ تین ہزار برس تک دونوں فریق میں کوئی کھٹ پٹ نہ ہوئی اور دونوں مخلوق علٰحدہ علٰحدہ دنیا میں پھیلتے گئے۔ اس کے بعد خدائے خیر و شر میں جھگڑا ہوا گو باہمی مصالحت و اقرار تھا کہ کم سے کم ۹ ہزار سال تک ایک دوسرے کی مخلوق سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے۔ مگر خدائے خیر نے (خلاف معاہدہ ایک منتر پڑھ کر بری ارواح اور اس کی مخلوق میں گڑبڑ ڈالدی اور تین ہزار سال تک یہ گڑبڑ اور رہی۔ جب تک خالق شر اور مخلوق شر آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر خالق خیر نے جھٹ پٹ ملا کر چاند۔ سورج اور زمین بنا کر اپنی پوزیشن مضبوط کرلی اور خدائے شر کو مقاومت مجہول پر اکتفا کرنا پڑا۔ قربِ قیامت میں خدائے شر یعنی انگرامینوش اپنی مخلوق کو لے کر خدائے خیر یعنی یزداں کا مقابلہ کریگا۔ ایک زمانے تک اہرمن یزداں پر قابو پاویگا مگر آخر میں فتح یزداں کی ہوگی اور اسکی مخلوق فنا ہوجاوے گی۔

## اس عقیدہ کا اثر یہود پر

اہل بابل کا یہی عقیدہ مجوس کی طرح دو خداؤں کا تھا۔ اور اُن کا بھی یہ خیال تھا کہ قربِ قیامت میں خدائے تاریکی جس کی شکل ایک اژدہے کی ہوگی وہ مردوک یعنی خدائے جان آفریں سے جنگ کریگا۔ جب بخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس کو تباہ کیا اور یہودیوں کو اسیر کرکے بابل لے گیا اور وہ اسوقت تک بیت المقدس واپس نہیں ہوئے جب تک کہ ملوک فارس نے بابل کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کرلیا۔ یہودیوں نے اسارت بابل کے زمانے میں اہل بابل و مجوس سے بہت سی روایتیں اخذ کیں۔ چنانچہ یہودیوں کی ان کتابوں میں جو مسیح سے چند صدی پہلے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے خیالات و عقیدے موجود ہیں۔ جو مجوس و اہل بابل کے تھے اور انھیں میں یعنی یزدان و اہرمن کی لڑائی کا تھا۔ چنانچہ یہودیوں کی مشہور اپاکریفہ جو عہد نامہ بطارقہ (Testament of Patriorch) کہلاتی ہے اس میں ہو بہو یہی خدا اور شیطان کے مقابلے کا قصہ پوری وضاحت سے دہرایا گیا ہے۔ اس میں اس شیطان کا نام بلیئل ہے۔ اپاکریفہ کی ایک اور کتاب معراج موسیٰ (Ascrenzi of Moses) میں ہے " پھر اس کے بعد خدا اپنے بندوں پر ظاہر ہوگا اور اس وقت شیطان کا بالکل خاتمہ ہوجائے گا۔

یہ فرض نہ کرنا چاہیئے کہ موجودہ عہد نامہ قدیم سے اپاکریفہ خارج ہے۔ نہیں درحقیقت یہ مسئلہ یہودیوں

Marfat.com

اور عیسائیوں میں ابتک طے نہیں ہوا کہ خود مجموعہ بائبل موجودہ میں دراصل توریت کا کیا حصہ ہے اور اپاکریفہ کیا ہے۔ وہ اس درجہ مخلوط ہیں۔ بین الدفتین بھی اور غیر الدفتین بھی کہ اُن کا علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً دانیال کی کتاب باوجودیکہ عہدنامہ قدیم میں شامل ہے اس کے لئے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسکا تعلق دانیال سے کچھ بھی نہیں بلکہ مکابیوں کے زمانے میں یہود کی تدلیس ہے۔ حتیٰ کہ زبور میں بھی بہت کچھ مواد اپاکریفہ سے آگئے ہیں۔ مثلاً زبور داؤد کے اٹھارہ باب کی چوتھی آیت میں ہے اور ہم کو بچا بلیعر کے دریاؤں سے یا حبال الموت سے۔ اگر بلیعر (Beliar) وہی ہے جو اپاکریفہ کا "بلیعل" ہے تو وہ خدائے اسفل السافلین یا شیطان ہے۔ جو الہامی خیال ہرگز نہیں بلکہ مشرکین بابل کا عقیدہ ہے۔

دانیال کی کتاب میں جابجا استعارہ کے ساتھ ایک عجیب مخلوق کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو ستایگی قیاس کیا گیا ہے کہ دشمنان خدا وہی لوگ ہیں جنھوں نے بنی اسرائیل کو ستایا تھا۔ اور چونکہ دانیال کی کتاب مکابیوں کے زمانہ میں لکھی گئی تھی اس لئے غالباً ان پراسرار ہستیوں سے مراد وہ قیاصرہ روم ہیں جنھوں نے یہودیوں کو ستایا تھا۔

## مسیحیت میں اعتقاد دجال

اس میں ذرا شک نہیں کہ یہودیت سے یہ خیالات مسیحیت میں آئے اور مکاشفہ یوحنا کے یہ الفاظ کہ "درندہ جو اسفل السافلین سے برآمد ہوتا ہے اور جس کے ساتھ بہت بڑی جماعت قوموں کی ہوگی اور یروشلیم کے دو نیک لوگوں کو شہید کریگا۔" اس میں وہی مکاشفہ دانیال کی صدائے بازگشت ہے۔ اگر اس درندہ سے یہ شیاطین کی دعوت پر سمندر سے نکلتا ہے سلطنت روما مراد لی جائے یا کوئی خاص رومی قیصر جو مسیحیت کا دشمن تھا تو وہ محض اصل عقیدے کے ضمن و ثبوت میں ہے ورنہ اصل عقیدہ وہی باقی رہتا ہے جو مجوس میں تھا۔ یعنی قرب قیامت میں انسان پر عذاب کرنے والا اور خدا سے لڑنے والا ایک شخص پیدا ہوگا۔

مسیحیت میں اس عقیدے کی پوری تشکیل سینٹ پال کے ہاتھوں سے ہوئی ہے اور اسکا نامہ بنام اہل تھسلونیا کا دوسرا باب پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ملعون موعود جو بلیعر کے نام سے موسوم ہوگا مخالف مسیح ہوگا۔ لوگوں کو بہکائیگا اور طرح طرح کے خرق عادات اس سے ظاہر ہوگا۔ وہ یہودی ہوگا اور یہود اسکی اطاعت کرینگے۔ یہ آخر میں مسیح کے ہاتھ سے فنا ہوگا۔ کتاب اشعیا کے باب ۱۱ آیت ۴ میں مسیح کی صفت یعنی کہ وہ اپنے منہ کی پھونک سے دشمنوں کو ہلاک کردیگا۔" وہ حضرت مسیح کا سب سے بڑا حربہ ہوگا۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ بیت المقدس پر قبضہ کریگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نامہ تھیسلونیا انجیل کا

Marfat.com

حصہ ہے اور اپاکریفہ نہیں ہے تو انجیل کے الہامی ہونے کا اعتراف مسلمانوں کو ہے۔ اسلئے کیوں نہ ہم ان دجال کے قصوں کو مانیں۔ مگر مسلمان جس انجیل کے قائل ہیں وہ یقیناً موجودہ انجیل نہیں ہے۔ کہیں کہیں اصل انجیل کے چند جملے ادھر اُدھر انبار الفاظ میں پڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ مگر مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح یہ کہنے کے قابل نہیں ہیں کہ انجیل کا کونسا حصہ الحاقی ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی انجیل عیسائیوں کے پاس تھی۔ جو اسوقت ہے اور قرآن نے جس انجیل کا ذکر کیا ہے وہ اسی انجیل کے متعلق ہے جو عیسائیوں کے پاس تھی۔ مگر اس میں سینٹ پال کے مکتوب شامل نہ تھے اور انجیل سے خارج سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عیسائیوں کی ایک بڑی جماعت خود سینٹ پال کو منافق یہودی سمجھتی رہی۔ مگر اس کا کیا جواب ہے کہ نائر سینٹ جیمس اور خود اناجیل اربعہ میں ہی اکثر جگہ اور خصوصاً مکاشفہ یوحنا میں متعدد جگہ ایسا ذکر ہے جو سینٹ پال کے قول کی اگر بالکل تائید نہیں کرتا تو مخالفِ مسیح کی ہستی کا ضرور اقرار کرتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم انجیل کے زیادہ حصّے کو الحاقی سمجھتے ہیں اور یہی رائے جرمنی کے ناقدین انجیل کی ہے۔ لہذا انجیل بھی توریت کی طرح الحاقی ہے اور جو واردات سینٹ پال نے اپنی قوم سے روایت کئے ہیں ان کا سلسلہ مجوس و اہل بابل سے مل جاتا ہے۔

## حدیث کے دجال اور سینٹ پال کے دجال میں مماثلت

مسیحیوں میں "بلیئر" دو صفات سے متصف ہے یعنی لوگوں کو عذاب دینے والا اور خوارق عادت دکھلا کر انکو گمراہ کرنے والا۔ چنانچہ "بلیر" سے وہ رومی قیاصر بھی مراد لئے گئے ہیں جنھوں نے عیسائیوں کو ستایا تھا۔ اور اس کے ساتھ ازمنہ وسطیٰ کی بعض پراسرار ہستیوں پر بھی دجال ہونے کا شبہ کیا گیا۔ چنانچہ مشہور جادوگر سائمن ماجوس (simon majus) کو دجال بتایا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح حدیثوں میں ابن صیاد کو دجال سمجھا گیا۔ اور دوسری طرف انکو ایک ہیبت ناک عذاب دہندہ کی شکل کا متصور کیا گیا جسکا یا تو ابھی تک انتظار ہے یا اسوقت میں ظاہر ہو چکا تھا۔ جب مسلمان دجال کی روایتوں میں پڑے ہوئے تھے۔

اسی طرح عیسائیوں میں متعدد دجال ہونگے چنانچہ لوتھر اور کالون روما کے پوپ کو ہمیشہ دجال سمجھتے رہے۔ ایسے ہی حدیث میں ہے کہ تقریباً تیس نقلی دجال آئیں گے تب اصلی دجال آئیگا۔ اور مسلمانوں نے بھی اپنے مخالف فرقے کے گروہ کو دجال بتایا ہے پھر جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے کہ دجال حضرت مسیح کی سانس سے فنا ہو جائے گا اسی طرح مسلمانوں کا خیال ہے۔ جسطرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ وہ یروشلیم کے پاس باب لد کے قریب مارا جائے گا ویسا ہی مسلمانوں کا خیال ہے۔ جس طرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ دجال کے پیرو یہودی ہونگے ویسا ہی مسلمانوں کا خیال ہے۔ جسطرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ دجال تمام دنیا میں گھوم کر لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے گا اور اسکے

Marfat.com

قبضہ قدرت میں بہشت و دوزخ ہونگے وہی خیال مسلمانوں کا ہے۔ ہاں مسلمانوں نے اس میں اتنی جدت اور کی ہے کہ اُنھوں نے نہر اور آگ اور باغات بہشت کو متحرک اور جائداد منقولہ تصور کیا ہے جس کا سمجھنا موجودہ زمانے میں ذرا مشکل ہے۔ اسلئے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال مسیحیت سے براہ راست آئے اور اسی سے حافظ ابن حجر نے اپنی فتح الباری شرح بخاری کی گیارھویں جلد کے صفحہ ۲۷۰ میں جس مقام پر دجال وغیرہ کا ذکر آیا ہے فرمایا ہے ونقل ھولاء مع کونھم ثقات تلقوا ذٰلک من بعض کتاب اھل الکتاب یعنی کچھ عجب نہیں کہ ان لوگوں نے باوجود ثقات ہونے کے ان مضامین کو اہل کتاب کی بعض کتابوں سے لیا ہے۔" بعض فرقہ کے عیسائیوں کا یہ خیال تھا کہ دجال کسی جزیرے میں مقید ہے اور قرب قیامت میں وہ کھل کر دنیا میں فساد کرائیگا۔ خود حدیث میں دجال کی دو بڑی روائتیں تو ان نومسلم سے ہیں جو پہلے نصرانی تھے یعنی تمیم الداری[ف] اور النواس بن سمعان الکلابی۔ اب دیکھنا ہے کہ دجال کی آمد و انتظار کا مسلمانوں کو کیوں سودا سوار ہوا۔ ان پر کیا مصیبت آئی تھی جو اُن کو دجال دکھلائی دینے لگے تھے۔ اسلئے کہ اس قسم کی اُمیدیں وہاں کی جاتی تھیں جہاں ایک مظلوم قوم کسی غیر سلطنت و مذہب کے پنجہ عقوبت میں پڑ چکی ہو تو اس سلطنت کے ملوک دجال بن جاتے تھے۔ اور اُن سے آزاد کرانے والا خدا کا فرستادہ اور مسیح موعود بلکہ خود خدا۔ ایک تھوڑی سی تفتیش حدیث کی روایتوں کی تاریخ کی روشنی میں یہ راز کھول دیتی ہے کہ کن واقعات نے درحقیقت دجّال کا چرچا مسلمانوں میں کرایا۔

۱۵۸ھ ہجری تک مہدی خلیفہ عباسی کا زمانہ تھا کہ رومیوں نے یکایک مقام وابق و اعماق (جو سرحد حلب کے پاس ہیں) پر مسلمانوں کے لشکر پر ہجوم کیا اور اس دھاوے میں مسلمانوں کو ایسی شکست دی کہ خلافت کا ستون ہل گیا مسلمانوں کی منتشر افواج حسن بن قحطبہ کے زیر قیادت سرحد شام سے پیچھے ہٹ گئیں۔ رومیوں نے مسلمانوں کا قتل عام کردیا۔ مہدی کو جب اس شکست کی خبر ملی تو اُس نے مکہ و مدینہ اور تمام اطراف و جوانب سے فوجیں جمع کیں اور بغداد میں اپنے بیٹے موسیٰ کو نگراں مقرر کرکے رومیوں سے جنگ کے لئے نکلا اور موصل کے راستے سے ہوکر حلب میں داخل ہوا۔ جس کو اُس نے خلافت کی شکست خوردہ افواج کا صدر مقام بنایا اور وہاں سے اپنے بیٹے ہارون۔ عیسیٰ بن موسیٰ۔ مالک بن صباح اور حسن بن قحطبہ کو رومیوں کے مقابل بھیجا۔ اس کے بعد مہدی بیت المقدس کی زیارت کو چلا گیا۔ عیسے نے رومیوں کو پیہم شکست

---

ف ملا علی قاری نے اپنی کتاب موضوعات (مطبع مجیدی لاہور صفحہ ۱۶) امام طبرانی اور عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ تمیم الداری عادتاً قصاص و افسانہ گو تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمر سے سالہا سال تک اُنھوں نے قصہ گوئی کی اجازت مانگی لیکن وہ نہیں دیتے تھے۔ آخر میں اُن کے اصرار سے اتنی اجازت دی کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے کچھ لوگوں کو سنا دیا کریں۔ ایک دن انھوں نے دیر لگادی۔ اس پر انہ سے ان کی خبر لی۔

Marfat.com

دی اور پسپا رومی فوجوں کا تعاقب قسطنطنیہ تک کیا گیا اور پھر ایک بار مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ اس وقت قسطنطنیہ کے تخت پر اسحق پیلوگس کے خاندان سے قسطنطین سادس اپنی ماں کی زیر نگرانی تخت نشین تھا۔ محاصرہ بہت عرصے تک جاری رہا مگر اسوقت خراسان میں مقنع کی شورش شروع ہوگئی۔ جس کے پیرو مبیضہ کہلاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطین سے مسلمانوں نے صلح کرلی اور عیسٰے بن موسیٰ اس کام سے فارغ ہوکر شام واپس آیا اور مہدی سے بیت المقدس پر ملاقات کی۔ پھر دونوں فاتحانہ بغداد میں داخل ہوئے۔ عیسٰی بن موسیٰ اس کے بعد خراسان کی مہم پر گیا۔ اس نے مقنع کے فتنے کو دبایا مگر مقنع تیزاب میں نمک کی طرح گھل کر ہلاک ہوا۔

ان تاریخی واقعات کو اس حدیث سے ملاکر پڑھو جو میں نے مسیح الدجال والی حدیثوں کے ضمن میں نمبر ۴ پر ابن مسعود اور ابوہریرہ سے نقل کیا ہے۔ تم پر یہ راز کھل جائے گا کہ واضعین حدیث کس بیباکی سے اصحاب رسول کا نام سند روایات میں لاتے ہیں حالانکہ جنگ وابق کے وقت میں ابن مسعودؓ اور ابوہریرہؓ کی ہڈیوں کا بھی پتہ نہ تھا۔ اس کی تاویل یوں کرنا کہ یہ پیشگوئی کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے بیان کیا تھا پھر وہی سوال پیدا کرتا ہے کہ دنیا میں اس کے بعد مسلمانوں کو بڑے بڑے قیامت خیز واقعات سے دوچار ہونا پڑا اس کی پیشگوئی کیوں نہ کی گئی یا کم سے کم کسی ایک ایسے واقعہ کا ذکر حدیث میں ہو جو تدوین حدیث مسلم و بخاری و صحاح کے بعد ہوا ہو۔ حدیث کے دجال اور مقنع کا موازنہ کرو۔

| دجال | مقنع |
|---|---|
| (۱) مہدی کے زمانے میں خروج کرے گا۔ جنگ وابق کے بعد۔ | (۱) مہدی کے زمانہ میں خراسان میں خروج کیا جنگ وابق کے بعد۔ |
| (۲) مشرق اور بحر طبریہ سے خروج کریگا۔ | (۲) خراسان مشرق میں ہے اور اسی سے ملحق بحر طبرستان ہے۔ |
| (۳) اصفہان کے ستر ہزار یہودی اس کی پیروی کریں گے۔ | (۳) اصفہان کے یہودی اس کے مطیع ہوئے۔ |
| (۴) وہ یہودی چادریں اوڑھے ہوئے ہونگے۔ | (۴) مقنع کے پیرو بھی سفید چادریں اوڑھتے تھے۔ |
| (۵) وہ کانا ہوگا۔ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ خرق عادت دکھائیگا۔ | (۵) کانا اور بدشکل تھا۔ خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ چاہ نخشب سے چاند نکالا تھا۔ |
| (۶) اُس کی پیشانی پر ک۔ ف۔ ر۔ لکھا ہوگا۔ | (۶) اسواسطے وہ نقاب منہ پر ڈالا کرتا تھا کہ شاید کوئی اُسکی صورت دیکھ کر اس سے برگشتہ ہو جائے۔ |
| (۷) وہ گل جائے گا۔ | (۷) مقنع تیزاب میں گل کر مرگیا تھا۔ |

اس سے معلوم ہوگا کہ مہدی۔عیسیٰ۔ دجال کی اصل حقیقت کیا تھی۔ اور کونسی قیامت مسلمانوں میں برپا ہونیوالی تھی۔ رہا یہ کہ مقنع واقعی وہی دجال کانا تھا۔ بخاری کا یہ قول جو ذہبی نے میزان الاعتدال میں نقل کیا ہے اس نظریہ پر روشنی ڈالتا ہے:۔

قال سفیان بن عینیہ سمعت مقاتلا یقول ان لم یخرج الدجال فی سنۃ خمسین مأئۃ فاعلموا انی کذاب یعنی سفیان بن عینیہ نے کہا کہ میں نے مقاتل سے سنا کہتے تھے کہ اگر دجال کا خروج ۱۵۰ھ میں نہ ہو تو مجھ کو جھوٹا سمجھنا۔

اب رہا ابن صیاد کا وجود اور اس کے متعلق دجال ہونے کا شبہ۔ اس قسم کے پُراسرار لوگ ہر زمانے اور ہر ملک میں پائے گئے ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ آنحضرت کے زمانے میں وہ تھا یا آپ اُسکی شعبدہ بازیوں سے خائف تھے اور یا آپ نے اس کو دجّال تصور کیا۔ اس میں سے پہلے دو کے بارے میں مجھے نہ اقرار ہے نہ انکار۔ یہ روایتیں شاذ ہیں اور اس کے متعلق بخاری نے ایک لفظ نہیں کہا۔ لیکن آخری شق کے بارے میں مجھے قطعی یقین ہے کہ آپ نے ابن صیاد کو دجّال کبھی نہیں جانا۔ کیونکہ اگر آپ اس کو دجال جانتے ہوتے تو آپ دجال کی وہ علامتیں نہ بتاتے جو آپ کی طرف سے حدیثوں میں بتائی گئی ہیں۔ اور چونکہ آپ نے اسکو دجال نہ سمجھا تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسکو خواہ مخواہ دجال کی فہرست میں جگہ دیں۔ ورنہ ایران میں مالکم خاں ارمنی۔ ہندستان میں آکشی شاہ وغیرہ سب ہی دجال سمجھے جائینگے۔

البتہ ان سب سے غریب تمیم الداری کا دجال ہے۔ یہ روایت اگر سند باد جہازی بیان کرتا تو ہم اسکی تاویل کی ضرورت نہ سمجھتے۔ مگر از بسکہ مسلم میں ہے اور اس میں جسارت کے ساتھ حضرت کا نام لیا گیا ہے۔ ہم کو کہنا پڑیگا۔ یہ روایت قطعی موضوع ہے اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خود تمیم الداری نے اگرچہ اُنکی روایتیں صحاح میں ہیں۔ اسکا ذکر نہیں کیا۔

۲۔ فاطمہ بنت قیس کو حضرت عمرؓ نے قابل اعتبار والتفات نہیں جانا۔

۳۔ باوجودیکہ یہ قصہ مسجد میں بیان ہوا اور اس کے سننے والے کثرت سے تھے۔ کسی ایک شخص سے یہ روایت مروی نہیں۔

۴۔ اس روایت میں وہ رنگ پایا جاتا ہے جو اسوقت کا ہے جب عرب بحری سفر عربوں نے آنحضرت کے زمانے میں نہیں کیا۔

۵۔ روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جاسوس اور دجال نے تمیم الداری سے کس زبان میں گفتگو کی۔

۶۔ رسول اللہ صلعم کے ہاتھ میں پشت خار دیا گیا ہے۔ حالانکہ پشت خار وہ رایب استعمال کرتے تھے جو کثافت جسمانی کو ایک قسم کی عبادت جانتے تھے اور جب کثافت سے اُنکی پیٹھ کھجلاتی تھی تو اس کے لئے ان لوگوں

Marfat.com

خارپشت کا آلہ ایجاد کیا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی پیٹھ پر نعوذ باللہ میل کی تہ نہ جمی تھی کہ اُنکو خارپشت کی ضرورت ہوتی۔ اُ
بدن تو آئینہ کی طرح شفاف تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

۷۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دجال پیدا ہوکر ایک جزیرہ میں مقید ہے حالانکہ قرآن کی رُو سے کسی نفس
کو عمر جاوداں نہیں دی گئی۔ انك میت وانهم میتون۔ کل نفسٍ ذائقة الموت۔

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمیم الداری نے جو دجال دیکھا تھا ٹھیک اسکی خبر میں پہلے دے چکا
ہوں۔ حالانکہ جو علامتیں حدیث کی رو سے آپ نے دجال کے بارے میں بتائی ہیں اُن میں سے کوئی بھی اس عجیب
شخص سے نہیں ملتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو ہستی جلد نکلنے والی تھی وہ آج تیرہ سو برس کے بعد بھی ایسے
جزیرہ میں مقید ہے۔ جس کا پتہ نہیں۔

چونکہ خروج دجال اور نزول مسیح لازم و ملزوم ہیں اس سلسلے میں نزول مسیح کے متعلق بھی کچھ کہدینا چاہیئے۔ اس
علم تو خدا کو ہے کہ انجیل میں حضرت عیسیٰ کے دوبارہ نازل ہونے کی جو روایتیں ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں لیکن انجیل متی
ولوقا کے یہ الفاظ خود آپ اپنی تردید کرتے ہیں "ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئیگا۔ اس
وقت ہر ایک کو اُسکے کاموں کا بدلہ دیگا۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں اُن میں سے بعض ایسے ہیں
کہ جب تک ابن آدم کو اُس کی بادشاہت میں آتے ہوئے نہ دیکھ لیں گے موت کا مزہ ہرگز نہ چکھیں گے (متی باب ۱۶
آیت ۲۷-۲۸) خواہ ابن آدم سے مراد حضرت مسیح سے ہو جیسا عیسائیوں کا خیال ہے یا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے
جیسا میرا خیال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نہ حضرت محمد مصطفےٰ ایسے وقت تشریف لائے اور نہ حضرت عیسیٰ ایسے وقت
تشریف لاویں گے کہ حضرت عیسےٰ کا دیکھنے والا اور اُن کے اس قول کو اپنے کان سے سننے والا ایک بھی دنیا میں موجود
ہوگا۔ لہذا اس آیت کی لغویت تو اظہر من الشمس ہے لیکن آفرین ہے وضاعین حدیث پر کہ اُنھوں نے جب نصاریٰ کے
لاف وگزاف سنا کہ "ذرا صبر کرو۔ حضرت مسیح آسمان سے اُترنے والے ہیں۔ اُسوقت تم مسلمان ہلاک کئے جاؤگے
اور مسلمانوں نے طنزاً اُن سے کہا کہ ہاں اُتریں گے تو ضرور۔ مگر ہمارے سردار ہوکر اور تمھارے دشمن بنکر۔ صلیب کو توڑینگے
سوروں کو قتل کرینگے۔ جزیہ کو موقوف کرینگے۔ (اس قسم کی آرزوئیں شروع میں عیسائیوں کو مسلمانوں کا غلبہ دیکھ کر بہت
رہا کی ہیں۔ چنانچہ بازنطائنی لٹریچر میں ایسی کتابیں پائی گئی ہیں جن میں اسلام کے حضرت مسیح کے ہاتھ سے پامال کئے
جانے کی پیشگوئیاں درج ہیں) اس قسم کی حجت جیسا یوحنا بطریق کے مباحثوں سے معلوم ہوتا ہے عیسائیوں اور مسلمانوں
میں عبدالملک کے زمانے میں رہا کی ہے اور شاید جو حضرت مسیح کو آسمان سے دمشق کے کنگرہ مسجد پر اُتارنے کا خیال ہے
وہ صرف اس لئے وضع ہوا کہ عبدالملک دمشق کے مشہور گرجے کے کنگرہ کو گرانے نہ پائے۔ مگر تھوڑے دنوں میں محدثین
نے اس پر مہر نبوت لگادی۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات پاک کی قسم کہ جس

ہاتھوں میں میری جان ہے قریب ہے کہ ابن مریم تم میں اُتریں گے توصلیب کو توڑ دیں گے اور سور کو قتل کر ڈالیں گے اور جزیہ مقرر کرینگے اور مال اسقدر تقسیم کرینگے کہ کوئی لینے والا نہ ہوگا اور ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے اوتت بہتر ہوگا۔ پھر راوی نے کہا اگر تم کو یقین نہ آئے تو یہ آیت پڑھ لو "وان من اھل الکتٰب الا لیومنن بہ قبل موتہ ویوم القیٰمۃ یکون علیھم شھیداً" ہم نے بھی اس آیت کو قرآن شریف میں پڑھا ہے اور ہم تو اس کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ یہود جو اپنے زعم باطل میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ انھوں نے حضرت مسیح کو صلیب دی تھی۔ انکو اپنے مرنے سے پہلے یقین ہوگیا اور تک جاتا رہا کہ حضرت مسیح صلیب پر یا تو ہلاک نہیں ہوئے یا اُنھوں نے غلطی سے اُنکی جگہ اُنکے کسی ہم شکل کو صلیب دیدی اور وہ زندہ رہے اور اپنے کو واقعہ صلیب کے بعد ظاہر کیا۔ ہم کو تو کہیں سے اس آیت سے حضرت مسیح کا آسمان سے اُترنا ثابت نہیں ہوتا۔ غرضیکہ حدیث نے نصاریٰ و مجوس کے اصل عقیدہ دجال اور حضرت مسیح کی خدائی قوت کا اعتراف ان غریب مسلمانوں سے بھی کرایا جو اسپر تبسم آمیز حقارت سے نظر کرتے فاعتبروا یا اولی الابصار

لیکن اسپر پہلا سوال تو یہ ہے کہ آیا حضرت مسیح بقول قرآن وفات پا چکے ہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ وفات پا چکے ہیں تو کیا قرآنی عقائد کے بموجب ایک شخص مرکر پھر دنیا میں واپس آسکتا ہے؟

سورہ مائدہ میں ہے:۔

وکنت علیھم شھیداً مادمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شئی شھید

اور میں جب تک اُن کے ساتھ تھا اُن پر گواہ تھا اور جب تو نے مجھے وفات دی تو اُن کا نگہبان تو تھا اور تو سب چیزوں کا دیکھنے والا ہے۔

اسی طرح سورۂ مریم میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ دونوں کے ذکر میں یہ آیت موجود ہے۔

وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیًا

رہا یہ سوال کہ انسان مرکر دنیا میں واپس آسکتا ہے سو اس کے متعلق کسی دلیل یا آیت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ صرف قرآن سے اس کی تردید بلکہ وجود ہے خصوصاً جبکہ کفار حسرت سے دعا مانگیں گے کہ اگر وہ پھر دنیا میں واپس بھیجے جائیں تو نیک کام کرینگے اور اُن کو یہ جواب دیا جاتا کہ ایسا قطعی ناممکن ہے خود حدیث میں ہی یہ موجود ہے کہ جب شہداء سے سوال کیا جائیگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور وہ خواہش کرینگے۔ وہ دنیا میں جاکر پھر شہید ہوں تو اُنکو جواب ملیگا کہ ایسا ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے ایسے لوگوں کو جو بندوں کی طرح رجعت کے قائل تھے۔ اور جن کی ایک جماعت بعد میں موجود تھی۔ کافر قرار دیا ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حضرت عیسیٰ کو موت تو ضرور آئیگی مگر وہ ابھی زندہ ہیں۔ جب دوبارہ اُتر کر آئیں گے۔ تب مرینگے۔ سو اسکی تائید قرآن شریف کی کسی آیت سے تو نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے سورہ مائدہ کی آیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

Marfat.com

اگر حضرت عیسیٰ تا قیامت زندہ رہتے تو اُن کا یہ قول فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم جسکا اشارہ
عیسائیوں کی طرف ہے مہمل ہوجاتا۔ اسواسطے کہ اُن کے دوبارہ مرنے کے بعد عیسائیوں کا سوال ہی باقی نہ رہجائے
اُن کی وفات سے پہلے ہی وہ سب کے سب مسلمان اور تثلیث کے خلاف ہوجائیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ نزول عیسیٰ اور خروج دجال کی جسقدر روائتیں حدیث میں ہیں وہ قرآن کے عقائد سے قطعی
ہیں اور اُن کا حدیثوں میں منتقل ہونا یہ صرف نومسلم نصاریٰ کا طفیل تھا یا اُن نادان مسلمانوں کی بدولت جو نصرانو
کی صحبت میں اپنے قرآن کو بھول چکے تھے اور روایتوں میں پڑ گئے تھے۔

## تتمہ مضمون دجّال ——————— از مولانا تمنّا عمادی مجیبی پھلواری

مولانا مودودی (زج) موجودہ طبقۂ علماء میں مجھے سب سے زیادہ محبوب فی اللہ ہیں۔ صرف اس لئے کہ ان کا مسلک ای
رواں مسلک ہے اور رفتہ رفتہ یہ قریب الی الحق آتے جاتے ہیں اور بتوفیقہٖ تعالیٰ اس میں رُو بہ ترقی ہیں فالحمد
ثم الحمد للہ میں اسکی مزید تفصیل کی نہ ضرورت سمجھتا ہوں، نہ مصلحت اس کی مقتضی ہے۔

مگر ابھی تک میں اس سے مطمئن نہیں کہ وہ اپنے خلاف کسی قوی تنقید کو اپنے پرچے میں جگہ دیدیں گے اور بلا حیل
وعذر اسکو بکشادہ پیشانی قبول فرمالیں گے، جیسا کہ مجھے ایک مرتبہ کا ذاتی تجربہ ہے۔

اوپر کی چند سطریں صرف ایک حدیث کے اتباع میں امتثالاً لامر النبی الکریم صلعم لکھ دی ہیں ورنہ زمانہ
خراب آگیا ہے کہ ایسے دعوے عموماً مشتبہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔

کسی کو گر کسی سے حسنِ ظن ہو، ٹوہ لو اُس کی  کہ جائے بدگمانی ہے نہ ہونا بدگمانی کا (الکاتبہ غفر
بہ ہر حال مجھے اس سے مطلق بحث نہیں کہ مولانا یا مولانا کے معتقدین مجھے مولانا کا مخلص و محب سمجھیں یا نہ سمجھیں
میں ہر اہل حق یا قریب الی الحق سے اخلاص و محبت رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور یہ فرض حسبِ مراتب بتوفیقہٖ تعا
ادا کرتا ہوں اور اس کا اُس پر مناسب ذریعے سے اظہارِ اتباع حکم رسول سمجھتا ہوں اور یہ سنت بھی حسب موقع ا
کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کے بعد لنا اعمالنا ولکم اعمالکم۔

مولانا نے فروری ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں کسی مستفسر کے جواب میں حدیثِ دجال کی تحقیق فرماتے ہوئے
جو کچھ بھی ارشاد فرمایا ہے، اس کو ایک عزیز کے اصرار سے جو میں نے دیکھا تو دل بے چین ہوگیا اور ایمان کانپ اُٹھا ا
بے اختیار معاذ اللہ من ذالک کہہ اُٹھا۔

**مولانا کی تحقیق** | "دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلعم سے مروی ہیں، انکے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے
سے یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے کہ حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا، وہ صرف

اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجّال ظاہر ہونے والا ہے، اُس کی یہ اور یہ صفات ہونگی، اور وہ ان ان خصوصیات کا حامل ہوگا، لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا کہاں ظاہر ہوگا اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں، جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے کبھی آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجّال خراسان سے اُٹھے گا کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپ نے ابن صیّاد نامی اس یہودی بچّے پر جو مدینہ میں غالباً ۸ھ یا ۹ھ میں پیدا ہوا تھا، یہ شبہ کیا کہ شاید یہی دجّال ہو اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپ کو یہ قصّہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحرِ روم یا بحرِ عرب میں) سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور وہاں اُنکی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اُس نے اُنھیں بتایا کہ وہ خود ہی دجّال ہے، تو آپ نے ان کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی البتہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمادیا کہ اس بیان کی رُو سے دجّال بحرِ روم یا بحرِ عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

یہ تردّد اوّل تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علمِ وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح ثابت نہ ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو، یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلّف کئے گئے ہوں۔ پھر جب کہ بعد کے واقعات سے ان باتوں کی تردید بھی ہو چکی ہے جو اس سلسلہ میں آپ نے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ان کو عقائد میں داخل رکھنے پر اصرار کیا جائے۔"

مولانا کے نزدیک رسول اللہ صلعم پر اگر کوئی بات بذریعۂ وحی منکشف ہوا کرتی تھی تو آپ بقدر ما وحی (جتنی وحی ہوئی اسی قدر) پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ وحی کے بعد اس پر اپنی طرف سے قیاس آرائیاں بھی فرماتے تھے اور چونکہ اس قیاس کی بنا محض اٹکل پر ہوا کرتی تھی اس لئے کبھی آپ کے ذہن نے کوئی اٹکل لگایا کبھی کوئی۔ کبھی گمان و وہم کا رجحان کسی طرف ہوا کبھی کسی طرف اور آپ صحابہ سے مختلف وقتوں میں اس وحی کو مختلف طرح اپنے مختلف اوہام و ظنون کے ماتحت بیان فرمادیا کرتے تھے۔ اس لئے اصل وحی تو بقدرِ مشترک تمام صحابہ میں ایک ہی ہوتی تھی مگر ان کے درمیان اختلافات جو ہوتے تھے، وہ رسول اللہ صلعم کے ذاتی قیاسات کی وجہ سے، جو مختلف وقتوں میں مختلف اُمیال و عواطف کی وجہ سے مختلف رنگ میں ظہور پذیر ہوئے۔ معاذ اللہ من تلك الهفوات الشنيعة۔

افسوس کہ مولانا پر روایتوں کی سطوت اس قدر مستولی ہے کہ یہ لکھنے کی جرأت نہ ہوئی کہ یہ ساری روایتیں جھوٹی ہیں۔

Marfat.com

یا صرف فلاں روایت سچی ہے باقی سب روائتیں جھوٹی ہیں۔ اگر ایسا کہہ دیتے تو مولویوں کے نرغے میں پڑ جاتے اور خود اُ
جماعت کے علما اُن کا سر کھا جاتے۔ مگر اتنا بڑا صریح بہتان اور ایسا کھلا شنیع الزام رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک
لگاتے ہوئے مولانا کو مطلق کوئی باک محسوس نہ ہوا، اس لئے کہ مولانا سمجھتے ہیں کہ علما اسکو برداشت کرینگے مگر اسکو برداشت نہیں کرینگ

اختلافاتِ احادیث واختلافاتِ مذاہب کے وجوہ و اسباب کی سردے سرد تاویلیں حضرت شاہ ولی اللہ ا
ان سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے مختلف رنگ میں پیش کی ہیں۔ مگر ہمارے مولانا نے ایسی گرم و آتش بار توجیہہ بیا
فرمائی ہے کہ جو مسلمان بھی اس کو تسلیم کرے، بیک چشم زدن اس کا سارا خرمن ایمان جل کر خاکستر ہی ہو کر رہے۔

نبی صلعم نے جہاں مختلف اٹکل لگایا، وہاں تو قدر مشترک کو اصل وحی اور قدر مختلف فیہ کو اٹکل کا نتیجہ سم
سکتے ہیں، لیکن جہاں آپ نے مختلف اٹکل نہیں لگائے بلکہ ایک ہی اٹکل لگایا، وہاں تو اصل وحی اور اٹکل کا
ایسا خلط ملط ہوا کہ پتہ لگانا ہی محال ہے۔

راویانِ احادیث نے کسی مسئلہ میں بھی ایک ہی مضمون ایک ہی عنوان سے کبھی نہیں بیان کیا، اس میں مولانا کے
نزدیک راویوں کا کوئی قصور نہیں۔ قصور خود رسول اللہ صلعم کی قیاس آرائیوں کا ہے کہ خود آپ ہی نے ہر مسئلہ کو بقدر ما وحی
پر اپنے مختلف قیاسات کا اضافہ مختلف وقتوں میں فرما فرما کر ہر مسئلہ کو اُمت کے لئے مختلف فیہ بنا کر چھوڑا۔ اور جسمیں قیاس ک
دخل دینے کی گنجائش نہ تھی۔ مثلاً نص قرآنی، اس کے لئے جو حکم ہوا کہ ایک ہی حرف (قرأت) پر پڑھا کرو، تو آپ کو
سخت بے چینی ہوئی اور جبرئیل امین کو واپس کیا کہ جاؤ عرض کرو۔ میری امت ایک طریقے سے پڑھنے کی مشقت کبھی
برداشت نہیں کر سکتی، ہم اللہ سے اپنی امت کے لئے سلامت وعافیت کے خواستگار ہیں۔

جبرئیل پیام لائے کہ اچھا دو طرح پڑھو، پھر جبرئیل کو واپس کیا کہ پھر جاؤ، میری امت بہت ضعیف ہے، او
یہ بار بالکل ناقابل برداشت۔ ہم اللہ سے اپنی اُمت کے لئے سلامت وعافیت کے طالب ہیں۔

غرض رسول اللہ صلعم نے اپنی کمزور و ناتواں امت کی خیرخواہی میں جبرئیل امین کو یہاں تک دوڑایا کہ بالآخر سات
طرح پڑھنے کی اجازت حاصل کر کے رہے۔

ایسا ہمدرد حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم نبی کریم کس امت کو ملا ہوگا، جس نے مولانا کے نزدیک اپنی
اُمت کے لئے اختلافات کی نعمتوں کا اتنا بڑا انبار لگا دیا کہ آج تک کوئی محدث بھی، کسی طرح کا مؤلف بھی تمام اختلافات
کا احصار نہ کر سکا اور خود صاف فرما گیا کہ اختلاف اُمتی رحمۃ میری امت کا اختلاف رحمتِ الٰہی ہے اگلی اُمتیں
صرف اختلاف ہی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں تو ہوا کریں، ان کو یہ نعمتِ عظمیٰ نہیں ملی تھی۔ جو چیز اگلی اُمتوں کے لئے
باعثِ ضلالت و ہلاکت تھی، اس کو اپنی اُمت کے لئے سرچشمۂ ہدایت و فلاح بنا لیا گیا۔ قرآن میں اختلاف سے جو منع
فرمایا گیا تھا۔ وہ آغازِ اسلام کا حکم تھا۔ یقیناً بعد کو منسوخ کر دیا گیا۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور سارے مسائل جو مختلف طریقوں سے حدیثوں میں مروی ہیں سب کی تحقیق مولانا نے صرف ایک حدیث دجال کی تحقیق فرماکر فرمادی اور ایک عقدہ حل کرکے ساری گتھیاں سلجھا دیں کہ اصل وحی (قرآن) میں تو صرف نماز پڑھنے کا حکم تھا اور قیام و رکوع و سجود کا ذکر فرمادیا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے مختلف وقتوں میں مختلف قیاس کیے اور مختلف صحابہ کو مختلف طرح کی نماز تعلیم فرمائی۔ یہ سارے اختلافات آپ کے قیاسات کے ہیں جن میں سے معلوم نہیں کون سا قیاس صحیح تھا اور کون غلط۔

پیشین گوئی کے تو صدق و کذب کا پتہ کبھی نہ کبھی چل جا سکتا ہے، اگرچہ اس میں بھی ہر زمانے میں آئندہ کے ظہور کا منتظر رکھا جا سکتا ہے، لیکن جن باتوں کا تعلق احکام سے ہے۔ ان میں تو اس کا پتہ لگنا ہی محال ہے کہ کون سا قیاس صحیح تھا اور کون سا حکم غلط۔ اس طرح تو سارا دین مشتبہ ہو کر رہا۔

مولانا ابن صیاد کے اسلام کا ذکر فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ دجال کس طرح ہو سکتے ہیں، جب کہ وہ اسلام لا چکے اور مسلمان مرے۔ مگر حضرت فاروق اعظمؓ کا ان کے دجال ہونے پر قسم کھانا اور رسول اللہ صلعم کا اس پر [illegible] کچھ نہ کہنا اور پھر حضرت جابر اور حضرت عبداللہ ابن عمر کا آخر وقت تک ابن صیاد کے دجال ہونے پر مصر رہنا اور یہ کہنا کہ اگرچہ وہ اسلام لا چکا اگرچہ وہ مکہ مکرمہ و مدینہ طیبہ میں داخل ہو چکا مگر وہ دجال ہی ہے۔ یہ سب [illegible]

**حقیقتِ دجال**

اصل یہ ہے کہ یہ ساری روایتیں کوفے کے ٹکسال میں گڑھی گئیں اور یہاں ہی [illegible] پہنچیں۔ تمیم داری والی روایت جو ان میں سب سے زیادہ جھوٹی روایت [illegible] ہی میں گڑھی گئی۔ اس کے سارے طرق ہر پھر کر عامر بن شراحیل الشعبی الکوفی تک پہنچتے ہیں اور یہی اس روایت [illegible] بانی معلوم ہوتے ہیں۔ ائمہ رجال چاہے ان کی کتنی ہی توثیق کریں۔ مگر اہلِ کوفہ کی روایتوں کے متعلق سارے [illegible] خیال رکھتے ہیں، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ کوفے کا چاہے کیسا ہی ثقہ راوی حدیث ہو، مگر اس کی روایتیں خود [illegible] کوفیہ کا صاف پتہ بتا دیتی ہیں۔ یہی صاحب ہیں جنھوں نے حضرت علی مرتضیٰ کے بعض اقوال کے وزن [illegible] ان پر قیاس کر کرکے کتنے قضایا (مقدمات کے فیصلے) بصورت روایت حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرکے بیان کیے جس کی شہادت ابن ابی حاتم نے اپنے والد کی روایت سے دی ہے جسکو ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں [illegible] کوفی راویوں کی ثقاہت کو ہرگز نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ان کی روایتوں کو ہمیشہ درایت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔

**وحی غیر تشریعی**

وحی غیر تشریعی، جس میں احکام از قسم اوامر و نواہی نہ ہوں، بلکہ صرف کوئی پیشگوئی ہو، کوئی بشارت ہو، کسی آنے والے واقعے کی اطلاع ہو۔ انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ خواب و کشف و القا [illegible] ہوا کرتی تھی، اس لیے اگر مسیح دجال کے آنے کی بھی اطلاع دی گئی ہو تو کیا تعجب ہے۔ قرینہ غالب بلکہ [illegible] یقین سا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کو وحی مسیح دجال کے آنے کی خبر دی گئی اور آپ نے خروج دجال [illegible]

کو متنبہ فرما دیا۔

**مسیح دجّال** مسیح دجال ایک اسم جنس ہے، اس کے بہت سے افراد ہوئے اور آیندہ ہو سکتے ہیں۔" دجال
یعنی کذّاب۔ حقیقت پر باطل کا، صدق پر کذب کا پردہ ڈالنے والا سچے مسیح تو گذر گئے جو عیسیٰ
بن مریم تھے۔ علیہ وعلیٰ نبیّنا الصلوٰۃ والسلام مگر جھوٹے مدعیان مسیحیت کتنے آئے اور گذر گئے اور کچھ نہ کچھ فتنے
گئے اور آیندہ بہتیرے آنے والے ہیں جو دُنیا میں گم راہ کُن فتنے پھیلائیں گے۔ اس کی پیشگوئی کر کے رسول اللہ صلعم نے اپنی
امّت کو اُن جھوٹے مسیحوں کے فتنے سے آگاہ فرما دیا۔ اس سے زیادہ دجال کی اور کوئی حقیقت نہیں۔

مگر راویان کوفہ جو کذب وافترا کے خوگر تھے، انھوں نے اس پر حاشئے چڑھائے۔ کسی نے دجال کے لئے اعور
(کانے) ہونے کی شرط ضروری کر دی اور اس کو اس طرح بیان کیا کہ" دجّال کانا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے" جیسے خدا اور
دجّال میں صرف اسی قدر فرق ہوگا اور تمام باتوں میں وہ خدا ہی کی طرح ہوگا معاذ اللہ من ذالک کیا محدثین نے
ان روایتوں کی لفظی ومعنوی رکاکت ظاہرٌ و باہرہ سے بھی ان روایتوں کی مکذوبیت کو محسوس نہیں کیا ہے۔

کسی نے کہا کہ وہ موجود ہے مگر چھپا ہوا ہے وقت پر نکلے گا۔ کسی نے کہا کہ پیدا ہوگا۔ کسی نے کہا کہ اصفہان
سے خروج کریگا۔ کسی نے کہا کہ خراسان سے۔ پھر حضرت مسیح بن مریم خود تشریف لا کر اس کو واصل بہ جہنم کریں گے
وغیرہ ذٰلک۔ یہ ساری باتیں کوفے کے ٹکسال میں گڑھی گئیں۔ کوفے کے ٹکسال کا پہلا بازار بصرہ ہے ہر روایت نے مِن
الکوفۃ الی البصرہ کہہ کر پھر قدم آگے بڑھایا۔ ان مفتریات ومکذوبات کی دراصل کوئی اصل نہیں کیوں کہ ما انزل اللہ
بہا من سلطان۔

مولانا نے خواہ مخواہ ان کوفی راویوں سے مرعوب ہو کر انکی پوزیشن کو تو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور رسول اللہ صلعم
پر بیجا قیاس آرائیوں کا غلط اور رکیک ترین الزام دھر دیا۔ اللّٰھم انی اعوذ بک من تسویلات النفس وھمزات الشیطان

**قیاس** کوئی حکم قطعی کسی خاص علّت قطعیہ کی وجہ سے کسی چیز کے متعلق ہو اور دوسری جس کے متعلق کوئی حکم شرعی نہ ہو
مگر وہی علّتِ قطعیہ جو پہلی چیز میں تھی، اس میں بھی پائی جاتی ہو، تو صرف اس اشتراک علّت کی وجہ سے
وہی حکم جو پہلی چیز پر تھا اس دوسری چیز پر بھی سمجھا جائے گا۔ اسی کو قیاس شرعی کہتے ہیں اور یہ چیز عہد نبوی سے
وقت تک دار و مدار رہے۔ دینیات ہی میں نہیں بلکہ یہ ایک ایسی منطقی چیز ہے کہ دنیا کے تمام کاروبار میں دار و مدار
ہے۔ کوئی صاحب عقل اس کو اصولاً غلط نہیں کہہ سکتا اور نہ اس سے بچ سکتا ہے۔ ہر شخص کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی
امر میں قیاس کرنا ہی پڑتا ہے۔

**شرط جواز قیاس** مگر جواز قیاس کی دو شرطیں ضروری ہیں، جن کی طرف سے عام طور سے فقہاء وعلماء غفلت برتتے
ہیں ایک تو علّت حکم کا قطعی اور یقینی ہونا۔ دوسری شرط" ضرورتِ قیاس" ہے یعنی یہ جا

نہیں ہے کہ کسی شبہے یا گمان کی بنا پر ایک علّت حکم اپنی طرف سے بلا دلیل قطعی قائم کر لیں اور پھر اسی وہی علّت کی بنا پر وہی حکم دوسری جگہ بھی منتقل کرنے لگیں۔ یہی گمراہی تھی جس نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ فقاسوا مالم یکن بما کان، یعنی جو چیزیں ان کے دین میں تھیں ان پر قیاس کر کرکے ان چیزوں کو اپنے دین میں داخل کر لیا، جو دین میں داخل نہ تھیں اور آج ہمارے علماء بھی کر رہے ہیں۔ آئی بدعتیں اسی طرح نکلیں۔

اسی طرح جب تک ضرورت مجبور نہ کرے، قیاس کبھی نہ کرنا چاہیے ورنہ قیاسی چیز پر عمل کرنا چاہیے۔ پانی موجود رہتے ہوئے شربت کا پانی پر قیاس کرکے شربت سے وضو کرنا کبھی جائز نہ ہوگا۔

## عقاید وعبادات میں قیاس

قیاس کا تعلق اجتہاد و استنباط مسائل سے ہے اور اس کی ضرورت عام طور سے حقوق و معاملات کی نئی نئی صورتوں میں پیش آتی ہے عقاید و عبادات تو ایک معین و مقرر چیز ہے، اس میں قیاس کی کوئی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ الا ماشاء اللہ

## رسول اور قیاس

جہاں تک قیاس شرعی کا تعلق ہے، وہ تو اس لئے تاکہ امت کو اس کا سلیقہ بتایا جائے بعض معاملات میں آپ نے قیاس کرکے بتا دیا ہو تو یہ کوئی بعید از عقل نہیں۔

ورنہ بلا ضرورت کسی قسم کی وحی کے متعلق اس سے فاضل باتوں میں جو وحی ہوئی ہے، آپ کا اپنی طرف سے غور و خوض کرنا اور قیاس دوڑانا کسی طرح بھی آپ کے لئے جائز نہ تھا۔ آپ کو صاف فرمایا گیا کہ ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ جس بات کا تم کو علم نہیں ہے تم اس کے پیچھے نہ لگو۔ اتباع ظن اور خرص یعنی اٹکل لگانا کفار اور گمراہ لوگوں کا شیوہ بتایا گیا ہے۔ ان یتبعون الا الظن وان ہم الا یخرصون یہ لوگ اتباع ظن ہی کیا کرتے اور اٹکل ہی لگایا کرتے ہیں۔ غرض اس طرح کی لغو و لایعنی و رکیک حرکتیں ایک معمولی صاحب وقار کی بھی شان نہیں، چہ جائے کہ حضرت خاتم النبیین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

Marfat.com

# اسرےٰ اور معراج

سُبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ
بٰرکنا حولہٗ لنریہٗ من اٰیٰتنا ط انہٗ ھو السمیع البصیرہ

(قرآن کریم۔ بنی اسرائیل۔ آیت اوّل) پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقص
تک لے گیا۔ جس کے گرد و نواح کو ہم نے برکت دی ہے۔ تاکہ اسکو اپنی نشانیاں دکھلائے اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

**اسرائے**

"اسرائے" کے لفظی معنی صرف چلانے چلنے کے ہیں۔ جس طرح "بات" کے معنی گھر پہ رہنے کے ہیں مگر عر
میں ہمیشہ دونوں کے معنی سے رات کا چلنا اور رات کو گھر پہ رہنا مراد لیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلعم ک
زمانے میں مسجد اقصیٰ یا ہیکل سلیمان کا نشان تک باقی نہ تھا۔ بلکہ وہ جگہ مزبلہ تھی۔ اسکا اشارہ بٰرکنا حولہٗ میں ہے یع
اگرچہ مسجد اقصیٰ کا نشان باقی نہ تھا مگر اسکا نواح مقدس و بابرکت تھا۔ قرآن شریف کے رُو سے ہمارا ایمان ہے ک
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے ایک سال پہلے خدا نے ایک رات عجیب نشانیاں دکھلائیں۔ یعنی آپ راتوں ر
مکہ سے بیت المقدس تک آناً فاناً لائے گئے تاکہ وہ وہاں خدا کی نشانیاں ملاحظہ کریں۔ بالکل اسی طرح جیسا حضرت
یعقوب علیہ السلام کو دکھلایا گیا تھا اور جس کا ذکر توریت میں اسطرح ہے (دیکھو کتاب تکوین باب ۲۸۔ آیات ۱۲-۱۰

"پس یعقوب بیر سبع سے نکلکر حران کی طرف روانہ ہوئے اور ایک مقام پر ٹھہرے اور رات کو اس مکان می
رہے۔ اسواسطے کہ آفتاب غروب ہو گیا تھا اور اُنھوں نے ایک رویا دیکھا کہ ایک سیڑھی زمین سے آسمان تک لگ
ہوئی ہے اور اس پر فرشتے اُترا اور چڑھ رہے ہیں اور خدائے تعالیٰ کھڑا ہوا کہہ رہا ہے کہ میں خدا ہوں تیرے با
ابراہیم و اسحٰق کا۔ اور جس زمین پر تو سویا ہوا ہے وہ میں تجھ کو اور تیری نسل کو عطا کرونگا۔ اور تیری نسل ریت ک
ذرّوں کی طرح ہوگی اور شرق و غرب۔ شمال اور جنوب ہر طرف پھیلے گی اور میں تیری نسل کو دنیا کی تمام قوموں سے
کرونگا۔ اور دیکھ میں تیرے ساتھ ہوں اور تیری حفاظت کروں گا جہاں تو جائے گا اور تجھے اس زمین پر خیریت سے
واپس لاؤنگا۔ اسلئے کہ میں تجھ کو نہ چھوڑوں گا۔ جب تک کہ اس بات کو پورا نہ کروں جسکا وعدہ کیا ہے۔ پس یعقوب خوا
سے اُٹھے اور کہا حقیقت میں خدا اس جگہ ہے اور مجھے اس کا علم نہ تھا۔ اور انکو خوف لگا اور کہنے لگے یہ کیسی جگہ
یقیناً یہ خدا کا گھر ہے اور یہ آسمان کے دروازے ہیں اور جب صبح ہوئی تو یعقوب نے اس پتھر کو لیکر جس کو اپنا تکیہ

Marfat.com

تھا وہاں ستون کی طرح کھڑا کیا۔ اور اس پر زیتون کے تیل کو ڈالا۔"

رسول اللہ صلعم معجزانہ طریقے سے راتوں رات مکہ سے بیت المقدس لائے گئے۔ اسی کو اسرے کہتے ہیں۔ جو لوگ قرآن کی اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ ہے اور اسرے سے مراد آپکی ہجرت [illegible] سے راتوں رات چھپکر روانہ ہوئے تھے وہ صحیح نہیں۔ اسلئے کہ مسجد اقصیٰ سے مراد ہمیشہ عرب میں ہیکل سلیمان و بیت المقدس لیجاتی ہے۔ مدینہ میں کوئی مسجد اسوقت تک نہ بنی تھی۔ اگر مدینہ کا اشارہ ہوتا تو "یثرب" کو [illegible] بیان کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ دوسرے آپ راتوں رات مکہ سے مدینہ نہیں پہنچے بلکہ کئی [illegible] بہرحال مسجد اقصےٰ کو مدینہ کبھی کسی نے نہ سمجھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس میں کیا دیکھا۔ یقیناً آپ نے بیت المقدس کا [illegible] کا مسجود و قبلہ ہونا۔ پھر اسکا تباہ و برباد ہونا اور پھر اسکا اس حالت میں آنا جب آپ کی امت چند [illegible] داخل ہوگی۔ یہ سب کچھ آپکی نبوت کی آنکھوں نے دیکھا اور جو کچھ بھی اسرار خداوندی [illegible] خدائے تعالیٰ نے ان سب باتوں کو رویائے تعبیر دی ہے اور ہم بھی اس کو مانتے ہیں۔ [illegible] صرف قرآن ہی میں نہیں بلکہ توریت میں بھی اسکا اشارہ ہے بشرطیکہ اس کو بصیرت [illegible] سفر ملاخی کے تیسرے باب کی پہلی آیت میں ہے:۔

"خبردار رہو میں اپنے رسول کو اپنے آگے بھیجونگا کہ وہ میرے [illegible] ہیکل میں آئے گا وہ سردار انبیاء ہے جس کا تم کو انتظار ہے [illegible] ہاں وہ آئے گا۔ رب الملاک کہتا ہے۔

اسی طرح حجی کے نوشتے میں ہے:۔

"اور میں قوموں کو ہلاؤں گا اور تمام قوموں کا محمود آئیگا اور میں اس گھر کو [illegible] رب الملاک کہتا ہے میرا چاندی ہے میرا سونا۔ میرے آخری گھر کی شان پہلے گھر کی شان سے زیادہ ہوگی۔ رب الملاک کہتا ہے اور میں اس جگہ پر شلوم (اسلام) کو قائم کروں گا۔ (باب ۲ آیت ۷۔۔۔۹)

اسلئے یہ رویا کی تاویل عربی میں بالکل غلط اور لغو ہے۔ رویا کا تعلق دماغ [illegible] ہے۔ لہذا قرآن کے ماننے کے ساتھ یہ ماننا ضروری ہے کہ آنحضرت راتوں رات مکہ سے بیت المقدس [illegible] و مدد سے چلائے گئے اور اس کے بعد اگر انھوں نے وہاں آیات آلٰہی کو [illegible] مرحبا کہا اور نماز میں آپ کی اقتدا کی۔ اس پر رویا کی تاویل جائز ہو سکتی ہے۔ خدا کا اپنے بندے [illegible] رات میں لیجانا اور واپس لانا اس سے زیادہ آسان ہے جتنا اسکا ایک تصنیف بندہ ہوائی جہاز [illegible]

چند دنوں میں طے کر لیتا ہے۔ اسرے یقیناً معجزہ وخصائص نبوت سے ایک چیز ہے اور کفار نے جب صبح کو اس دعو
کو سنا ہوگا تو ضرور امتحاناً آنحضرت صلعم سے بیت المقدس کی اندرونی کیفیت وحالات دریافت کئے ہونگے جس کو ان
میں سے بعضوں نے اپنے سفر تجارت میں دیکھا ہوگا۔ اور آنحضرت کا صحیح جواب دینا اسرے کے ثبوت کے لئے کافی
رہا ہوگا۔ حدیث میں جو یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس آپ کے سامنے لاکھڑا کر دیا اور آپ اس کو دیکھ
جاتے تھے اور کفار کو جواب دیتے جاتے تھے۔ میرے خیال میں ایک مہمل سی بات ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ا
کے دعوے کا ثبوت نہ ہوتا۔

## معراج

مگر ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں نے اسرے اور رویا میں عجیب رنگ آمیزی کی ہے۔ پہلے میں انکی
روایتیں جو انسؓ سے مروی ہیں مسلم و بخاری سے نقل کرونگا۔ پھر ان پر عقل و قرآن و تاریخ سے تنقید
کروں گا۔ اسی حکایت سے معراج کا عقیدہ بنا ہے۔ جسکی تائید (بشرطیکہ اس کو حضرت عائشہ و معاویہ کیطرح رو
سے زیادہ نہ سمجھا جائے) نہ قرآن سے ہوتی ہے اور نہ علم سے اور نہ ہی وہ معجزہ ہے اسواسطے کہ معجزہ کے لئے شرط
ہے کہ بے ایمان اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر ایمان لائے۔ یہاں صرف ایک روایت وقول کی تصدیق وتکذیب کا
سوال کفار کے سامنے تھا اور اگر خدانخواستہ وہ اس روایت کو آنحضرتؐ کی زبانی سنتے تو آنحضرتؐ کے لئے کوئی صو
اس کے ثابت کرنے کی نہ ہوتی۔ اور کفار کو ایک اور موقعہ تضحیک کا ملتا۔ حالانکہ جب کفار نے اس قسم کی بیہود
فرمائش کی تو قرآن نے اس کا یہ جواب دیا ہے او ترقیٰ فی السماء ولن نؤمن لرقیک حتیٰ تنزل علینا کتبا
نقرؤہ قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا ۝ (۱۷/۹۴)

(یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھ جانے پر بھی ایمان نہ لاوینگے یہانتک کہ تو ہمارے پاس ایک
کتاب اُتار لائے (اسواسطے کہ تیرا چڑھنا شاید ہماری آنکھ کا شبہ ہو) جسکو ہم پڑھیں۔ اے پیغمبر کہدے کہ سبحا
اللہ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا ایک بشر ہوں) اور اسی واسطے علمائے اسلام کا قول صحیح ہے کہ اسرے کا انکار تو کفر
ہے کہ اسکا انکار قرآن کا انکار ہے مگر معراج کا انکار کفر نہیں ہے۔

انسؓ کے ذریعے سے بھی یہ روایتیں براہ راست نہیں ملی ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایک کے راوی ابوذرؓ او
دوسری کے مالک بن صعصعہ۔ میں ان تینوں روایتوں کو الگ الگ بیان کرونگا۔

جو روایت انسؓ سے ہے وہ اسطرح ہے:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے سامنے براق لایا گیا اور وہ ایک جانور ہے سفید رنگ کا

---

ط یہ بات بھی قابل نوٹ ہے کہ یہ آیت سورہ اسرے کی آیت ہے جس سے واقعہ معراج کی قرآنی تردید بہمہ وجوہ ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا۔ سم وہاں رکھتا ہے جہاں تک اُس کی نگاہ پہنچتی ہے۔ میں اس پر سوار ہوا اور بیت المقدس
تک آیا اور وہاں اس جانور کو حلقے سے باندھ دیا۔ جس سے اور پیغمبر اپنے جانوروں کو باندھا کرتے تھے پھر میں مسجد کے
اندر گیا اور دو رکعتیں نماز پڑھیں۔ بعد اس کے باہر نکلا تو جبرئیل دو برتن لے کر آئے۔ ایک میں شراب تھی اور ایک میں
دودھ۔ تو میں نے دودھ کو پسند کیا۔ جبرئیل نے کہا کہ تم نے فطرت کو اختیار کیا۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ آسمان پر
چڑھے تو فرشتوں سے کہا دروازہ کھولو۔ پوچھا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا جبرئیل۔ انھوں نے کہا تمہارے ساتھ اور کون
ہے۔ جبرئیل نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرشتوں نے [illegible]
دروازہ کھولا گیا ہمارے لیے اور ہم نے آدم علیہ السلام کو دیکھا۔ انھوں نے مرحبا کہا اور [illegible]
جبرئیل ہمارے ساتھ چڑھے دوسرے آسمان پر اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ انھوں نے کہا جبرئیل
فرشتوں نے کہا تمہارے ساتھ دوسرا شخص کون ہے۔ انھوں نے کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا ان کو حکم ہو چکا
بلانے کا۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے دونوں خالہ زاد بھائیوں کو دیکھا۔ عیسیٰ ابن مریم اور یحییٰ بن زکریا
انھوں نے کہا مرحبا اور میرے لیے دعا خیر کی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ تیسرے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھٹکھٹایا
فرشتوں نے کہا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا جبرئیل۔ فرشتوں نے کہا تمہارے ساتھ دوسرا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا محمد ہیں
فرشتوں نے کہا کیا ان کو پیغام دیا گیا تھا بلانے کا۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ [illegible] یوسف علیہ السلام
کو دیکھا۔ اللہ نے حسن کا آدھا حصہ ان کو دیا تھا۔ انھوں نے مرحبا کہا مجھ کو [illegible] دعا دی۔ پھر جبرئیل [illegible]
چوتھے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ [illegible]
محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلائے گئے ہیں۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا [illegible]
انھوں نے مرحبا کہا اور اچھی دعا مجھ کو دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے اٹھا لیا ادریس کو [illegible]
ہمارے ساتھ پانچویں آسمان پر چڑھے۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ [illegible] پوچھا [illegible]
محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے [illegible]
انھوں نے مرحبا کہا اور اچھی دعا دی۔ [illegible] آسمان پر [illegible]
نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا [illegible]
ہیں۔ کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا۔ تو میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ [illegible]
بیت المعمور کے طرف اور [illegible] فرشتے [illegible] جبرئیل ہم کو سدرۃ
المنتہیٰ کے پاس لے گئے۔ [illegible]
جس میں [illegible]

ہوگیا کہ کوئی مخلوق اس کی خوبصورتی کو بیان نہیں کر سکتا۔ پھر اللہ نے ڈالا میرے دل میں جو کچھ ڈالا۔ اور پچاس نمازیں
دن رات میں فرض کیں۔ جب میں وہاں سے اترا اور حضرت موسیٰ تک پہنچا تو اُنھوں نے پوچھا۔ تمھارے پروردگار نے
کیا فرض کیا تمھاری اُمت پر۔ میں نے کہا پچاس نمازیں فرض کیں۔ اُنھوں نے کہا پھر لوٹ جاؤ اپنے پروردگار کے
پاس اور عرض کیا اے پروردگار تخفیف کر میری اُمت پر۔ اللہ تعالےٰ نے پانچ نمازیں گھٹا دیں۔ میں لوٹ کر حضرت
موسیٰ کے پاس آیا اور کہا اللہ تعالےٰ نے مجھے پانچ نمازیں معاف کر دیں۔ اُنھوں نے کہا تمھاری اُمت کو اتنی طا
نہ ہوگی تم پھر جاؤ اپنے رب کے پاس۔ آپ نے فرمایا میں اس طرح برابر اپنے پروردگار اور حضرت موسیٰ کے بیچ
پھرا۔ یہانتک کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا اے محمد وہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن و رات میں اور ہر ایک نماز میں دس نماز
ثواب ہے۔ تو وہی پچاس نمازیں ہوئیں۔ اور جو کوئی شخص نیت کرے نیک کام کرنے کی پھر اُس کو نہ کرے تو اُس
ایک نیکی کا ثواب ملیگا اور جو کرے تو اس کو دس نیکیوں کا۔ اور جو شخص نیت کرے بُرائی کی پھر اُس کو نہ کرے تو کچھ
نہ لکھا جائے گا۔ اور اگر کر بیٹھے تو ایک ہی بُرائی لکھی جاویگی۔ آپ نے فرمایا۔ پھر میں اُترا اور حضرت موسیٰ علیہ السلا
کے پاس آیا۔ اُنھوں نے کہا پھر جاؤ اپنے پروردگار کے پاس اور تخفیف چاہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما
میں اپنے پروردگار کے پاس پھر پھر گیا۔ یہانتک کہ میں شرما گیا اس سے۔"

جو روایت حضرت انس نے ابوذر سے سنی ہے وہ اس طرح ہے:-

"میرے گھر کی چھت کھلی اور میں مکّہ میں تھا۔ پس جبرئیل نازل ہوئے اور اُنھوں نے میرے سینہ کو چاک کیا
اور اُسکو زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر ایک طشت سونے کا لائے جس میں حکمت اور ایمان بھرا ہوا تھا۔ اُسکو میرے
سینے میں ڈالکر بند کیا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑا اور آسمان دنیا کی طرف لیکر اُڑے اور جب آسمان دنیا پر پہنچے تو جبرئیل نے
داروغہ آسمان سے کہا کھولو۔ اس نے کہا کون ہے۔ اُنھوں نے کہا جبرئیل۔ کہا تمھارے ساتھ کوئی ہے؟ کہا ہاں مح
ہیں۔ پوچھا کیا وہ بھیجے گئے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ پس دروازہ کھلا۔ آپ نے فرمایا جب میں آسمان دنیا پر پہنچا تو
میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اُسکے داہنے طرف ایک گروہ ہے اور بائیں طرف ایک گروہ ہے اور جب وہ داہنے
طرف دیکھتا ہے تو ہنستا ہے اور جب بائیں طرف دیکھتا ہے تو روتا ہے۔ پھر اُس نے کہا مرحبا اے نبی صالح
ابن صالح۔ میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا آدم۔ اور جو گروہ اُن کے دائیں اور بائیں طرف
وہ اُنکی اولاد ہے۔ داہنے طرف کے گروہ اہل جنت ہیں اور بائیں طرف کے گروہ اہل نار۔ پس جب وہ داہنے طر
دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ پھر ہم جبرئیل کے ساتھ چڑھے دوسرے
آسمان پر اور داروغہ سے کہا کھولو۔ اُس نے بھی وہی سوال کیا جو پہلے داروغہ نے سوال کیا تھا۔ پھر کھولا۔ انس
مالک نے اسطرح ذکر کیا کہ آپ نے آسمانوں میں آدم و ادریس و عیسےٰ و موسیٰ و ابراہیم سے ملاقات کی۔ مگر یہ نہیں

کہ آپ کس طرح چڑھے۔ سوائے اس ذکر کے جو پہلے ہو چکا ہے۔ یا سوائے اس کے کہ آپ نے پہلے آسمان پر آدم کو دیکھا اور ساتویں آسمان پر ابراہیم علیہ السلام کو۔ پھر کہا۔ جب جبرئیل چلے اور ادریس کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے کہا مرحبا اے نبی صالح اور اخی صالح۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں۔ اُنھوں نے کہا یہ ادریس ہیں۔ پھر ہم چلے اور جب موسیٰ کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے کہا اے نبی صالح اور اخی صالح۔ میں نے کہا یہ کون ہیں؟ جبرئیل نے کہا یہ حضرت موسیٰ ہیں [illegible] حضرت عیسیٰ پر۔ پھر حضرت ابراہیم پر۔ اور اُنھوں نے کہا مرحبا اے نبی صالح اور اے ابن صالح۔ میں نے [illegible] ہیں۔ اُنھوں نے کہا ابراہیم ابن شہاب کہتے ہیں کہ ہم کو خبر کی ابن حزم نے کہ ابن عباس اور ابا حبۃ الانصاری [illegible] رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہم چڑھے اور اس مقام پر پہنچے کہ قلم کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ابن حزم اور انس [illegible] مالک نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں [illegible] میں اس فرض کو لیکر واپس لوٹا۔ یہانتک کہ جب حضرت موسیٰ کے پاس آیا تو اُنھوں نے پوچھا۔ تمھارے [illegible] نے کیا فرض کیا۔ میں نے کہا کہ پچاس وقت کی نمازیں۔ موسیٰ نے کہا اپنے رب کی طرف واپس [illegible] کہ تمھاری امت ان کی متحمل نہ ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔ پھر میں اپنے رب کی طرف واپس گیا۔ [illegible] فرضیں ہوئیں مگر ان کا ثواب پچاس کے برابر ہوگا۔ پھر میں موسیٰ کے پاس آیا۔ اُنھوں نے کہا [illegible] جاؤ۔ میں نے کہا۔ اب مجھے اپنے رب کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ [illegible] سدرۃ المنتہیٰ پر آیا۔ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی جسکا بیان نہیں ہو سکتا۔ [illegible] موتیوں کے محل ہیں اور اس کی مٹی مشک کی ہے۔

تیسری روایت جو مالک بن صعصعہ سے [illegible]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کعبہ میں غنودگی کی حالت میں تھا [illegible] تینوں آدمیوں میں سے ایک آدمی ہے۔ پھر مجھ کو اٹھایا اور ساتھ [illegible] جس میں آب زمزم تھا۔ اور میرے سینے کو کھولا [illegible] سے اوپر تک یعنی پیٹ سے سینے تک۔ اور میرے دل کو نکالا۔ اور اس کو زمزم سے دھو [illegible] ایمان وحکمت سے بھر دیا۔ پھر میرے لئے ایک سفید جانور [illegible] چھوٹا۔ اس کا قدم وہاں تک پڑتا تھا جہاں تک نظر جاتی تھی۔ پس مجھے اس پر سوار کرایا۔ [illegible] آسمان پر پہنچے۔ جبرئیل نے اسکو کھلوایا۔ پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل [illegible] وہ بلائے گئے۔ کہا اچھا [illegible] پاس آئے اور اس طرح قصہ بیان کیا [illegible]

Marfat.com

اور چوتھے پر حضرت ادریس۔ اور پانچویں پر حضرت ہارون یہاں تک کہ چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ کے پاس آئے۔ اُنھوں نے کہا اے نبی صالح اور اے اخی صالح مرحبا۔ پھر جب ہم چلے تو وہ رونے لگے۔ اور رو کر کہا اے رب یہ لڑکا میرے بعد مبعوث ہوا۔ اور اُس کی امت جنت میں میری اُمت سے زیادہ جائے گی۔ پھر ہم چلے یہاں تک کہ ہم ساتویں آسمان پہنچے اور ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے روایت میں بیان کیا کہ آپ نے وہاں چار نہریں دیکھیں۔ جن میں دو کا سوتا باہر تھا۔ اور دو کا اندر۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کون سی نہریں ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا جو نہریں اندر کو جاتی ہیں وہ جنت کی نہریں ہیں اور جو باہر کی ہیں وہ فرات و نیل ہیں۔ پھر ہم اُٹھائے گئے بیت المعمور کی طرف میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا یہ بیت المعمور ہے۔ ہر روز ستر ہزار ملائکہ اس میں داخل ہوتے ہیں جو پھر اس میں سے باہر نہیں آتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میرے پاس دو برتن لائے گئے ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ۔ پس میں نے دودھ اختیار کیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ تمھاری امت کو اللہ تعالیٰ نے فطرت پر اُٹھایا ہے۔ پھر مجھ پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے"۔

## یہ روائتیں کس زمانے میں شروع ہوئیں

بنی اُمیہ کے زمانے میں یہ روائتیں پیدا نہیں ہوئیں۔ یوحنا نحوی دمشقی جو عبدالملک کے زمانے میں تھا۔ اس نے مسلمانوں سے بہت سے مناظرے کئے ہیں اور اُس کے مناظرے و مباحثے کی کتاب یورپ اور بیروت میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں اسرے کا ذکر تو ہے۔ مگر معراج کا کوئی ذکر نہیں۔ امام مالک کو بھی اس روایت کی کوئی خبر نہ تھی اور نہ اُن کی کتاب موطا میں اسکا ذکر ہے اور نہ اوقات صلوٰۃ کے باب میں اُنھوں نے روایت کے اس حصے سے اعتنا کیا ہے جس میں پچاس وقت سے پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی۔ حالانکہ شہاب زہری کی روائتیں زیادہ تر اُنھیں کے ذریعہ سے بعد کو محدثین کو ملی تھیں۔ یہ روائتیں یقیناً اس زمانے کی ہیں جبکہ خلفائے عباسیہ کے دربار کی شان و شوکت میں عجم کے طریق و آداب کا دخل ہو گیا تھا۔ بار میں سات آٹھ حاجب مقرر ہوتے تھے اور خلیفہ تک پہنچنے کے لئے کئی اور منازل طے کرنے پڑتے تھے۔ راوی کا تخیل اس عباسیہ کے شان و حشم سے متاثر تھا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ اور مجوس کے ساتھ رہنے سے اس بات کا بھی علم کافی ہو گیا تھا کہ ان مذاہب میں ہر اُمت نے اپنے نبی کو آسمان پر چڑھایا ہے۔ پھر جب حضرت موسیٰ و الیاس۔ حضرت ابراہیم۔ حضرت عیسیٰ حتیٰ کہ زردشت و مانی آسمان پر چڑھ گئے تو رسول اللہ صلعم کو آسمان پر چڑھنے کا ان سے زیادہ حق تھا۔ ورنہ آپ کی فضیلت میں ایک جزو کسر رہ جائے گی۔ اس لئے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ دوسرے مذاہب میں معراج کے قصے کس طرح بیان ہوئے ہیں اور اس سے ہم کو پتہ چل سکے گا کہ ان روایتوں کے محرک کون سے قصص ہوئے۔

# حضرت ابراہیم[1] کی معراج

یہودیوں کے اپاکریفہ میں ایک کتاب ہے "عہد نامہ ابراہیم" اس میں حضرت ابراہیم کی معراج کا قصہ یوں ہے :-

"حضرت میکائیل نے عرابہ ([illegible]) کو موڑا اور ابراہیم کو مشرق کی طرف اڑا کر پہلے آسمان کے دروازے پر لے گئے حضرت ابراہیم نے وہاں دو دروازے دیکھے ۔ ایک چوڑا اور دوسرا تنگ ۔ اور دروازے کے باہر ایک شخص کو دیکھا جو ایک سونے کے تخت پر بیٹھا تھا ۔ اُس کی شکل ہیبت ناک تھی ۔ جیسے کہ خدائے تعالیٰ کی ۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ فرشتے بہت سی ارواح کو سیدھے دروازے سے لیجا رہے ہیں ۔ اور کچھ ارواح ایسی ہیں جو تنگ دروازے سے گھسیٹی جا رہی ہیں اور جب اس عجیب و غریب شخص نے دیکھا کہ تھوڑی سی ارواح تنگ دروازے سے جا رہی ہیں اور بہت سی ارواح چوڑے دروازے سے تو اُس نے اپنی ڈاڑھی کے بال کو پکڑ لیا اور اپنے کو زمین پر گرا دیا ۔ روتا اور آہ و بکا کرتا ہوا اور جب وہ دیکھتا کہ بہت سی ارواح تنگ دروازے سے داخل ہو رہی ہیں وہ خوش و خرم ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا ۔ حضرت ابراہیم نے میکائیل سے پوچھا ۔ اے حضرت رئیس الملائک یہ کون عجیب شخص ہے جو اس شان و شوکت سے بیٹھا ہے اور جو کبھی روتا ہے اور کبھی ہنستا ہے ۔ فرشتے نے کہا یہ آدم ہیں جو سب سے پہلے پیدا کئے گئے اور وہ دنیا کو دیکھتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ تنگ دروازے سے داخل ہوتے ہیں تو وہ ہنسی خوشی اُٹھ کر تخت پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ کیونکہ تنگ راستہ نیک لوگوں کا ہے ۔ جو راستہ ابدی زندگی کو لے جاتا ہے اور بہشت کو اور اس واسطے حضرت آدم کو خوشی ہوتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ بہت سی ارواح چوڑے دروازے سے داخل ہو رہی ہیں ۔ تب وہ اپنی ڈاڑھی نوچتے لگتے ہیں اور فریاد و واویلا کرتے ہیں ۔ کیونکہ چوڑا دروازہ گنہگاروں کا ہے جو جہنم اور تباہی کی طرف جاتا ہے :"

# حضرت انوش کی معراج

اسی طرح یہودیوں میں ایک کتاب "صحیفہ انوش" ہے ۔ اس میں انوش کی معراج کا قصہ اور ساتوں آسمانوں کی سیر کو اسی شد و مد سے بیان کیا گیا ہے جیسا ان حدیث کی روایتوں میں ہے ۔ (دیکھو کتاب Morfill & Charles The Book Of The Secret Of Enoch کا باب ۲۲ و ۳۰) اور جو جگہ کی تنگی کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے ۔

# حضرت الیاس و مسیح کی معراج

بائبل کے مطالعہ سے واضح ہے کہ حضرت الیاس ایک آتشی گاڑی میں سوار ہو کر اور حضرت مسیح ہوا میں اڑ کر آسمان

---

[1] دوسرے مذاہب میں معراج کا ذکر کلیر ٹسڈال کی کتاب "ینابیع القرآن" سے ماخوذ ہے ۔

Marfat.com

پر چلے گئے اور لوگ اُن کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

## ارتاویراف کی معراج

اسی طرح مجوس میں ایک کتاب ہے جو اردشیر بابکاں کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ اس کا نام "نامۂ ارتاویراف" ہے اس میں مرقوم ہے کہ جب مذہب زردشت کا اثر عوام پر کم ہوگیا تو موبدان مجوس نے ایک شخص کو تیار کیا جو آسمان پر جاکر وہاں سے خبر لائے کہ کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک موبد نوجوان کو جس کی پارسائی پر اطمینان تھا۔ آسمان پر بھیجنے کے لئے تیار کیا گیا۔ یہ شخص سروش یعنی ملائکہ کی مدد سے آسمان پر گیا۔ اور ایک آسمان سے چڑھ کر دوسرے آسمان پر گیا یہاں تک کہ ارمزد کے سامنے پہنچا اور اُس نے اپنی سیر میں جو کچھ دیکھا اُس کو آکر بیان کیا۔ پہلے وہ ستاروں کے آسمان پر چڑھا۔ پھر چاند کے پھر سورج کے۔ اس کتاب کے بعض اقتباسات یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔ اسواسطے کہ عباسیوں کے زمانے میں مجوس کا اثر عربوں میں سب سے زیادہ رہا ہے:-

"میں نے پہلی چھلانگ ستاروں کے آسمان پر ماری۔ میں نے وہاں پارساؤں کی ارواحیں دیکھیں جن سے روشنی ایسے پھوٹ رہی تھی جیسے روشن ستاروں سے۔ اور وہاں ایک تخت تھا بہت روشن اور بلند۔ پھر میں نے سروش اور ملائکہ اذر سے دریافت کیا یہ کون جگہ ہے اور یہ کون لوگ ہیں ..... وغیرہ

پھر آخر میں اپنے تخت زریں سے سردار ملائکہ بہمن اُٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر "ھمات"۔ "ھخات" "حراست" (مجوس کے بہشتی درجوں کے نام) میں سے لاکر ارمزد اور اس کے ملائک کے اور فرشتوں اور زردشت کی رُوح کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ ارمزد ہے اور میں نے چاہا کہ اس کا آداب بجالاؤں۔ ارمزد نے کہا۔ مرحبا۔ تو ایک فانی دنیا سے ابدی دنیا میں آیا۔ پھر اُس نے سروش کو حکم دیا کہ ارتاویراف کو عرش کے تمام عجائبات دکھلائے جائیں۔ اور نیکوں کو جو جزا مل رہی ہے اس کو اور بدوں کو جو سزا مل رہی ہے اس کو ..... وغیرہ

معراج کا قصہ ہندوؤں میں بھی ہے۔ جب ارجن اندر دیوتا کو ملنے آسمان پر گئے تھے۔ مگر ہم کو اس سے یہاں مطلب نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوؤں کی صحبت کا اثر عربوں پر کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس تاریخی تنقید سے یہ پتہ چلتا ہے کہ "تا نہ باشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا"۔ مسلمانوں میں معراج کی روایت کی ابتدا کیونکر ہوئی اور اس کی بنیاد کیا تھی۔

اب ان روائتوں پر مختلف حیثیت سے تنقید کرنا ہے۔

## تنقید اسناد

ان روائتوں کی اسناد حسب ذیل ہیں:-

روایت نمبر ۱ (بخاری) اللیث عن یونس عن ابن شہاب زہری عن انس بن مالک

Marfat.com

(مسلم) شیبان بن فرھاد ثنا حماد بن سلمہ ثنا ثابت البنانی عن انس بن مالک

روایت نمبر ۲ (مسلم) حرملہ بن یحییٰ عن یونس عن ابن شہاب عن انس بن مالک عن ابی ذر

(بخاری) کوئی نہیں۔

روایت نمبر ۳ (مسلم) محمد بن مثنیٰ عن ابن عدی عن سعید عن قتادہ عن انس بن مالک لعلہ قال عن مالک بن صعصعہ

(بخاری) ھدیہ بن خالد عن ھمام بن یحییٰ عن قتادہ عن انس بن مالک عن مالک بن صعصعہ

حدیثوں میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ متن روایات میں مختلف حدیثوں کی کتابوں میں ایک نقطے کا فرق نہ ہوگا۔ مگر سند میں مختلف لوگوں سے وہی روایت بیان ہو جاتی ہے۔ اور جب متن کا اختلاف ہوتا ہے تو ہر حدیث کی کتاب میں وہی اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر اس اختلاف کو ایک ہی سلسلہ راوی سے بیان نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہر محدث اپنے لیے ایک نئی سند اختیار کر لیتا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہوا کہ یا تو تمام راوی ایک روایت کو ایک جگہ سے لیکر حفظ کر لیتے تھے۔ اور یا ایک روایت بلا سند کے لکھ لی جاتی اور ہر ایک شخص اس خزانہ عامرہ سے روایت نکال کر حسب پسند ایک سلسلہ راوی کا اختیار کر لیتا۔ ہم ان احادیث کے زیریں سلسلہ سند پر اسلئے نظر نہیں ڈالتے۔ کیونکہ اس سند کا اور ان ناموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ اصل منبع سے روایت کیونکر بیان ہوئی ہے اور کہاں تک اس کی اصلیت ہے۔ ان حدیثوں میں جہاں اختلاف نہیں ہے وہ حضرت انس اور ان کے اوپر کے درجوں کا ہے۔ یعنی ان احادیث سے ظاہر ہے کہ ان روایتوں کے بیان کرنے والے انس ہیں۔ پہلی روایت کے متعلق جو صرف انس سے مروی ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت انس نے اس قصہ کو کب اور کس سے سنا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تو یا تو اسکو معراج کی شب کے دوسرے روز سنا ہوگا جبکہ آنحضرت نے اس کا اظہار قریش کے سامنے کیا یا آپ نے اس روایت کو آخر زمانہ میں بیان کیا۔ پہلی صورت میں انس کا سننا ناممکن ہے کیونکہ انس کو اُن کی والدہ اُم سلیم جب آنحضرت کی خدمت میں مدینہ میں لیکر حاضر ہوئی تھیں تو وہ ایک طفل صغیر السن تھے۔ یعنی اُن کی عمر سات سال کی تھی۔ کیونکہ آنحضرت کی رحلت کے وقت اُن کی عمر ۱۰ اور ۱۵ سال کے درمیان تھی۔ حضرت انس اسوقت مکہ میں موجود نہ تھے اگر اُنھوں نے اس کا تذکرہ بعد کو رسول اللہ صلعم کی زبانی مدینہ میں سنا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت کو آنحضرت نے مجمع میں بیان کیا یا انس کے کان میں کہا۔ اگر آپ نے مجمع میں بیان کیا تو کیا وجہ ہے کہ کسی اور صحابی سے یہ روایت اس طرح مروی نہیں۔ حالانکہ آنحضرت کے صحابی انس سے زیادہ ذی شعور اسوقت موجود ہونگے۔ اگر انس کے کان میں کہا تو کیوں۔ کیا اسلئے کہ وہ ایک خورد سال بچے تھے اور ان کو بہلانے کیلئے ایک عجیب و غریب قصہ نفس کے حضور پر آنحضرت نے بیان کیا۔ مگر ایسا قیاس صحیح نہیں اور نہ ایسے قصے کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے۔ اس نکتہ کو غالباً محدثین

Marfat.com

نے بھی ٹٹولا ہے۔ کیونکہ دوسری روایتوں میں روایت تھوڑی سی بدل کر اس کو ابوذر اور مالک بن صعصعہ کے نام حضرت انس کے توسط سے لگا دی جاتی ہے۔

حضرت ابوذر ایسے صحابی نہیں جن کو تابعین نے نہ دیکھا ہو۔ وہ تو معاویہ کے وقت میں بھی تھے اور اُن سے براہ راست کثیر روایتیں صحاح میں ہیں۔ پھر کیوں اس خاص روایت کو ایک دوسرے صحابی کے ذریعے سے بیان کیا جاتا ہے۔ جن کا زمانہ وہی تھا جو پہلے صحابی کا۔ حضرت ابوذر سے جو روایتیں براہ راست تابعین کو ملی ہیں۔ ان میں کوئی روایت معراج کی نہیں ہے۔ بجز اسقدر کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ آپ نے پروردگار کو دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ تو نور ہے۔ میں اسکو کیسے دیکھتا۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے ایک نور دیکھا۔"

مالک بن صعصعہ اگر وہی صاحب ہیں جنھوں نے ابوسعید خدری کی گود میں پرورش پائی تھی اور جو ایک انصاری ہیں تو اُن کا آنحضرتؐ سے براہ راست سننا اور پھر اس کی روایت حضرت انس سے کرنا اور بھی بعید ہے۔ مالک بن صعصعہ کی اپنی کوئی روایت حدیث میں نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آنحضرت سے کسی صحابی کا ایسی روایت سننا پایہ تحقیق کو نہیں پہنچا اور یہ قیاس اس سے اور بھی قوی ہوجاتا ہے کہ ابن عباس۔ ابوہریرہ و حضرت عائشہ جو روایات حدیث کے اصل ماخذ ہیں اُن میں سے کسی صاحب نے اس روایت کی تائید نہیں کی ہے۔ حالانکہ اگر اس روایت کا عام چرچا نہیں رہا ہوتا تو یہ اصحاب اس کا ضرور تذکرہ کرتے۔ حضرت عائشہ اور معاویہ کو تو سرے سے جسمانی معراج ہی سے انکار ہے۔ حضرت ابوہریرہ آنحضرت کا انبیاء سے مناسبت المقدس میں بتاتے ہیں۔ جیسا اُنکی اس روایت میں ہے۔

"رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں نے اپنے تئیں دیکھا حطیم میں اور قریش مجھ سے میری سیر کا حال پوچھ رہے تھے۔ اُنھوں نے بیت المقدس کی کئی چیزیں پوچھیں جن کو میں بیان نہ کرسکا۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ اور ایسا رنج کبھی نہیں ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو اُٹھا کر میرے سامنے کردیا۔ میں اُس کو دیکھنے لگا۔ اب جو بات وہ پوچھتے تھے میں بتا دیتا تھا اور میں نے اپنے تئیں پیغمبروں کی جماعت میں پایا۔ دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک شخص ہیں میانہ تن و توش اور گٹھے ہوئے جسم کے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور دیکھا عیسیٰ ابن مریم کو۔ وہ بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مشابہ ان سے میں عروہ بن مسعود ثقفی کو پاتا ہوں۔ اور دیکھا تو حضرت ابراہیم نماز پڑھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مشابہ ان کے تمھارے صاحب ہیں۔ آپ نے اپنے تئیں فرمایا۔ پھر نماز کا وقت آیا تو میں نے امامت کی اور سب پیغمبروں نے میرے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر جب میں نماز سے فارغ ہوا تو ایک بولنے والا بولا۔ اے محمد یہ مالک ہے۔ اسکو سلام کرو۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے خود ہی سلام کیا۔ دوسری روایت میں ہے "میں موسیٰ علیہ السلام سے ملا۔ پھر آپ نے اُن کی صورت بیان کی۔ میں خیال کرتا ہوں آپ نے یوں فرمایا وہ لمبے چھریرے تھے یا پٹھے گوشت سیدھے بال والے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور فرمایا کہ میں عیسیٰ علیہ السلام

Marfat.com

سے ملا۔ پھر آپ نے ان کی صورت بیان کی۔ وہ میانہ قد تھے۔ سرخ رنگ جیسے ابھی کوئی حمام[1] سے نکلا ہو۔ آپ نے فرمایا میں ابراہیم علیہ السلام سے ملا۔ تو میں اُن کی اولاد میں سب سے زیادہ مشابہ ہوں۔ آپ نے فرمایا میرے پاس دو برتن لائے گئے۔ ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب اور مجھ سے کہا گیا کہ جسکو چاہو پسند کرو۔ میں نے دودھ کا برتن لے لیا۔ فرشتے نے کہا کہ تم کو راہ ملی فطرت کی اور جو تم شراب اختیار کرتے تو تمھاری اُمت گمراہ ہو جاتی:

حضرت ابن عباس کی روایت یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلعم وادی ازرق پر گزرے تو پوچھا کونسی وادی ہے۔ لوگوں نے کہا وادی ازرق۔ آپ نے فرمایا گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں اور وہ اُتر رہے ہیں پہاڑ سے اور آواز سے لبیک پکار رہے ہیں۔ پھر آپ ہرشا (ایک پہاڑ کا نام شام اور مدینے کے راستے پر [illegible]ہ کے قریب) کی چوٹی پر آئے۔ آپ نے پوچھا کونسی ٹیکری ہے لوگوں نے کہا ہرشا کی ٹیکری ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں یونس کو وہ ایک سرخ اونٹنی لمبی ہونی پر سوار ہیں اور ایک جبہ پہنے ہیں بالوں کا اور وہ لبیک کہہ رہے ہیں۔"

دوسری روایت یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے معراج ہوئی۔ میں موسیٰ بن عمران پر گزرا۔ وہ ایک لمبے آدمی تھے گھونگروالے بال جیسے شنوءہ کے آدمی ہوتے ہیں اور میں نے دیکھا عیسیٰ بن مریم کو وہ میانہ قد تھے اور رنگ اُن کا سُرخ و سفید تھا۔ اور بال اُن کے سیدھے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے اور بیان کیا مالک داروغہ دوزخ کا اور ذکر کیا دجال کا۔"

## تنقید متن

حدیث میں جسقدر روایتیں اسریٰ اور معراج کی ہیں ان میں آپس میں اسقدر اختلاف ہے۔ شاید ہی کسی اور روایت حدیث میں اسطرح ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس واعظ کے منہ میں جو کچھ آیا اُس نے بیان کر دیا۔

جن تین روایتوں کو میں نے نقل کیا ہے۔ ان میں اختلاف تو بجائے خود رہا۔ قرآن کے تین مختلف مقامات کی آیتوں کو جو مختلف زمانوں میں نازل ہوئی تھیں اور جن کے شان نزول و تفسیر سے تعلق حدیث میں [illegible] وہ اس روایت میں ایک واقعہ کے اندر ختم کر دی گئی ہیں۔ یعنی اسریٰ کی آیت۔ سورہ [illegible] میں الم نشرح اور سورہ النجم کی تفسیر دی ہوئی ہے۔ اس میں صاف صاف یہ تصریح کر دی گئی ہے۔ [illegible]

---

[1] حمام کا ذکر قابل نوٹ ہے۔ اس کا رواج عربوں میں عباسیوں کے زمانے میں ہوا ہے۔ عرب کے لوگ آنحضرت کے زمانے میں اس سے واقف نہ تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیثیں کس زمانے میں وضع ہوئی تھیں۔

Marfat.com

روایت حدیث) اس زمانے کا واقعہ ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچوں میں کھیل رہے تھے۔ سورۂ النجم میں آ
جبرئیل کو دیکھنا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ وہ آپ کی ایک ابتدائی کیفیت وحی کا قصہ ہے۔ اور اسرے تو اس زما
واقعہ ہے جبکہ آپ مدینے کی طرف ہجرت کی تیاری کر چکے تھے۔ مگر حدیث میں معراج کی جو روایت حضرت انس
مروی ہے۔ اس میں ایک میں اسرے کا قصہ شامل کر لیا گیا ہے۔ دوسری روایت جو ابوذر سے ہے اس میں اسرے
بالکل اڑا دیا گیا ہے۔ اور اس کے بجائے شرح صدر کا واقعہ رکھ دیا۔ اور تینوں روایتوں میں النجم کی اس تف
سے غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے جس کے شان نزول میں خود حدیث میں اختلاف ہے۔ یعنی تینوں روایتوں کو اگر سا
پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) آنحضرتؐ براق پر سوار ہو کر پہلے بیت المقدس گئے اور وہاں سے آسمان پر (پہلی روایت)
(۲) آنحضرتؐ کو جبرئیل براہ راست آسمان پر اٹھا لے گئے چھت کھول کر (دوسری روایت)
(۳) آنحضرتؐ کو باہر بلا کر شق صدر کیا۔ پھر براق پر سوار کرا کر آسمان پر لے گئے (تیسری روایت)

پھر

(۱) آپ کو دودھ اور شراب کا پیالہ بیت المقدس میں دیا جاتا ہے۔
(۲) کہیں نہیں دیا جاتا۔
(۳) جب آپ خدا کے پاس پہنچتے ہیں۔

پھر

(۱) جبرئیل آنحضرت کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس لے گئے۔ اس کے پتے اتنے بڑے ہیں جیسے ہاتھی کے کان۔ اور
اس کے بعد خدا سے ملاقات ہوئی۔ اور نمازیں فرض ہوئیں۔
(۲) آنحضرت اس مقام پر پہنچے کہ قلم (تقدیر) کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر خدا کے پاس آئے اور نمازیں
فرض ہوئیں۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ میں گئے۔ پھر جنت میں۔
(۳) اس مقام پر پہنچے جہاں چار نہریں بہہ رہی تھیں۔ فرات اور نیل اور دو بہشت کے اندر۔ پھر وہاں سے بیت المعم
پہنچے جس میں ہر روز ستر ہزار ملائکہ داخل ہوتے ہیں جو واپس نہیں آتے پھر نمازیں فرض ہوئیں۔

یہ اختلاف صرف ایک انسؓ کی تین روایتوں میں ہے۔ دیگر چہ رسد۔ واقع یہ ہے کہ جس نے اس روایت کو گڑھ
ہے یا تو وہ حد درجہ فاتر العقل اور بیوقوف تھا اور یا ایک مکار زندیق تھا جو اسرے قرآن کا مذاق اڑانے کے لئے ٹھیک
وہی بات کر رہا ہے جو ہمارے زمانے کے مشنری عیسائی کر رہے ہیں۔ یعنی جس طرح وہ لوگ معجزۂ شق القمر کا مذاق اڑانے
کیلئے ایسی بیہودہ روایت شامل کر دیا کرتے ہیں کہ چاند جب پھٹ گیا تو اس کا آدھا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

آستین میں داخل ہو کر پاجامہ کی راہ سے نکل گیا اور جا کر دوسرے ٹکڑے سے مل گیا۔ (نعوذ باللہ) ایسے ہی کسی پاجی زندیق نے اسری قرآن کا مذاق اُڑانے کے لئے ان فضول روایتوں کو ملا دیا۔ یہ قیاس تین باتوں سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اوّل تو زندیقوں میں اس قسم کے خرافات پہلے سے تھے۔ جیسا "ارتا ویراف نامک" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے پچاس وقت کی نماز کا ذکر کرکے یہ دکھلایا کہ مسلمانوں کا خدا عجیب بے عقل خدا ہے کہ پچاس وقت کی نماز فرض کرکے وہ انسان سے خلاف فطرت کام کی توقع رکھتا ہے جو وہ کبھی نہ کر سکیں گے کیونکہ انسان نماز پڑھنے کی مشین نہیں ہے۔ اور پھر ایسا خدا کہ غلطی بتلانے پر اسکو کم کرتے کرتے پانچ پر لیجاتا ہے اور یہ پانچ وقت (جو دراصل مجوس کے اوقات نماز تھے) [illegible] یہ روایت کہاں سے آئی۔ تیسرے اس کے زعم باطل میں نعوذ باللہ آنحضرت کا سینہ مبارک صفائی کا [illegible] شرح صدر کی کس درجہ بیہودہ تاویل کر رہا ہے۔ اور اگر یہ کسی بیوقوف واعظ کا قول ہے تو ہم کو مسلمانوں کو [illegible] چاہئے کہ وہ شخص اتنا بڑا بیوقوف ہے کہ خود اپنے قرآن سے واقف نہیں۔ اور علم کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ اسپر وہی نادان دوست کی مثل صادق آتی ہے۔ اسکو معلوم نہیں کہ خدا خود قرآن میں فرماتا ہے کہ ملائکہ بھی اس کے پاس پچاس ہزار سال کے اندر بھی پہنچ نہیں پاتے تعرج الملائکة والروح الیه فی یوم کان مقداره خمسین الف سنة جب روح اور فرشتوں کا یہ حال ہے تو انسانی پیکر کا کوئی سوال ہی نہیں۔ خود سائنس ہی کا یہ قول ہے کہ زمین پر سب سے قریب ستارے کی روشنی ہزاروں برس کے بعد پہنچتی ہے۔ آنحضرت اگر مجسم روح و نور ہوتے تب بھی آسمان پر ان کا گزر قرآن کے رو سے زندگی میں محال تھا اور یہ شخص خدا کی نسبت وہی تخیل رکھتا ہے جو ایک مسند نشین خلیفہ بغداد کا تھا۔ اور آسمان [illegible] جیسے محل شاہی کہ اس پر حاجب و دربان مقرر ہیں۔ پھر یہ شخص یہ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد آدمی عالم برزخ میں رہتا ہے [illegible] کی ڈیوٹی آسمان کے طبقات پر لگائی جاتی ہے۔ اور خدا آسمان پر بیٹھا ہوا بھی نہیں ہے۔ آسمان خود ایک [illegible] اور اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ہمارے سر کے اوپر دکھائی دے حتیٰ کہ بادل بھی سموات میں داخل ہیں۔ اور سماء درحقیقت بقول سائنس خلائے محیط ہے۔ اور زمین سے دس میل اوپر انسانی جسم کا قائم رہنا یا جانا قطعی ناممکن ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے۔ اللہ نور السموات والارض۔ وہ لامکان نور ہے جس کو زندگی میں کوئی بشر نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ اس سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اس بیوقوف واعظ کو اسلام کے اس صریح عقیدے کی بھی خبر نہیں ہے۔ اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ قرآن میں نمازیں شروع سے اوقات کے تعین سے فرض ہوگئی تھیں جیسا متعدد سورتوں میں بصراحت موجود ہیں۔ اسنے یہود میں کی بہشت و انہار کو اسلامی بہشت سمجھ لیا ہے اور نیل اور فرات کا سوتا ایسے مقام پر بتا رہا ہے جو [illegible] غلط اور خود والے خرافات یہود کے اسکی تائید جغرافیہ سے نہیں ہوتی۔ قرآن تو علیحدہ رہا۔

# قتل مرتد

میرا دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ مذاہب و تاریخ کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد کر رہا ہوں کہ دنیا میں کسی قانون
شریعت نے مرتد یا مخالف مذہب کے لئے کوئی جگہ بجز قتل کے نہیں رکھی یہ صرف قرآن تھا جس نے دنیائے مذہ
میں سب سے پہلے مذہبی رواداری کا سبق سکھایا اور اس طرح مذہب کا بالکل ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ قرآن ہی کا
تھا کہ عبدالملک کے دربار میں یوحنا نحوی دمشقی اور مامون رشید کے دربار میں الکندی اپنے مذہب کی حمایت میں مسلمانو
سے مناظرہ کرتے ہیں اور برملا مسلمانوں کے مذہب پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور انکا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ اکثر لوگوں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ارتداد اختیار کیا جن میں سے ایک مثال عبداللہ بن جحش کی ہے جو حبش میں
جاکر نصرانی ہوگئے تھے مگر اُن سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اگر قرآن کے بعد کسی قوم نے اسکی تقلید کی ہے تو وہ ہمارے
ہندستان کی برٹش گورنمنٹ ہے مگر وہ ایک سیاسی مصلحت کا نتیجہ ہے نہ کسی مذہبی امر کے ماتحت۔ ورنہ خود انگلستان میں
ابھی سو برس کی بات ہے کہ رومن کیتھولک مذہب پر سختی ہوتی تھی۔ اور اسکاٹلینڈ کے رہنے والے ایک شخص کو صرف
اسقدر کہہ دینے پر کہ محمد کی شریعت مسیح کے اقوال سے بہتر ہے پھانسی کی سزا دی گئی۔ قرآن کی اس رواداری کا نتیجہ تھا
کہ مسلمانوں نے جہاں جبر و قتی سلطنت سالہا سال کی ہے وہاں غیر مذاہب کی تعداد ضرورت سے زیادہ باقی رہ گئی ہے
صرف ہندستان میں دیکھ لو اور اسی کے مقابل اسی ہندستان میں پرتگال والوں کی کالونی گوا کا حال دیکھو کہ اُنھوں
نے ایک ہندو کو بھی اپنی کمزور و محدود سلطنت میں باقی نہ چھوڑا۔ اور جس ہندو نے بپتسمہ لینے سے انکار کیا اُسکو سمندر
میں غرقابی کا بپتسمہ دیا گیا۔

میں قرآن مجید کی چند آیتیں جا بجا سے نقل کرونگا۔ جن سے یہ قطعی ثابت ہوجائے گا کہ قرآن کے رُو سے
ایک شخص اپنے مذہبی اعتقاد کے لئے صرف خدا کا مسئول و جواب دہ ہے۔ اور کسی بندے کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ
ایسے لوگوں کو ستائے یا عذاب دے جبتک کہ وہ قوم میں فتنہ و شر کا باعث نہ ہو۔

۱۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ
مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۭ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

کہدو۔ اے کفارو ہم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرتے
جس کی ہم عبادت کرتے ہیں۔ اور نہ ہم اُن کی عبادت کرینگے جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم ہی اسکی عبادت

وگے جس کی ہم عبادت کیا کرتے ہیں۔ تمہارا دین تمہارے لئے اور ہمارا دین ہمارے لئے۔

۲۔ یاَیُّھا الّذین اٰمنوا علیکم انفسکم ج لا یضرّکم من ضلّ اذا اھتدیتم ط الی اللہ مرجعکم جمیعاً فینبّئکم بما کنتم تعملون ۰ (پ)

اے ایمان والو۔ تم اپنی خبر لو دوسروں کا بھٹکنا تم کو نقصان نہ پہنچائیگا اگر تم راہ راست پر ہو اور تم سبھوں کو اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے پس اسوقت جو جو تمہارے اعمال ہیں تم کو بتا دئے جائیں گے۔

۳۔ ولا تطرد الّذین یدعون ربّھم بالغداوۃ والعشیّ یریدون وجھہٗ ما علیک من حسابھم من شیءٍ وّما من حسابک علیھم من شیءٍ فتطردھم فتکون من الظّٰلمین ۰ (پ)

اور جو لوگ صبح و شام خدا کی عبادت (اپنے طور پر) کرتے ہیں۔ اور جس سے اُنکی غرض خدا کی خوشنودی ہے ان کی سرزنش نہ کرو۔ اُن کے اعمال کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور نہ تمہارے اعمال کی ذمہ داری اُن پر ہے اگر تم ان کی سرزنش کروگے تو تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔

۴۔ وما علی الّذین یتّقون من حسابھم من شیءٍ وّلکن ذکری لعلّھم یتّقون ۰ وذر الّذین اتّخذوا دینھم لعباً وّلھواً وّغرّتھم الحیٰوۃ الدّنیا وذکّر بہٖ ان تبسل نفسٌ بما کسبت ق لیس لھا من دون اللہ ولیٌّ وّلا شفیعٌ ج وان تعدل کلّ عدلٍ لا یؤخذ منھا اُولٰئک الّذین ابسلوا بما کسبوا لھم شرابٌ من حمیمٍ وّعذابٌ الیمٌ بما کانوا یکفرون ۰ (پ)

اور اُن کے بُرے کاموں کی ذمہ داری اُن پر نہ ہوگی جو نیک ہیں لیکن اُن کو نصیحت کرنا چاہئے شاید وہ اپنی بُرائی سے باز آجاویں۔ اور جن لوگوں نے اپنے مذہب کو ایک کھیل بنا رکھا ہے اور جن کو دنیاوی زندگی نے مغرور کر دیا ہے اُن کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ہاں اُنکو سمجھاؤ ایسا نہ ہو کہ اُن کے بُرے اعمال اُنکی بربادی کا سبب ہوں کیونکہ سوائے خدا کے اُنکا کوئی شفیع و وکیل نہ ہوگا۔ اور جو لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے تباہ ہونگے اُن کو گرم پانی پینا ہوگا۔ اور اپنی بے ایمانی کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا ہونگے۔

۵۔ انّآ انزلنا علیک الکتٰب للنّاس بالحقّ ج فمن اھتدیٰ فلنفسہٖ ج ومن ضلّ فانّما یضلّ علیھا ج وما انت علیھم بوکیلٍ ۰ (پ)

ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے سچائی کے ساتھ انسانوں کی ہدایت کے لئے پس جس نے ہدایت پائی۔ اس سے اُسی کی ذات کو فائدہ ہے اور جو گمراہی میں پڑا اُسکا وبال اس کے سر اور تم اُن لوگوں کے مختار نہیں ہو۔

۶۔ قل یٰقوم اعملوا علیٰ مکانتکم انّی عاملٌ ج فسوف تعلمون لا من تکون لہٗ عاقبۃ الدّار ط انّہٗ لا یفلح الظّٰلمون ۰ (پ)

Marfat.com

کہدولے قوم تم اپنے مقدور بھر کام کرو اور ہم اپنے مقدور بھر کام کرتے ہیں۔ تم کو جلد معلوم ہو جائیگا کہ آخر
کس کا ٹھکانہ اچھا ہے یقیناً ظالموں کے لئے کوئی فلاح نہیں ہے۔

٧۔ اُدع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ؕ ان ربک ھو
بمن ضل عن سبیلہٖ وھو اعلم بالمھتدین ؕ وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہٖ ؕ ولئن صبرتم لھو خ
للصٰبرین ؕ واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون ؕ ان اللّٰ
الذین اتقوا والذین ھم محسنون ۝ (۱۴/۲۲)

اور خدا کی راہ کی طرف لوگوں کو معقول باتوں اور میٹھی نصیحتوں سے بلاؤ۔ اور مناظرہ کرنے میں بہترین رو
اختیار کرو۔ یہ تو خدا کو معلوم ہے کون گمراہ ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ اگر تم برائیوں کا بدلہ لو تو اسی قدر جتنی
زیادتی کی گئی ہے اور اگر صبر کرو تو صبر کا پھل اچھا ہے۔ اور صبر کرو کیونکہ تمھارا صبر خدا کے واسطے ہے اور اُن پر
نہ کرو اور اُن کے مکروں سے پریشان نہ ہو۔ یقیناً اللہ اُن کے ساتھ ہے جو برائیوں سے بچتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں۔

٨۔ ولا تجادلوا اھل الکتٰب الا بالتی ھی احسن ۙ الا الذین ظلموا منھم وقولوا اٰمنا بالذی
الینا واُنزل الیکم والٰھنا والٰھکم واحدٌ ونحن لہٗ مسلمون ۝ (۲۱)

اور اہلِ کتاب سے جھگڑا مت کرو۔ البتہ پسندیدہ طور پر مگر اُن سے جو زیادتی کریں اور کہو کہ ہم تو اس پر
لائے ہیں جو ہم پر اُترا ہے اور جو تم پر اُترا ہے اور ہمارا اور تمھارا خدا ایک ہے اور ہم تو مسلمان ہیں۔

٩۔ لا اکراہ فی الدین ۙ قد تبین الرشد من الغی ۚ فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ ف
استمسک بالعروۃ الوثقیٰ ۚ لا انفصام لھا ؕ واللہ سمیعٌ علیمٌ ۝ (۳)

اور دین میں کوئی زبردستی نہیں البتہ راہ راست کج سے ظاہر ہو گئی۔ پس جس نے شیطان سے انحراف کر
خدا پر ایمان لایا اس نے فی الحقیقت مضبوط گرفت کی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سمیع و علیم ہے۔

١٠۔ فذکر انما انت مذکر ؕ لست علیھم بمصیطر ؕ الا من تولی وکفر ؕ فیعذبہ اللہ العذ
الاکبر ؕ ان الینا ایابھم ؕ ثم ان علینا حسابھم ۝

بس نصیحت کر کہ تو نصیحت کرنے والا ہے۔ تو انکے اوپر نگہبان نہیں بجز انکے کہ اس نے ساتھ دیا اور جس
کفر کیا اس پر خدا کا بھاری عذاب ہے کہ انکو ہمارے طرف لوٹنا ہے اور ہمارے ذمہ انکا حساب ہے۔

شاید معترض اس پر یہ کہے کہ غیر مذہب والوں سے رواداری اور بات ہے اور مرتد کی صورت اور ہے
بھی قرآن شریف سے جواب مل سکتا ہے۔ مدینہ میں بعض یہودی اپنے خبث باطنی سے اسلام کو بدنام کرنے کے
کیا کرتے تھے کہ جھوٹ موٹ مسلمان بن جاتے تھے اور تھوڑے دنوں کے بعد مرتد ہو جاتے تھے۔

Marfat.com

وقالت طآئفۃٌ من اھل الکتب اٰمنوا بالذیٓ انزل علی الذین اٰمنوا وجہ النہار واکفروٓا اٰخرہٗ
لعلّھم یرجعون ٥ (پ۳)

اور اہل کتاب کی ایک جماعت کہتی ہے کہ مسلمانوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاؤ دن کے پہلے حصہ
ں اور اس سے انکار کردو دن کے آخر حصے میں۔ شاید اسطرح تم مسلمانوں کو ورغلا سکو۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب اسلام مدینہ میں باقوت وصاحب سیاست تھا۔ کیا کسی ایسے یہودی کو مرتد
ہونے کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے اور وہ منافقین کون تھے جو منہ پر کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور پیٹھ پیچھے پیغمبر اور
اسلام کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔

اذا جآءک المنٰفقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہٗ واللہ یشھد
ان المنٰفقین لکٰذبون ۚ اتخذوٓا ایمانھم جنۃ فصدوا عن سبیل اللہ انھم سآء ما کانوا یعملون ٥ (پ۲۸)

منافقین جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم شہادت دیتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اور اللہ کو علم ہے
کہ تم فی الحقیقت خدا کے رسول ہو اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔ اُنھوں نے قسموں کو آڑ بنا رکھا
ہے اور اسطرح اللہ کی راہ سے بہکاتے ہیں اور وہ بُرے کام کر رہے ہیں۔

واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوآ اٰمنّا ۚ واذا خلوا الیٰ شیٰطینھم ۙ قالوآ انّا معکم ۙ انّما
نحن مستھزءون ٥ (پ۱)

اور جب وہ مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب وہ اپنے شیاطین کے ساتھ اکٹھے
ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو اُن سے مسخرہ پن کرتے ہیں۔

کیا کوئی منافق اس پاداش میں قتل کیا گیا۔ یاد رہے کہ منافقوں کی جماعت مکہ میں نہ تھی بلکہ مدینہ میں تھی۔
رسول اللہ صلعم اُن کے نام اور اُن کی حرکتوں کو جانتے تھے لیکن قرآن نے صرف اسقدر کیا کہ سرگروہ منافق پر
جب رسول اللہ صلعم نے نماز جنازہ پڑھی تو قرآن نے اس کی ممانعت کردی۔

مگر افسوس! کسقدر عبرتناک امر ہے کہ قرآن کے اس طرۂ افتخار کو جو قیامت تک مخالفین کے دلوں میں بھی
رشک وحسد کی آگ بھڑکاتا رہیگا۔ حدیث وفقہ نے چھین لیا۔ قتل مرتد کے لئے ابن عباسؓ کے ایک مفروضہ قول
کی سند سے ہزاروں انسانوں کا خون بہا دیا گیا۔ علماء نے اس کی آڑ میں اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹایا۔ حکومت
نے ان کی تلبیس سے متاثر ہو کر آزاد خیالی کا دروازہ بند کر دیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں افغانستان میں ایک مسلمان پر
ارتداد ثابت کیا جاتا ہے اور اسکو سنگسار کیا جاتا ہے اور یہ فخر اسلام کو دنیا میں حاصل ہے کہ ٹھیک وہی رسمیں جنکو
قرآن نے تیرہ سو برس پہلے مٹانے کے لئے بار بار یاد دلایا ہے اور جو دنیا کی تمام قوموں کی معمول بہ تھیں۔ اُن کو

قرآن ہی کے اثر سے تمام دنیا کی قوموں نے عرصہ ہوا چھوڑ دیا مگر مسلمان آج بھی اُن پر عامل نظر آتا ہے۔ قربانی کی
تمام دنیا کی وحشی و مدنی قوموں میں تھی۔ آج سوائے مسلمانوں کے کوئی اسکو نہیں کرتا۔ غلامی و قتل مرتد و قتل س
وغیرہ جہاں مسلمانوں کو خدا نے با اختیار بنایا ہے نہایت زوروں سے جاری ہیں۔ پھر اگر وہ ہر جگہ سے بے اختی
جا رہے ہیں تو اسکا ذمہ دار کون ہے؟ ۱۸۲۴ء میں جب ترکی پر افغانستان کی سی جہالت کا سایہ تھا وہاں یہ
واقعہ پیش آیا۔ ایک ارمنی جو پہلے مسلمان ہو گیا تھا بعد کو پھر اپنے مذہب پر واپس ہو گیا۔ شیخ الاسلام نے اُس
قتل کا فتوے دیدیا۔ سر اسٹریفڈ فری ریڈکلف اس وقت انگریزی سلطنت کے سفیر تھے۔ اُنھوں نے تمام قرآن کا
کرڈالا اور جب اُنکو قتل مرتد کے جواز میں کوئی آیت نظر نہ آئی تو بڑے خوش ہو کر سلطان کی خدمت میں گئے اور
کیا کہ قتل مرتد کا جواز قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ سلطان کو یقین نہ آیا۔ شیخ الاسلام سے دریافت کیا گیا تو اُنھوں
بڑے شد و مد سے انکار کیا کہ قرآن کا حکم یہی ہے۔ لیکن جب اُن پر اپنی غلطی ظاہر ہوئی تو کہا کہ قرآن مذہب
کے لئے کافی نہیں۔ حدیث و فقہ بھی قرآن کا درجہ رکھتے ہیں۔ بالآخر ارمنی قتل کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس
جرمنی۔ فرانس اور انگلستان نے ٹرکی کو الٹیمیٹم دیا کہ یا تو ایسا حکم منسوخ کیا جائے ورنہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات
ختم کرتے ہیں۔ اسپر عرصے تک وزارت خارجیہ ترکی اور سفراء دول سے خط و کتابت رہی۔ وزیر اعظم ترکی نے جو خط وزیر
انگلستان کو اس مسئلے کے بارے میں لکھا ہے۔ اسکا اقتباس یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:۔

"قرآن کے احکام کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرتے لیکن ایسے معاملے میں جبکہ مسلمان مرتد ہو جائے یا کوئی غیر
اسلام لا کر پھر مذہب کا انکار کرے تو قرآن کا حکم ایسے لوگوں کے قتل پر ناطق ہے۔ کوئی تاویل ایسے شخص کو موت سے
بچا نہیں سکتی اور شریعت کے حکم کی تعمیل بلا کسی رحم کے عمل میں لائی جائے گی۔"

خدا معلوم وزیر اعظم کے پاس کون سا قرآن تھا جس میں ایسے لوگوں کے قتل پر قرآن کا حکم ناطق ہے۔ بادی
اس کے بالآخر شریعت یا بمعنی دگر قرآن کا حکم سلطان عبدالمجید کے نومبر ۱۸۴۲ء کے "ارادہ" سے منسوخ ہوا۔ اسلئے نہ
ترکوں نے بعد کو قرآن پڑھ کر اپنی غلطی معلوم کر لی۔ قرآن تو آج تک اُن کے پاس سر بمہر کتاب ہے۔ اُنھوں نے کبھی
ترجمہ اپنی زبان میں نہیں ہونے دیا۔ بلکہ یورپ کے خوف سے۔ اس سے زیادہ اسلام کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے
۱۸۷۸ء میں ایک ترک کو انجیل کا ترجمہ کرنے پر سزائے موت دیگئی تو یورپ میں پھر جوش و خروش اُٹھا اور بالآخر طے
کہ جب تک ٹرکی کی سلطنت میں اس قسم کے وحشیانہ قانون پر عملدرآمد ہے یورپ کسی طرح اپنی رعیت کے حقوق کی ذمہ
نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مرتد کے قتل کی بدعت عالم اسلام میں کب جاری ہوئی۔ زرقانی نے موطا کی شرح میں
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عیسائی یا یہودی جب مسلمان ہو کر مرتد ہو جاتا تھا تو قتل کیا جاتا تھا

Marfat.com

یہ قول بالکل بے سند اور خلاف واقعہ ہے۔ نہ کوئی مرتد ہوا اور نہ کوئی قتل ہوا۔ میرے خیال میں جسوقت خوارج حضرت علی سے لڑ رہے تھے اسوقت خوارج کو مرتد بناکر قتل کردینے کی پہلی رسم جاری ہوئی۔ بخاری میں اسکا ذکر اسطرح ہے :-

"عکرمہ نے کہا۔ حضرت علی کے سامنے کچھ منافقین (خوارج) لائے گئے۔ آپ نے اُنکو زندہ جلانے کا حکم دیا۔ یہ خبر ابن عباس کو پہنچی تو اُنھوں نے کہا۔ اگر میں ہوتا تو میں اُن کو زندہ نہ جلواتا۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ خدا کے عذاب کا عذاب مت دو۔ ہاں میں اُن کو قتل کرتا کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے۔ جو شخص اپنے دین کو بدلے اُس کو قتل کردو۔"

یہ روایت کہاں تک صحیح ہے اس پر غور کرنا چاہیے۔

## تنقید سند

یہ روایت عکرمہ سے بیان ہوئی ہے جو ابن عباسؓ کے غلام تھے۔ اُنکی نسبت متقدین اور محققین نے جرح کی ہے۔ مسلم کی اکثر روایتیں جن میں تاریخی معارضے ہیں اور جو عکرمہ کی سند سے بیان کی گئی ہیں اُن کے متعلق ابن حزم کا قول ہے "وھو موضوع بلاشک کذبہ عکرمہ ابن عمار" ابوحاتم رازی نے عکرمہ کو مدلس کہا ہے اور مدلس کی حدیث اسوقت تک قبول نہیں کی جاتی جب تک کہ اس میں سماعت بصراحت مذکور نہ ہو۔ پھر یہ قول سوائے ابن عباس کے اور کسی سے مروی نہیں ہے اور ابن عباس کی حدیثوں پر اور زیادہ تر اُن کے اجتہاد و فتاوے پر اسلئے کہ بلحاظ سن وہ حدیثوں کے سننے سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل آنحضرت کے زمانے میں نہیں تھے[1] کثرت سے کلام کیا گیا ہے۔ میں اسکی چند [illegible] حدیث میں سے دونگا۔

یہ بھی قابل نوٹ ہے کہ اصحاب میں سے جو ابن عباسؓ کی طرح آنحضرت کے زمانے میں کمسن تھے۔ اُن سے بہت کم بلکہ کوئی روایت منقول نہیں۔ مثلاً ابن زبیرؓ سے۔ حضرت ابن عباس سے کثیر روایتوں کا شائع کیا جانا بطرف عباسیوں کی خوشنودی کے لئے تھا۔ اسی واسطے موطا امام مالک عباسیوں کو پسند نہ آئی۔ گو کہ وہ اُن کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔ کیونکہ اُ

---

[1] ابن عباس کی بالکل کمسنی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ فتح مکہ کے بعد کا ہے [illegible]
لاتے میں ایک دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ آپ نے مجھے ہاتھ سے تھپکا اور فرمایا جا معاویہ کو بلا لا۔ میں گیا پھر لوٹ کر آیا۔ میں نے کہا وہ [illegible]
پھر جا۔ اور معاویہ کو بلا لا۔ میں گیا پھر لوٹ کر آیا۔ میں نے کہا کہ وہ کھانا کھاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر جا اور معاویہ کو بلا لا۔ میں [illegible]
کھانا کھاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا خدا اُس کا پیٹ نہ بھرے۔ مسلم [illegible] ابن عباسؓ بیان کرتے [illegible]
صلعم اپنی ازواج کے پاس بستر میں ہوتے تھے۔ اس سے بھی ابن عباسؓ کی کمسنی [illegible]

میں ابن عباس کی روایات بہت کم بلکہ نہیں ہیں۔

(۱) ابن عباس سے پوچھا گیا۔ اگر غلام اپنی عورت کو دو طلاق دیوے۔ پھر دونوں آزاد ہو جاویں۔ کیا وہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ ابن عباس نے کہا ہاں۔ پوچھا گیا یہ فیصلہ کس نے کیا۔ اُنھوں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

(عبداللہ ابن مبارک نے کہا ابوالحسن اس حدیث کے راوی نے اس حدیث کی روایت سے ایک بڑا پتھر اپنی گردن پر اُٹھا لیا ہے۔ شافعی اور ابو حنیفہ دونوں کو اس سے اختلاف ہے۔ کیونکہ شافعی کے نزدیک طلاق مردوں سے متعلق ہے اور یہاں خاوند غلام تھا۔ پس دو طلاق میں وہ عورت بائنہ ہو گئی۔ ابو حنیفہ کے نزدیک طلاق عورتوں سے متعلق ہے اور عورت لونڈی تھی بائن ہو گئی۔ اور اصل یہ ہے کہ قرآن میں مطلق حکم ہے اور غلام اور آزاد کی تخصیص نہیں ہے)

(۲) ابن عباس نے کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارہ دیا قسم کا ایک صاع کھجور دیکر۔ اور لوگوں کو بھی یہی حکم دیا۔ اگر کسی کو ایک صاع کھجور کا نہ ملے تو نصف صاع گیہوں کا دے۔

(قرآن شریف میں دس مسکینوں کو پیٹ بھر کھانا کھلانا شرط ہے۔ اسلئے ابو حنیفہ نے قیاس کیا ہے کہ ایک صاع کھجور ہر مسکین کے لیئے ہے۔ مگر شافعی کا قول ہے کہ ہر مسکین کو ایک مد (چوتھائی صاع کافی ہے۔ زہری نے اسکی تاویل یوں کی ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اسکے اسناد میں عمر بن عبداللہ فاسق ہے)

(۳) ابن عباس کا قول ہے کہ جو شخص اناج خریدے اُس کو نہ بیچے جب تک کہ اس پر قبضہ نہ کر لیوے۔ اور ابو عوانہ کی روایت میں ہر چیز پر یہ حکم ہے۔

(ابو حنیفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے خصوصاً گھر اور زمین کی بیع میں تو اُنھوں نے قطعی انکار کیا ہے)

(۴) ابن عباس کی روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو حلال نہیں کہ دیکر پھیر لیوے مگر باپ کو جو وہ اپنی اولاد کو دے۔

(باوجودیکہ ترمذی نے اس کی تصدیق کی ہے۔ ابو حنیفہ نے اس حدیث سے انکار کیا ہے)

(۵) ابن عباس کا فتویٰ تھا کہ متعہ جائز ہے۔ ابن شہاب زہری نے کہا عروہ بن زبیر نے مجھ کو خبر دی کہ عبداللہ بن زبیر مکہ میں کھڑے ہوئے خطبہ پڑھنے کو اور کہا کہ بعض لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ نے اندھے کر دئے ہیں جیسے اُن کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں (یہ اشارہ ابن عباس کیطرف تھا جو آخر میں نابینا ہو گئے تھے) فتوے دیتے ہیں متعہ کے جواز کا اور وہ اس شخص پر طعن کر رہے تھے۔ اتنے میں اس شخص نے پکارا اور کہا تم کم فہم بے ادب نادان ہو اور قسم ہے میری جان کی کہ متعہ کیا جاتا تھا زمانے میں امام المتقین کے۔ سو ابن زبیر نے کہا کہ تم اپنے کو آزما دیکھو کہ قسم اللہ کی اگر تم نے متعہ کیا تو بیشک میں تم کو تمھارے ہی پتھروں سے مارونگا۔ ابن شہاب نے کہا کہ میں ایک شخص[1] کے پاس بیٹھا تھا

---

[1] اس روایت میں یہ بات قابل نوٹ ہے کہ راوی صاف طور سے ابن عباس کا نام نہیں لے رہا ہے اس خوف سے کہ بنی عباس کے دبدبہ سے (بقیہ صفحہ ۱۲۷)

کہ ایک دوسرا شخص آیا۔ اور اُس نے متعہ کا فتوے پوچھا تو اُنھوں نے حکم دیا متعہ کا۔ سو ابن عمرہ انصاری نے کہا ذرا ٹھہرو انھوں نے کہا کیوں۔ اللہ کی قسم میں نے کیا ہے امام المتقین کے زمانے میں۔ تب ابن ابی عمرہ نے کہا کہ اول اسلام میں جائز تھا۔ اس کے لئے جو نہایت درجہ بیقرار ہو جیسے مضطر کو مردہ اور خون اور سور کا گوشت حلال ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے دین کو مضبوط کیا اور اس سے منع کیا۔

ظاہر ہے کہ متعہ کی تاویل اس طرح کرنا نعوذ باطل ہے۔ کہاں بھوکوں مرنا اور کہاں عورت کے بغیر مرنا۔ پھر تو شراب بھی جائز اور تمامی منکرات جائز۔

(۶) ابن عباسؓ کا یہ قول کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن مسعود سے کہ تمھارے پاس پانی ہے انھوں نے عرض کیا کہ نہیں مگر کھجور کا شربت ایک چھاگل میں ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ کھجور پاک ہے اور پانی پاک کرنے والا ہے میرے اوپر ڈالو۔ سو میں نے ڈالا اور آپ نے وضو کیا۔

(تمام فقہا متفق ہیں کہ کھجور کے عرق سے وضو درست نہیں)

(۷) ابن عباس کا قول جو ربیع نے بیان کیا ہے یعنی ابن عباس آئے اور مجھ سے وہ حدیث پوچھی کہ رسول اللہ صلعم نے وضو کیا اور دونوں پیر دھوئے۔ ابن عباس نے کہا کہ لوگ پیروں کا غسل ہی کئے جاوینگے۔ حالانکہ میں کتاب اللہ میں نہیں پاتا مگر مسح کو۔

تمام فقہا کے نزدیک پیر دھونا شرط وضو ہے طحاوی اور ابن حزم نے اس حدیث کو منسوخ سمجھا ہے۔ جریر۔ طبرانی۔ ابن حبان اور حسن بصری کا قول ہے کہ آدمی چاہے پیر دھوئے (اگر میلا ہو) یا مسح کرے بعض علما نے غسل اور مسح دونوں کو واجب سمجھا ہے۔

(۸) یا ابن عباسؓ کا یہ قول کہ سیاہ کتا اور عورت نماز کو توڑ دیتی ہے اگر وہ سامنے سے نکل جاوے۔

(حضرت عائشہؓ نے اس حدیث اور قول سے انکار کیا)

پھر جب ابن عباس کی روایتوں اور فتاوے کی فقہانے پرواہ نہیں کی تو اس میں ایک مجہول جملے کو قرآن کی آیت کی طرح پکڑ لینا کیا معنی جبکہ قرآن نے اسکے متعلق ایک حرف نہیں کہا بلکہ برخلاف اسکے انسان کو اپنے مذہبی عقائد میں آزاد بنایا ہے۔

---

(بقیہ ص ۱۲۶) ذرا خطرے کی تھی۔ ہاں جہاں کسی اور صحابی کے متعلق سخت جملے استعمال کئے گئے ہیں ان کی صاف [illegible] نے حضرت علیؓ کے شان میں خاص۔ الفاظ۔ [illegible] کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ صاف صاف بیان کئے ہیں [illegible] مسلمانوں میں ہے وہ ظاہر ہے کہ خلفائے بنی عباس کو حضرت علی سے کیا مطلب عباسیوں کے [illegible] کھائینگے تو کہیں گے "یا ابو الفضل عباس" حالانکہ ابو الفضل عباس سے [illegible] انھوں نے ترک موالات کر لیا ہے۔

Marfat.com

# تنقید متن

یہ جملہ کہ "جو اپنا مذہب بدلے اُسکو قتل کر ڈالو" ایسا کلیہ ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو جو یہودی یا عیسائی مسلمان ہو جائے وہ بھی لائق گردنی زدنی ہوتا ہے۔ کیا کوئی یہودی یا عیسائی کبھی مسلمان ہونے کی پاداش میں قتل کیا گیا پھر اوّل تو کہیں کسی تاریخ سے ثابت نہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے کسی خارجی کو زندہ جلوایا ہو۔ لیکن اگر آپ کے ہاتھ سے مقابلہ میں کوئی خارجی قتل ہوا ہو تو یہ کیسے تسلیم کر لیا گیا کہ خارجی مذہب سے مرتد ہو گئے تھے۔ اور اپنے ارتداد کی پاداش میں قتل کئے گئے تھے۔ جہانتک تاریخ کی شہادت ملتی ہے خوارج کا ارتداد سیاسی تھا نہ کہ مذہبی اور سیاسی ارتداد میں قتل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قرآن سے قتل مرتد کا جواز تو کسی آیت سے ثابت نہیں ہے۔ یہ بات نہ تھی کہ قرآن کے سامنے کوئی ارتداد کا واقعہ پیش نہیں آیا اور اسلئے کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ قرآن میں ارتداد کا ذکر ان آیتوں میں ہے مگر کسی آیت سے مرتد کے قتل کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔

(۱) یاایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہٖ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہٗ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکفرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لآئم ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء واللہ واسع علیم ۝

اے مومنو! تم میں سے جو دین سے پھر جائیگا تو اللہ ایک قوم کو لائیگا جو اس سے راضی ہونگے اور وہ اُن سے راضی ہوگا۔ مسلمانوں پر مسکین اور کافروں پر سخت ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرینگے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈریں گے نہیں اور یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ جاننے والا اور روزی کا کشادہ کرنے والا ہے۔

اس آیت میں حضرت ابوبکر کے خلافت کے واقعہ کی پیشگوئی ہے۔ مفسرین کا قول ہے کہ چونکہ ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین سے قتال کیا تھا اور اُن کا قتل قطعی قرآن کے ماتحت تھا اسلئے مرتد کا قتل جائز ہے مگر سوال یہ ہے کہ عرب کے باغیوں سے قتال کی بناء صرف ارتداد تھا یا کچھ اور۔ کیا فتنہ و بغاوت ظاہر نہ ہو چکی تھی؟ اور اس پر ابوبکرؓ نے قتال کیا تو کیا ہوا۔ دیکھو منافق جب تک اسلام کو خطرے میں ڈالنے کا سبب نہ ہوتا تھا قرآن اس سے کوئی تعرض نہ کرتا تھا مگر جب وہ لشکر اسلام میں بددلی پھیلانے کی غرض سے بھاگنے لگتے تھے تو اُن کے قتل کرنے کا حکم نہ صرف قرآن ہی جائز بتاتا ہے بلکہ موجودہ اصول حرب میں بھی یہ فعل مباح ہے۔ قرآن شریف میں ہے۔

فما لکم فی المنٰفقین فئتین واللہ ارکسھم بما کسبوا ط اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ط ومن یضلل اللہ فلن تجد لہٗ سبیلا ۝ ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواءً فلا

Marfat.com

تتخذوا منھم اولیاء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ ج فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجد
تموھم ولا تتخذوا منھم ولیا و لا نصیرا ۵ ﴿۸۹﴾

اور تم کو کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں دو رائے ہو گئے ہو۔ حالانکہ خدا نے اُن کو اُنکے اعمال کی پاداش میں پلٹ دیا ہے۔ کیا تمھارے لئے ممکن ہے کہ اُن کو راہ راست پر لاؤ۔ جبکہ خدا نے گمراہ کر دیا ہے اور جسکو خدا گمراہ کرتا ہے اُس کو صحیح راستہ نہ ملیگا۔ کیا چاہتے ہو کہ اُن کی طرح تم بھی کفر کرو کہ تم بھی اُنکی طرح ہو جاؤ۔ اُن کو تم اپنا مولیٰ اور ولی مت بناؤ۔ یہانتک کہ وہ خدا کی راہ میں جہاد کو نکلیں اور اسوقت اگر وہ پیٹھ پھیریں تو اُن کو پکڑو جہاں کہیں پاؤ اور قتل کرو۔ پھر نہ اُن سے مدد لو اور نہ اُن سے حمایت کی توقع رکھو۔

دوسری جگہ قرآن شریف میں ارتداد کا ذکر آیا ہے۔

ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی [illegible]
واولئک اصحب النار ج ھم فیھا خلدون ۵ ﴿۲۱۷﴾

اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے اور کافر ہو کر مرے تو اُس کے اعمال [illegible] دنیوی یا اُخروی اور وہ اصحاب نار ہونگے جہاں اُن کو ہمیشہ رہنا ہوگا۔

اس سے بڑھ کر اور کون سا موقع مرتد کے قتل کا بیان ہو سکتا تھا۔ [illegible] [illegible] صریحاً خلاف ہو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مرتد کے قتل کا حکم [illegible] دین کی شریعت [illegible] کا آیت میں ہے اور یہودیوں میں صرف ارتداد ہی کی پاداش میں قتل نہ تھا [illegible] [illegible] کوئی کام کرنا۔ فقہا نے اس مسئلہ کو وہاں سے لیکر جو سرگرمی دکھلائی ہے۔ وہ ہدایہ کے اس اقتباس [illegible]

"جب ایک مسلمان دین سے پھر جائے۔ اس کے سامنے [illegible] [illegible] جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں۔ اگر وہ پھر سے [illegible] [illegible] کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر اتمام حجت ہو جائے۔ کیونکہ اس کے [illegible] [illegible] اور چونکہ قتل سے اسلام بہتر ہے۔ اسلئے برائی کے مٹانے کے لئے [illegible] [illegible] میں اسواسطے کہ اسکو مذہب کی تعلیم پہلے ہی مل چکی ہے۔ [illegible] [illegible] اور وہ اپنے عقیدہ سے توبہ کرے تو بہتر ہے۔ ورنہ قتل کیا جائے [illegible] [illegible] اتمام حجت کیا جائے اور اگر وہ ارتداد پر قائم رہے تو قتل کیا جائے"

مگر اس کا ثبوت کہ وہ توبہ نفاق اور خوف سے نہیں [illegible] [illegible] احبارھم من دون اللہ اربابا اور قبول کیا ہے۔ [illegible] [illegible]

ابوحنیفہ اور ابو یوسف کا قول ہے کہ تین دن کی مہلت دینا مستحب ہے خواہ مرتد اسکو قبول کرے یا نہ کرے
شافعی کا قول ہے کہ امام پر تین دن کا وقفہ دینا واجب ہے اور یہ جائز نہ ہوگا کہ مرتد کو بغیر وقفہ دئے ہوئے قتل کردیا
کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مسلمان کا ارتداد محض اس بناء پر ہو کہ اُسکو بعض مسائل سے ناواقفیت یا شک یا گمان
ہوگیا ہو اور جس کے لئے اُس کو سمجھنے کا موقعہ دینا ضروری ہے۔ ہمارے علماء نے اس پہلو پر دو حیثیت سے بحث
کی ہے۔ اوّل کی تو یہ رائے ہے کہ قرآن میں ہے کہ کافروں کو فوراً قتل کرڈالو (حاشا!) اور اُن کو کوئی مہلت نہ
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اپنا مذہب بدلے اُس کو قتل کرڈالو۔ دوسرے یہ کہ مرتد دشمن دین
ہے جس کو اسلام کی دعوت مل چکی ہے اسلئے اس کے قتل میں دیر نہ لگانی چاہئے۔ یہاں پر مرتد دشمن دین ہے اور
حالت ذمی کی سی نہیں۔ کیونکہ اس نے نہ کوئی جزیہ دیا ہے اور نہ اس سے جزیہ قبول کیا گیا ہے۔ یہ بھی خیال رکھنا
چاہئے کہ مرتد کے لئے غلام اور آزاد کی قید نہیں۔ دونوں برابر ہیں۔ اگر ایک شخص مرتد ہوجائے یا قتل ہوجائے تو اس
مال اُن وارثوں کو ملیگا جو مسلمان ہیں اور جو کچھ اس نے اپنے ارتداد کے زمانے میں پیدا کیا ہے وہ بیت المال میں
داخل کیا جائے۔ یہ قول ابوحنیفہ کا ہے۔

مرتد کے تمام معاملات جو اُس نے اپنے ارتداد کے زمانہ میں کئے ہیں یعنی بیع و شری۔ ہبہ۔ اعتاق رہن وغیرہ وہ سب کالعدم
ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہوجاوے تو وہ معاملات بحال رہیں گے۔ ورنہ نہیں لیکن اگر وہ مرجائے ارتداد میں تو وہ سب کالعدم ہیں۔

اگر کوئی شخص مرتد کو قتل کردے قبل اسکے کہ اس پر اتمام حجت کی جائے تو یہ مکروہ ہے لیکن قاتل کو کوئی سزا نہ دی
جائے گی۔ کیونکہ مرتد کا قتل جائز ہے اور اتمام حجت ضروری نہیں۔

"اگر ایک مسلمان عورت مرتد ہوجائے تو اسکو قید کیا جائے۔ یہانتک کہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کرے شافعی
کہتا ہے کہ اسکو بھی قتل کردینا چاہئے۔ بموجب اس حدیث کے جو اوپر بیان ہوچکی ہے۔ اگر مرد مرتد ہوجائے اور دارالحرب کو
بھاگ جائے تو اُس کا نکاح فسخ ہے۔ اسی طرح عورت کا۔ اگر مرد عورت دونوں مرتد ہوجاویں اور دارالحرب کو بھاگ
جاویں اور عورت وہاں حاملہ ہوکر بچہ جنے اور اس کے بچہ کے بھی بچہ ہوں تو جب مسلمان اس ملک پر حملہ کریں تو مرتد کی
اولاد غلام بنائی جائے گی۔ حسن نے کہا ہے کہ اُنکو زبردستی مسلمان کیا جائے گا۔"

یہ اجتہادات تنقید سے بالاتر ہیں۔ چونکہ فقہا میں ارتداد ایک نہایت وسیع جملہ ہے جو نہ صرف عقائد کے معمولی
اختلاف پر[۱] حاوی ہے۔ بلکہ ایک زیرک مولوی اگر چاہے تو اپنے ذاتی دشمن کی کسی تقریر و تحریر کو اس زد میں لے آسکتا
لفظوں کو اپنی جگہ سے اٹھا کر۔ جملوں کو بے ربط کرکے مطلب کو مروڑ کر۔ منطقیانہ نتائج نکال کر اور چونکہ اُسکو "کفر ک
گری" اور "حیل شرعی" میں خاص مشق ہوتی ہے، وہ اسکو ماہر فن کی طرح انجام دے سکتا ہے۔ ہمارے ہندوستان

[۱] دیکھو فتاوئے برہانی باب کلمات کفر۔

مولویوں کے دو فرقے ہیں۔ ایک دیوبندی دوسرے بریلوی۔ یہ ایک دوسرے کو کافر بناتے رہتے ہیں۔ ایک دن بریلوی نے دیوبندی سے پوچھا کہ کیوں صاحب آپ کے نزدیک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ دیوبندی نے فوراً جواب دیا بیشک۔ بریلوی نے پکڑ لیا۔ تو کیا آپ کے نزدیک خدا جھوٹ بولنے پر قادر ہے دیوبندی بیچارہ سوائے ہاں کے کیا جواب دیتا۔ فوراً ایک رسالہ بریلوی کی طرف سے شائع ہوا کہ دیوبندی اتنے بڑے کافر ہیں کہ ان کے نزدیک خدا بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ بھلا جو ماہر فن کے اور کس کو یہ نکتے سوجھیں گے۔ مگر جب ہم اسکا خیال کرتے ہیں کہ ان ظالموں نے کتنے گھروں کو [illegible] سے برباد کیا ہوگا۔ کتنے بچوں کو یتیم و غلام، کتنی عورتوں کو بیوہ، مطلقہ اور کنیز بنا دیا ہوگا تو واقعی ہم کو ایک مسرت آمیز [illegible] ہوتا ہے کہ خدا نے انکے ہاتھ سے تقریباً وہ قوت سلب کر لی جس نے مسلمانوں کی خونریزی میں [illegible] زیادہ کام کیا ہے اور جن کے افکار لطیفہ نے اسلام کے روشن و منور چہرے کو اس درجہ غبار آلود کر دیا ہے کہ دشمن سے بھی شاید اتنی توقع نہ ہوتی۔ کوئی ان عقلمندوں سے دریافت کرے کہ کلمات کفر ادا کرنے پر ایک شخص اگر زبانی توبہ کرے تو بھی تم اسکے خون کے پیاسے رہوگے۔ مگر تمہارے پاس اسکے جانچنے کا کیا ذریعہ ہے کہ اسکی توبہ تم کو دھوکہ دینے کیلئے نہیں۔ اور اگر تم نے اسکی خون ریزی کی اور وہ دل سے توبہ کرنے والا تھا تو تم نے ایک مومن کا قتل عمداً کیا جسکی سزا جہنم اور خلود ہے پھر سوائے ایسے شخص کے جسکا دماغ ماؤف ہو یا وہ خودکشی چاہتا ہو کس کو تم [illegible] پکڑ کر اپنی خون آشامی کو بجھاؤ گے۔

غریب ملا برہان الدین کے خیال میں یہ نہ آیا کہ جہاں مسلمانوں کے ہاتھ میں سلطنت [illegible] روس وغیرہ وہاں بیچارے کیا ترتیب کریں گے۔ مولوی اشرف علی کا قول ہے کہ وہاں نکاح فسخ کر دینا [illegible]

میرے نزدیک یہ ایک ایسا فقہی مسئلہ اختراع کیا گیا ہے جس نے غالباً اسلام کو سب [illegible] ہندوستان میں تو یہ حالت ہے کہ وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کے مظالم زیادہ [illegible] شرع نے کوئی حق طلاق نہیں دیا ہے انھوں نے اپنے لئے سب سے آسان صورت یہ دیکھی [illegible] بالاعلان بیٹھ رہیں اور اسوقت ان کا نکاح خود بخود ساقط ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے [illegible] گئیں اور جب عدالت میں پیش ہوئیں تو اُن سے تبدیل مذہب [illegible] نہیں رہتا کہ وہ ایسے اغوا کرنیوالوں کو عدالت سے سزا دلا سکے۔ دیکھا گیا کہ ایک ہندو عورت [illegible] پڑھا لیا جائے تو از بسکہ ہندو عورت تبدیل مذہب سے اپنے شوہر کے نکاح سے خارج نہیں ہو جاتی [illegible] کہ نہ صرف اس عورت کو مسلمانوں کے درمیان سے واپس دے بلکہ نکاح کرنیوالے کو عدالت [illegible] ہیں کہ مسلمان کا نکاح ایک مشرکہ سے یا مشرک کا نکاح ایک مسلمان عورت سے قرآن نے منع [illegible] کہ مشرک کی تعریف کیا ہے۔ کیا ہم خود مسلمانوں میں زیادہ ایسے نہیں ہیں جو پیر پرست اور قبر پرست ہیں [illegible]

Marfat.com

اور قبر پرستی نے اُن کو مشرک نہیں بنا دیا۔ پھر ایسے پیر پرستوں کو مسلمان اپنی لڑکیاں کیوں دیتے ہیں۔ بہرحال عیسائی بھی مشرک ہیں اگرچہ اُن کے ساتھ موالکت و مناکحت دونوں جائز ہیں۔ پھر ایک مسلمان عورت اگر خدانخواستہ عیسائی ہوئے تو کس کو یہ مجال ہے کہ قرآن کی مخالفت میں یہ کہہ سکے کہ اسکا نکاح اب اس کے مسلمان شوہر سے جائز نہیں رہا۔ رہا ارتداد سے نکاح کا ساقط ہو جانا تو نہ صرف قرآن میں اس کی کوئی سند نہیں بلکہ قرآن نے غالباً ہماری موجودہ صورت کو نگاہ میں رکھ کے ہوئے اور فقہ کا جواب دینے کے لئے یہ بتا دیا ہے کہ حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویاں باوجودیکہ وہ مرتدہ اور کفار کی ساتھی تھیں۔ ان نبیوں کی بیویاں رہیں۔ اور اُن کے شوہر اُن سے نکاح کے ساتھ ہمبستر ہوا کرتے تھے نہ کہ خدانخواستہ اُن سے زنا سرزد ہوا کرتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کا ارتداد خفیہ رہا اور ان نبیوں کو معلوم نہ تھا تو کیا خدا کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ان نبیوں کو بتلا دیتا کہ تمھارا نکاح تمھاری بیویوں سے ساقط ہو گیا ہے۔ یہ کیا مصلحت تھی کہ اُن سے عمر بھر زنا کراتا رہا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

ایک دوسرا فقہی مسئلہ اس سے زیادہ خطرناک یہ ہے کہ ایک کافر اگر مسلمان ہو جائے تو فقہا کے نزدیک اُس کو اس پاداش میں اپنے باپ کے ترکہ سے محروم ہونا پڑیگا۔ نہ صرف یہ لغو مسئلہ قرآن سے ثابت نہیں بلکہ بداہتاً و تاریخاً بھی غلط ہے یعنی ابوطالب مسلمان نہ تھے مگر حضرت علی کو اُن کے ترکہ سے محروم نہیں کیا گیا۔ خود آنحضرت کے اباؤ اجداد مسلمان نہ تھے مگر آنحضرت کو بھی اپنے اباؤ اجداد سے بہت سی چیزیں دنیا کی ترکہ میں ملیں جن کا اُنھوں نے استعمال کیا۔ بہرحال آنحضرت کا اپنا تو ذاتی مکان تھا نہیں۔ وہ تو اُن کے باپ دادا سے ملا ہوگا مگر یہ کہیں ثابت نہیں کہ آپ نے اپنے مکان کی سکونت اسوجہ سے ترک کر دی کہ وہ کافر کا ترکہ ہے اور اسکا حق مسلمان کو نہیں۔

بہرحال میں تو مطالعہ حدیث میں چند مسائل پر جرح کر کے چھوڑ دونگا کہ آگے آنے والے اس سے شہ پا کر کچھ اور جستجو کریں مگر میرے مختصر مطالعہ کا حاصل تجربہ یہ ہے کہ قرآن نے جس مسئلہ میں خاموشی اختیار کی ہے اور فقہ نے روایتوں کی بنا پر اس مسئلہ کو مسلمانوں میں رائج کیا ہے اس نے ہم کو اس قدر روحانی و دنیاوی و دماغی عذاب میں جکڑ رکھا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ان تمام دفاتر کو مقفل کر دیا جائے اور قرآن کو عقل کی کلید سے پھر کھول کر شائع کیا جائے۔

---

Marfat.com

# غلامی

پچھلے مضمون میں میں نے دکھلایا تھا کہ قرآن کریم نے دنیا کے تمام مذاہب سے علیحدہ یہ عجیب و غریب اصول پیش کیا تھا کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں۔ انسان اپنی رائے میں آزاد ہے اور اپنے ذاتی اعتقاد میں سوائے خدا کے کسی کا مسئول و جوابدہ نہیں۔ پھر میں نے دکھلایا تھا کہ حدیث نے کس طرح ان زریں اصول کو پامال کر کے قرآن کا سب [illegible] آج ہم حریت انسان پر بحث کریں گے اور یہ دکھلائیں گے کہ قرآن اس اصول میں بھی تمام مذاہب سے [illegible] ہے۔ مگر حدیث نے اس اصول کی بھی مخالفت کی۔

پہلے یہ سمجھ لو کہ غلامی کیا چیز ہے۔ اگر غلامی سے ایک انسان کا دوسرے انسان کا دست [illegible] ہو تو غلامی دنیا کی ایک اقتصادی اور معاشرتی بلکہ فطری ضرورت ہے اور اس سے دنیا کا [illegible] مستغنی ہو سکتا ہے۔ اور نہ کوئی مذہب و شریعت اس میں مداخلت کر سکتی ہے۔ پھر وہ کون سی غلامی [illegible] قرآن کو اس کے لیے اعتاق و کتابت کی صورتیں و تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔ [illegible] تیسرا شخص مالی فائدہ اٹھاتا ہے جس میں خود اس کی رائے کو کوئی دخل نہیں۔ [illegible] بھی ایک قسم کی غلامی نہیں ہے۔ وہ بھی انسانی بیع و شریٰ و ہبہ کا دوسرا نام ہے۔ [illegible] اور تاریخ سے بحث کرنا نہیں ہے۔ صرف اسقدر بتانا ہے کہ وہ کون سی غلامی ہے جو [illegible] مختصراً بتانا چاہتا ہوں۔

جورو س پروڈکش ( [illegible] ) [illegible] فطرتاً ایک [illegible] تنازع للبقا انسان کی فطرت ہے اور جدوجہد کا نتیجہ دو ہی صورتوں میں نکلتا ہے۔ غالب و مغلوب۔ [illegible] میں ہے کہ مغلوب کو معدوم کر دے یا زندہ رہنے دے حالات اسارت میں۔ پس معدوم [illegible] مغلوب کے ساتھ ہوگا وہ سب غلامی کی صورتیں ہیں۔ [illegible] کئی مراحل طے کرنے پڑینگے۔ ایک یہ [illegible] بھی ممنوع ہو کہ مغلوب کو اسیر و زندانی کیا جائے۔ [illegible]

Marfat.com

فدیہ لیا جائے یا اس کو فروخت کرکے روپیہ وصول کیا جائے۔ پنجم۔ خریداروں کو منع کر دیا جائے کہ وہ مغلوبوں کو نہ خریدیں
ششم لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ مغلوبوں کو خرید کرکے آزاد کردیں۔

ان صورتوں پر غور کرو۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کسی مذہب نے کسی ایک صورت کو اختیار کیا اور کامیابی حاصل کی۔ تم کو معلوم ہوگا کہ مذاہب نے باوصف اس دعوے کے کہ وہ فقراء و مساکین و ضعفاء کے مددگار رہے ہیں ان چند میں سے کسی بات کو اپنے اصول میں جگہ دی ہو۔ اب دیکھو قرآن نے ان مظلوں کی کس طرح دستگیری کی ہے۔

سب سے پہلے تو قرآن نے ایک مسلم کو دوسرے مسلم کا بھائی تسلیم کیا ہے۔ یعنی ایک مغلوب کے لئے آزادی حاصل کرنے کی سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرے اور فوراً مغلوب جماعت سے غالب جماعت میں شامل ہوجائے۔ اگر وہ اس کو قبول نہیں کرتا تو مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ لیکر یا احسان رکھ کر چھوڑدیں۔ اگر یہ نہ کریں یا ان کے اختیار میں نہ ہو یا طمع دنیاوی یا حالات وقت ایسے احسان سے مانع ہوں تو غلاموں کو آزاد کرکے اپنے گناہوں کا کفارہ دیں۔ اگر مسلمانوں کو اس میں تامل ہو تو پھر مغلوب جماعت اپنی قیمت ادا کردے۔ وہ آزاد ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غلاموں کی ایسی شرط سے ہرگز انکار نہ کریں۔

اس لئے اس سلسلے میں تین عنوان بحث طلب ہیں (۱) حریت مسلم از روئے قرآن اور از روئے حدیث (۲) اعتاق قرآن اور حدیث میں (۳) کتابت قرآن و حدیث میں۔

## حریت مسلم

سورہ حجرات میں دو آیتیں ہیں جو اسلامی اخوت و مساوات کی ضمانت ہیں۔

(۱) انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم ج واتقوا اللہ لعلکم ترحمون ۲۶/۱۲

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اسلئے اپنے بھائیوں میں صلح کرادو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

(۲) یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ط ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ط ان اللہ علیم خبیر ۲۶/۱۲

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھارے لئے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ خدا کے نزدیک تم میں وہی سب سے زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اور اللہ علیم و خبیر ہے۔

کس کی مجال ہے کہ ان دو آیتوں کے ہوتے ہوئے ایک مومن کو عبد قرار دے اور دوسرے کو معبود۔ خدا کے نزدیک دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ اور اگر یہ آیتیں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے برابر کرنے میں کافی نہیں

Marfat.com

قرآن سے اسکو بھی سمجھ لو کہ مسلمانوں پر جبر کرنے والے کا کیا حشر ہوگا۔ سورۃ بروج میں ارشاد ہوتا ہے:۔

انّ الّذین فتنوا المومنین والمؤمنٰت ثمّ لم یتوبوا فلھم عذاب جھنّم ولھم عذاب الحریق ﴿۱۰﴾

اور یقینا جو لوگ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو مبتلائے تکلیف رکھتے ہیں [illegible] آزمائش میں ڈالتے ہیں اور اپنے کام سے توبہ نہیں کرتے تو انکے لئے عذاب جہنم ہے اور انکے لئے [illegible]

اگر مسلمانوں کو غلام بنانا فتنوا المومنین نہیں ہے تو خیر ورنہ اس آیت سے مسلمانوں کو غلام بنانا بدترین [illegible] پاداش میں عذاب جہنم ہے۔ لیکن فرض کرو کہ مسلمان کے قبضے میں ایک ایسا اسیر ہے جسکا کوئی وارث نہیں [illegible] ہو جاتا ہے۔ کیا اس کو فورا خدمت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خدمت [illegible] غلامی نہیں [illegible] اگر ایسے مسلمان کا ذریعہ معاش اپنے مالک کی رفاقت میں ہے اور اس کی خدمت کرنے میں بہترین طریقے سے [illegible] ہو سکتا ہے تو اس کا نام غلامی نہ ہوگا اور اس طرح کی خدمت گزاری ناجائز نہیں۔ البتہ اس کی حیثیت غلام کی [illegible] رہیگی۔ وہ تمہارے خاندان کا ایک فرد ہے اور جس طرح تم کو اپنے غلام کی خانہ آبادی کی فکر کرنا چاہیئے [illegible] اپنے اس خدمتگار کی چنانچہ ارشاد ہے:۔

وانکحوا الایامیٰ منکم والصّٰلحین من عبادکم وامآئکم ان یکونوا فقرآء یغنھم اللہ من فضلہ واللہ واسعٌ علیمٌ ﴿۳۲﴾

اور مجردوں کا اپنے لوگوں میں سے نکاح کر دو اور جو تمہارے خدمتگار مرد و عورتیں مسلمان ہوں۔ اگر وہ [illegible] محتاج ہونگے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیگا اور اللہ واسع و علیم ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل میں بسا اوقات اپنے غلاموں کو دامادی کا [illegible]

ابتدائے اسلام میں یہ تو ممکن نہ تھا کہ مسلمانوں کی جماعت سے مقابلہ کیا جائے اور مسلمان [illegible] کے اسیر [illegible] غلام بنائے جاویں اسلئے قرآن نے کبھی فرض نہ کیا تھا کہ مسلمان کا مسلمان کی غلامی کرنا ممکن ہے البتہ ایسا ہوا کہ مسلمان کفار کے ہاتھوں اسیر ہوگئے اور کفار نے ان کو غلام بنا لیا۔ ایسے لوگوں کو چھڑانا مسلمانوں کا ایک فرض تھا چنانچہ قتل اتفاق کے کفارے میں مسلمان غلام کو آزاد کرنا ضروری کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وما کان لمؤمن ان یقتل مؤمنا الّا خطأً ومن قتل مؤمنا خطأً فتحریر رقبۃ مؤمنۃ ودیۃ مسلّمۃ الیٰ اھلہ الّا ان یصّدّقوا فان کان من قوم عدوّ لکم وھو مؤمن فتحریر رقبۃ مؤمنۃ وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق فدیۃ مسلّمۃ الیٰ اھلہ وتحریر رقبۃ مؤمنۃ فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین توبۃ من اللہ وکان اللہ علیما حکیما ﴿۹۲﴾

Marfat.com

اور مومن کے لئے جائز نہیں کہ ایک مومن کو قتل کرے غلطی سے اور جو مومن کو غلطی سے قتل کرے تو اُسکو چاہیے کہ ایک مومن کی گردن کو (کفارہ میں) آزاد کرائے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے تاوقتیکہ وارثین معاف نہ کردیں پھر اگر مقتول اُن لوگوں میں سے ہے جو تمہارے دشمن ہیں اور وہ خود مومن ہو تو ایک مومن کی گردن کو (کفارہ میں) آزاد کرائے۔ اور جو شخص غلطی سے ایسے شخص کو قتل کرے جو مسلمان نہیں ہے لیکن اُن سے صلح کا قول و قرار ہے تو مقتول کے وارث کو خوں بہا دے اور ایک مسلمان اسیر کی گردن چھڑائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو دو ماہ تک لگاتار روزے رکھے بطور توبہ کے خدا کے حضور میں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

تم سارے قرآن کو پڑھ جاؤ اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے کی تاریخ کو دیکھو تم کو کوئی واقعہ ایسا نظر نہ آئے گا کہ مسلمان نے مسلمان کو غلام بنایا ہو۔ اب حدیث کو دیکھو۔ حدیث نے غلام کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تفریق نہیں رکھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے ساتھ خدا کو غلاموں کے خلاف مالک کا طرفدار بنا دیا ہے جو بھاگے ہوئے غلام کی نماز قبول نہیں کرتا اور غلاموں کی نماز کا زیادہ اجر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی حالت پر قانع رہیں۔ غلاموں کو کوئی حق نہیں۔ اگر اُن کا مالک اُن کو قتل کر ڈالے تو یہ اُسکا مال ہے۔ اُس نے اپنا نقصان کیا صرف تھوڑی سی گوشمالی کا حق ہے۔ اگر اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کریں تو وہ زنا ہوگا۔

(۱) منصور بن عبدالرحمٰن نے شعبی سے اور شعبی نے جریر سے سنا۔ وہ کہتے تھے جو غلام اپنے مالکوں کے پاس سے بھاگ جاوے وہ کافر ہو گیا جب تک لوٹ کر نہ آوے۔ منصور نے کہا تم خدا کی حدیث تو مرفوعاً رسول اللہ صلعم سے مروی ہے لیکن مجھے بُرا معلوم ہوا کہ میں اسطرح اور اس جگہ بصرے میں کہوں (کیونکہ بصرے میں خوارج کا زور تھا)۔ (مسلم)

جریر کی دوسری روایت میں ہے۔ جب غلام بھاگ جائے تو اسکی نماز قبول نہ ہوگی۔

(۲) ایک شخص نے اپنے غلام کو قصداً مار ڈالا تو آنحضرتؐ نے اُسکو سو کوڑے لگائے اور ایک سال کے لئے اُس کو جلاوطن کر دیا۔ اور اسکا حصہ مسلمانوں کے حصے سے نکال دیا (ابن ماجہ)

(۳) ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین آدمیوں کو دہرا ثواب ملیگا ایک تو اس شخص کو جو اہل کتاب میں سے ہو ایمان لایا ہو اپنے پیغمبر پر۔ پھر میرا زمانہ پاوے اور مجھ پر بھی ایمان لاوے اور میری پیروی کرے۔ اور مجھ کو سچا جانے تو اس کو دوہرا ثواب ہے۔ اور ایک اس غلام کو جو اللہ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی اُس کو دوہرا ثواب ہے اور ایک اُس شخص کو جس کے پاس ایک لونڈی ہو۔ پھر اچھی طرح اُس کو کھلاوے پلاوے اور اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے پھر اُسکو آزاد کرے اور اس سے نکاح کرلے اُسکو بھی دوہرا ثواب ہے۔

ایام خلافت میں غیر عرب باوجودیکہ مسلمان ہوتے تھے عربوں کے غلام سمجھے جاتے تھے اور اُنکا لقب

ہوتا تھا۔ یہ موالی باوجودیکہ اُن کی پوزیشن وہی ہوتی تھی جو آریاؤں نے شودروں کی کر رکھی تھی۔ وہ نہایت درجہ زیرک ہوتے تھے اور اپنے علم و فراست سے اکثر صاحب فتاویٰ و اجتہاد ہوئے ہیں۔ عربوں کو یہ بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ یہ حدیث اس ذہنیت کا پتہ دے رہی ہے۔

"عبداللہ ابن عمر نے کہا رسول اللہ صلعم فرماتے تھے بخوبی چلتا رہا کام بنی اسرائیل کا یہاں تک کہ پیدا ہوئے ان میں مولی لوگ اولاد ان قیدی عورتوں کی جو اور قوموں سے لوٹ میں آئی تھیں۔ مولادوں نے فتویٰ دینا شروع کیا اپنی رائے سے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔"

عبدالملک کے زمانے میں قوم زط (جاٹ) اور حبشیوں نے جو عراق میں تھے غلامی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور سخت غدر مچایا۔ اُن کا قول تھا کہ مسلمان غلام ہو کر نہیں رہ سکتا۔ بہت سخت کشت و خون غلاموں اور اُن کے مالکوں کے درمیان ہوا۔ آخر میں قوم زط خارج البلد کی گئی۔ ضرورت تھی کہ ایسے وقت ایسی حدیث شائع کی جائے جس سے غلاموں کو اپنی حالت پر قانع و خوش رہنے کی تلقین ہو چنانچہ یہ حدیث اس کا پتہ دے رہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو غلام نیک ہو اُسکو دوہرا ثواب ملتا ہے۔ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں ابوہریرہ کی جان ہے۔ اگر جہاد نہ ہوتا اور حج اور ماں کے ساتھ سلوک کرنا تو میں یہ خواہش کرتا کہ غلام ہو کر مروں اور ابوہریرہ نے حج نہیں کیا اپنی ماں کی خدمت میں رہے جب تک وہ مر نہیں (مسلم) یا وہ غلام جو مرجاوے اور اپنے مالک کی خدمت کرتا ہو اچھی طرح کیا اچھا ہے وہ۔

غرض کہ حدیث اور اس سے زیادہ فقہ نے غلامی کو ایک باقاعدہ اسلامی انسٹی ٹیوشن تسلیم کیا ہے اور غلامی کے شکنجہ کو بجائے ڈھیلا کرنے کے اور سخت کرنے کے لئے طرح طرح کے اقوال و اجتہاد و قیاس و رائے و روایت سب سے کام لیا ہے۔

ممکن ہے کوئی جوشیلا اہل حدیث یہ سوال کر بیٹھے کہ تمہارے اس قول کی سند کیا ہے کہ مسلمان غلام نہیں ہو سکتا۔ کیا قرآن کی یہ آیت موجود نہیں ہے جس کی رُو سے مسلمانوں کا غلام ہونا تسلیم کیا گیا ہے۔

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۲

اور مشرک عورت سے نکاح مت کرو تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لادیں۔ ایک مومنہ لونڈی ایک مشرک عورت سے بہتر ہے چاہے مشرک عورت تم کو مرغوب ہو۔ اور مت نکاح کرو مشرک مرد سے جب تک ایمان نہ لادیں اور ایک غلام مومن مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو مرغوب ہو۔ وہ لوگ تم کو جہنم کیطرف بلائیں گے اور اللہ اپنی مرضی سے جنت

اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیات کو انسانوں کے سمجھنے کے لئے صاف صاف بتا دیتا ہے۔

پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ مومن غلام اور لونڈیاں کون تھیں جبوقت قرآن نازل ہو رہا تھا۔ عرب میں بردہ فروشی کی
جاری تھی۔ ہزاروں انسان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب عربوں نے اسلام قبول کیا تو ان غلاموں نے بھی اس
قبول کیا۔ ایسے غلاموں کو فوراً اپنے اپنے مالکوں کی خدمت سے آزاد کرانا کسی طرح نہ مالک کے حق میں مفید تھا
غلام کے۔ اسلئے اُن کی آزادی کی دوسری صورتیں تدریجاً پیدا کی گئیں۔ اگر ایک دم سے سارے غلام آزاد کر دئے جا
تو عرب کی سوسائٹی کو سخت صدمہ پہنچتا۔ اور اس سے تبلیغ اسلام میں بھی روکاوٹ پڑتی ازبسکہ یہ غلام غیر
تھے اور عرب کو اپنے نسب و شرافت پر ناز تھا اور کفو کا انھیں بیحد خیال تھا حتیٰ کہ وہ اس کفو اور نسب کی خاطر
کو خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہو مومن غلام پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے کہا ہے کہ خواہ تم کو عرب کی شرا
اور نجابت پر بٹہ لگانا پڑے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ تم مشرک کو اپنا داماد اور خسر بناؤ۔ ان سے بہتر ہے غلام عجمی
وہ مسلمان ہے۔ ورنہ اگر عرب کا مسلمان عبد مومن اور امۃ مومنہ سے مراد لی جائے تو قرآن کو اس کے کہنے کیفر
ہی نہ تھی۔ وہ تو خود ہی مشرک عرب سے بہتر ہے۔ غرض قرآن کے نزدیک نہ کوئی مسلم غلام بنایا جا سکتا ہے ا
فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس سے خدمت لی جا سکتی ہے مگر وہ اس حیثیت سے گویا وہ خاندان کا ہی ایک فرد

## اعتاق و کتابت

اعتاق قرآن کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی اعتاق تھا۔ چنانچہ یہودیوں میں غ
ساتویں سال خود بخود آزاد ہو جاتا تھا۔ قرآن کی جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے جنگ کے قیدیوں کو غلام بنا
سے منع کیا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سورۂ محمد
ارشاد ہوتا ہے:۔

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب ط حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فا
منا بعد و اما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا۔

پس جب لڑائی میں کفار سے تمھارا مقابلہ ہو تو اُنکی گردن مارو یہانتک کہ تم اُن پر غالب ہو جاؤ۔ اور اس
بعد اسیروں کو احسان رکھ کر چھوڑ دو اور یا اُن سے فدیہ لے لو۔

اگر یہ قرآن کی آیت ہے اور حسب معمول اس میں کوئی پیچ نہیں ہے تو معنی بالکل صاف ہیں یعنی اسیروں کو
کر سکتے ہو اور نہ اپنا غلام بنا سکتے ہو۔ ان کو رہا کر دو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر۔ قیدیوں کے لئے اور کوئی
نہیں ہے۔ پس جہانتک مسلمانوں کی جنگ کا تعلق تھا۔ غلامی کا بالکل سدباب قرآن شریف نے کر دیا۔ البتہ

کے باہر جو جنگیں قوموں میں جاری تھیں اور اُن کا نتیجہ غلاموں کی خرید و فروخت میں پیدا ہوا تھا اور جو اسلام کے حدود سے باہر تھے اسکا کیا علاج۔ اس کے لئے مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ غلاموں کو ان ظالموں کے ہاتھ سے خرید سکتے ہوں تو خرید لیں مگر

(۱) غلام کو آزاد کر دیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ (۲) اپنی بدیوں کے کفارے میں غلام کو آزاد کر دیں۔ (۳) غلام سے کتابت کر لیں۔

## پہلی صورت

(۱) فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝

گردن کا غلامی سے چھڑانا یا بھوک کے دن یتیم خصوصاً جبکہ وہ اپنا رشتہ دار ہو یا محتاج خاک نشین کو کھلانا (البلد)

(۲) وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ج

اور اپنے مال کو اُس کی رضامندی کیلئے دیتے ہیں رشتہ داروں کو یتیموں کو مساکین کو فقرا کو اور قیدیوں کے چھڑانے کو

## دوسری صورت

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

تمھاری قسموں میں جو لغو ہیں۔ ان پر تو خدا تم سے مواخذہ نہیں کرتا۔ ہاں پکی قسم کے توڑنے پر خدا تم سے مواخذہ کرے گا تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلا دینا ہے۔ جیسا تم اپنے اہل و عیال کو کھلایا کرتے ہو یا ایک بردے کو آزاد کر دینا۔

(۳) وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں۔ پھر رجوع کر دہی کام کرنا چاہتے ہیں جس کو کہہ چکے ہیں تو ایکدوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے مرد کو ایک بردہ آزاد کرنا چاہیے۔ تم کو نصیحت کیجاتی ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو۔ اللہ کو اسکی خبر ہے۔

اس سے کہ خدائے تعالیٰ نے غلام کے آزاد کرانے کو ایک جرم کا کفارہ یعنی جرمانہ قرار دیا۔ ایک ادنیٰ سمجھ سکتا ہے کہ لونڈی غلاموں کے بارے میں خدا کو کیا منظور ہے اور وہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ خدا اپنے بندوں میں سے کسی کو قید غلامی میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔

Marfat.com

## تیسری صورت

والذین یبتغون الکتب مما ملکت ایمانکم فکاتبوھم ان علمتم فیھم خیرا ق صلے و اتوھم من مال اللہ الذی اتکم ط ج۱۸

اور تمھارے غلاموں میں سے جو مکاتبت کے خواہاں ہیں تو تم اُن سے مکاتبت کر لیا کرو بشرطیکہ تم اُن میں بہتری کے آثار پاؤ۔ اور مال خدا میں سے جو اُس نے تم کو دے رکھا ہے اُن کو دیتے رہو۔

قرآن کے الفاظ صاف و صریح ہیں یعنی غلام کا حق ہے کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے مالک کو اپنی قیمت ادا کر دے۔ مالک انکار نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس پر فرض ہے کہ ایسے غلاموں کی مالی مدد بھی کرے۔

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ عامل بالقرآن غلامی کے قریب بھی جا سکتا ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کرنا نبوت سے سو برس کے اندر ہی ترک کر دیا۔ فقیہہ اور فریسیوں کا زمانہ یاد آیا اور انھوں نے قرآن کے سارے زرّیں اصولوں پر پانی پھیر دیا۔ حدیث و فقہ میں غلامی ایک باضابطہ مضمون ہے اور اس میں طرح طرح کے نکات حل کئے گئے ہیں۔ مگر اس حقیقت پر کہ بردہ فروشی جائز ہے یا نہیں اس پر ایک لفظ نہیں کہا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک عالم اسلام خصوصاً عرب اور حجاز اس لعنت سے سبکدوش نہیں ہوا۔ آخری صدی کے عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ افریقہ میں غلاموں کو جانوروں کی طرح گرفتار کرتے ہیں ڈاکے سے یا چوری سے اور جہازوں میں بھر کر عرب میں لے آتے ہیں اور وہاں اُنکو بیچ ڈالتے ہیں۔ اور یہ عین رسول اللہ صلعم کے مزار اقدس اور کعبہ کے سایہ میں ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ ہماری سیہ بختی کیا ہو سکتی ہے۔ آج جو ہم سے سلطنت چھین لی گئی ہے تو اس لئے نہیں کہ خدا کا فرمودہ انّ الارض یرثھا عبادی الصّلحون غلط ہے۔ نعوذ باللہ۔ بلکہ صالحین ہمارے حاجی اور نمازی نہیں بلکہ وہ قومیں ہیں جو آج زمین کی وارث ہیں۔ جن کی وجہ سے غلامی کی لعنت بند ہوئی ہے۔ میں چند حدیثوں پر اکتفا کرونگا جن سے معلوم ہوگا کہ حدیث نے کس طرح قرآن کے منشا کی مخالفت کی ہے۔ اس نے قرآن کی مخالفت میں رسول اکرم کو بردہ فروش بنا ڈالا۔

(۱) عبداللہ ابن عمر نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو غلام مکاتب کیا جائے سو اوقیہ پر۔ پھر وہ سب ادا کر دے مگر ایک اوقیہ اس کے ذمہ رہ جائے تو وہ غلام ہی رہے گا۔ (ابن ماجہ)

اپنے پاس سے غلام کو مال دینے کا کیا سوال ؟

(۲) جابر کی روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بردے کو بعوض قرض بیچا جسکو اس کا مالک اپنے مرتے وقت آزاد کر گیا تھا۔ (مسلم و ابن ماجہ)

(۳) ایک شخص نے ہم میں سے ایک غلام کو مدبر کیا اور اس کے پاس کچھ دوسرا مال نہ تھا۔ آخرکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو بیچا اور بنی عدی میں سے ایک شخص نے اُس کو خریدا۔

(نووی نے کہا جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ مدبر بیچا نہ جائیگا اور اس کی بیع جائز نہیں اور یہ قول امام ابوحنیفہ اور مالک بن انس کا بھی ہے مگر شافعی نے اس حدیث کی سند سے اس کا بیچا جانا جائز ٹھہرایا ہے)

(۴) جابر کی روایت ہے۔ ہم اپنی لونڈیوں اور ام ولد کو بیچا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود تھے۔ اور ہم کوئی قباحت اس میں نہیں پاتے تھے۔

(۵) جابر کی روایت ہے۔ ایک غلام آیا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہجرت پر اور آپ کو معلوم نہ ہوا کہ یہ غلام ہے۔ پھر اُسکا مالک آیا اُسکو ڈھونڈھتا ہوا۔ آپ نے اس سے فرمایا۔ اس غلام کو میرے ہاتھ بیچ ڈال۔ پھر آپ نے اس غلام کو خریدا دو کالے غلام دیکر۔ بعد اس کے آپ نے کسی سے بیعت نہ لی جب تک آپ دریافت نہ فرمالیتے کہ وہ غلام ہے۔

(۶) عمران بن حصین کی روایت ہے۔ ایک شخص کے چند غلام تھے اس کے پاس اور مال کچھ نہ تھا۔ اُس نے مرتے وقت ان سبھوں کو آزاد کردیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر قرعہ ڈالا۔ دو ان میں سے غلام رہے اور چار غلام۔ (کس کے اور کیوں؟) (وعلی ہذا القیاس)

---

## تتمہ غلامی

# معاشرت اسلامی کا ایک تاریک پہلو اور قرآن کا فتوے

اگر معاشرت و سیاست کو دینی نظر سے نہ دیکھا جائے تو اس مسئلے پر کسی گفتگو کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیونکہ دنیا کا بیشتر حصہ اور خود آج کل کی اسلامی حکومتیں معاملات دنیاوی میں دین کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ مگر اس سے بھی انکار تقریباً ناممکن ہے کہ سیاست و معاشرت کا اساس اخلاق ہے اور اخلاق جزو دین ہے۔ کسی دین نے دنیا میں خداشناسی کے افکار و فلسفہ کے اندر اپنے دائرہ کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ خداپرستی سکھاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خدا سے ڈرے اور جس کام کو اس نے منع کیا ہے اس کو نہ کرے اور جس کا حکم دیا ہے اس کو کرے ورنہ سزا دنیا میں اور عاقبت میں دوچار ہو۔ ان ہی اوامر و منہیات کا دوسرا نام نیکی اور بدی ہے۔ اس کو اخلاق کہتے ہیں جو لازماً جزو دین ہے۔ گو مذاہب نے اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ مثلاً یہودیت میں رہبانیت

تجارت، صنعت و حرفت، لباس و طعام و مباشرت اور سکونت غرضیکہ ہر چیز شریعت یہود کی پابند ہے۔ دوسری طرف عیسائیت میں وہ ڈھیل ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔ اسلام جو ان دونوں مذاہب کے مابین ایک صورت ہے اور مسلمان امت وسطیٰ ہیں۔ اس میں کوئی ایسی راہ ہوتی جس میں نہ یہود کی شریعت کی سختی ہو نہ عیسائیت کی نرمی تو ہم بھی ان لوگوں کے ہم نوا ہوتے جو پاکستان میں شریعت اسلامی کے اجرار کے متمنی ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت اس درجہ یہودیت کیطرف جھکی ہوئی ہے کہ ان دونوں میں برائے نام فرق رہ گیا ہے۔ فقہ شاگردان ابوحنیفہ ہو یا امام شافعی ہو۔ موطأ امام مالک ہو یا مسند امام حنبل۔ ان میں سے کوئی چیز اس قابل نہیں جس پر موجودہ قانون کی بنیاد رکھی جاسکے۔ قرآن کے سوا جو کچھ اس میں ہے وہ قیاسات و موضوعات ہیں اسلئے ناوقتی اور بیشتر غلط و دجل و لایعنی۔ اسلام نے نسلی امتیازات اور کلچر کو تسلیم کیا ہے اور مذہب سے جُدا۔ حضرت شعیب نے جب اپنی قوم کو اسلام کی طرف بلایا تو اسکو اپنی قوم کہہ کر پکارا۔ اور ہم قوم مسلمانوں کو "ملت" کہا ہے اور قرآن نہ بھی تسلیم کرے تو یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام تمام عالم پر تبلیغ ہونے کے لئے آیا ہے اور قوموں میں زبان و معاشرت کا اختلاف ہے۔ البتہ قرآن نے بعض مسائل دنیاوی سیاست میں تعزیر کا حکم دیا ہے مگر اسکی نوعیت[1] بدلنے میں ہمارے اختیارات کو سلب نہیں کیا جب تک سزا کا مدعا قائم ہے قرآنی اصول پر معاملات و سیاست کے قانون بن سکتے ہیں اور بنائے جاسکتے ہیں لیکن ڈر یہ ہے کہ قرآن کے بعض مسائل نافہمی کا شکار نہ ہوجائیں اور قانون کے ساتھ خود قرآن کو ہدف قباحت و ملامت بنادیں۔

اسلامی معاشرت کے دو تاریک پہلو ہیں جو بادی النظر میں قرآن سے جائز و مباح معلوم ہوتے ہیں۔ مگر موجودہ تمدن و شرافت کے لحاظ سے قبیح یہ تعدد ازدواج اور پردہ ہیں۔ ترکی قانون نے ان دونوں کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے اور وہ افراط کے پہلے سرے پر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قانون پاکستان تفریط کے دوسرے سرے پر ہوجائے۔ اس لئے مجھے یہ دکھلانا ہے کہ اگرچہ ان کے بُرے ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر ترکوں کا قانون خلاف قرآن نہیں اور اگر پاکستان نے مولویوں کے دھوکے میں آکر ان کی بات رکھ لی تو اس کا قانون قرآن کے منشا کے خلاف ہوگا اور اسکے ساتھ متمدن ممالک کے لئے مطعون بنے

---

[1] نوعیت کے معنی یہ ہیں کہ قرآن میں ایک جرم کی آخری سزا بتادی گئی ہے۔ اس سے زیادہ سزا دینا ناجائز ہے۔ مثلاً سارق کی سزا قطع ید ہے اور اس کی سو درے۔ یہ بالکل خلاف حکم قرآن اور ناجائز ہوگا اور اگر ان مجرمین کو آخری سزا میں قتل یا سنگسار کیا جائے۔ ہاں یہ بالکل جائز ہے کہ انکو اس سے کم سزا دی یہی اصول تعزیرات ہند کا ہے۔ ڈاکوؤں اور مفسدین کی سزا میں، جلاوطن کرنا۔ الٹا ہاتھ پیر کاٹ ڈالنا۔ اور دار پر کھینچنا۔ ظاہر ہے کہ تینوں تین مختلف نوعیت کی ہیں۔ کم سزا کا اختیار ہے مگر اس سے زائد سزا کا اختیار نہیں اور نہ ایک سزا دوسرے کے ساتھ ملائی جاسکتی ہے۔ درحقیقت یہ مسلمانوں کا بڑا احسان تھا کہ سزاؤں کی حد مقرر کردی ورنہ مسلمان بھی وہی کرتے جو اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی تک انگلستان میں تھا کہ وہاں تقریباً دو سو جرائم کی سزا تھی جس میں پانچ روپے کی معمولی چوری سے لیکر جعل سازی اور عیسائیت کی تردید وغیرہ شامل تھے اور بیچاری بوڑھی عورتیں تو وہ اس شبہ میں زندہ جلا دیجاتی تھیں کہ جادوگرنی ہیں اور انکی شناخت کا بھی عجیب و غریب دستور تھا کہ وہ کسی حالت میں زندہ نہ چھوڑی جاتیں یعنی اُنکے ہاتھ پیر باندھ کر دریا میں چھوڑ دیا جاتا۔ اگر

Marfat.com

تعدد ازدواج سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ایک بیوی اگر بچہ جننے کے قابل نہ ہو تو جب تک پہلی بیوی کو طلاق نہ دے تو دوسری بیوی نہ کرے۔ یہ چیز اخلاقاً کہیں بھی بری نہیں۔ دو بیوی سے بھی اگر اولاد کی تمنا باقی رہ جائے تو تین بلکہ چار کرنا بالکل جائز اور ضروری ہے۔ تعدد ازدواج سے مراد وہ شرعی عیاشی ہے۔ جس میں قرآن کے "ما ملکت ایمانکم" سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے جو بلا تعداد اور بلا نکاح رکھی جاتی ہے اور جن کو بازاروں میں [illegible] کیطرح خریدا جاتا ہے اور بالکل جانوروں کیطرح جب جی چاہا اپنے مصرف میں رکھا اور جب جی چاہا [illegible] دے دیا یا فروخت کر دیا یا بخش دیا۔ یہ لونڈی بازیاں جس کو انگریزی میں CONCUBINAGE (کن کو بیج) کہتے ہیں۔ اسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ لونڈیاں مکہ اور مدینہ کے غلام بازاروں میں خریدی جائیں اور خریدنے سے پہلے ان کے خط و خال، ہاتھ پاؤں کو اسی طرح جانچے جیسا ایک سلوتری گھوڑے کو جانچتا ہے۔ نہیں۔ آپ کسی اغوا کی ہوئی عورت کو ہندستان میں خرید کر کے اسی طرح رکھ سکتے ہیں۔ یا تنگ دست ماں باپ سے۔ بہرحال جب آپ [illegible] ادا کر دیں تو آپ کو ان کی عصمت پر پورا اختیار ہے۔ آپ ہی کو نہیں بلکہ آپ کے دوست و احباب کو بھی۔ ہاں [illegible] کرانے میں قرآن کی ممانعت ہے۔ مگر وہ خود چاہیں تو اور مالک صاحب کو مالی فائدہ بھی ہو تو کوئی گناہ نہیں۔ بعض اوقات سوچا کرتا ہوں کہ رنڈی بازی اور متعہ کو برا کیوں کہا جاتا ہے۔ اسکی صورت بھی تو [illegible] اس پر ابوالفضل کی عیار دانش کا وہ قصہ یاد آیا۔ جس میں ایک شخص اپنے دوست کے پاس [illegible] سے گیا تو وہ صاحب گھر میں سے نکلے۔ ایک ہاتھ میں روپیہ کی تھیلی دوسرے میں تلوار۔ ہمراہ لونڈی [illegible] کہ ہر چیز دوست کے لئے حاضر ہے۔ اور مجھے اپنا ایک تجربہ پچھلی جنگ عظیم کا یاد آیا۔ [illegible] میں [illegible] ایک مقام سرل میں تھا۔ وہاں میں اسٹاف انٹرپریٹر ہونے کی حیثیت سے [illegible] آفیسر تھا [illegible] کے لئے مویشیوں کے خریدنے کا کام میرے سپرد تھا۔ کہ خدا نے سرل سے میری ملاقات [illegible] گورنر نصرت الممالک جس کی حکومت میں سرل کا ضلع تھا دورے پر آئے اور میرے ساتھ قیام کیا۔ [illegible] کی بیوی کو بلا بھیجا اور رات اس کے ساتھ بسر کی۔ کہ خدا [illegible] سخت حیرت ہوئی۔ دوسرے دن میں اس سے پوچھ ہی بیٹھا۔ بڑی سادگی سے جواب دیا [illegible] لونڈی ہے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی بلوا سکتے ہیں۔

اگر یہ چیز قرآن کی رو سے جائز و مباح ہے اور بہت کم دقیقہ رس و نکتہ سنج اس [illegible] آپ کو کرنا ہوگا کہ یہ چیز جو قرآن کے جواز میں ہے [illegible] ہے یا نہیں۔ اگر یہ جائز [illegible] ایک لفظی بحث سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا اور اگر یہ چیز بری ہے تو [illegible] تحقیق لازمی ہے۔

اس کے عمومی جواز سے انکار تاریخی نقطۂ نظر سے نہیں ہو سکتا کہ عرب کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں جس میں یہو
اور اہل بابل و اسور، ہند، چین، مصر، روم و یونان سب شامل ہیں ان میں یہ دستور تھا اور قرآن کے نازل ہونے تک
عرب میں بھی یہ دستور تھا حضرت داؤد اور سلیمان کے پاس تو لاتعداد لونڈیاں تھیں، قرآن کے الفاظ سے بظاہران
کے جائز ہونے کی ایک وقتی سند تو ملتی ہے کہ قرآن نے ان لونڈیوں کے لئے ماضی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مضارع گ
ہوتا تو حال اور مستقبل کا جواز بھی اس سے نکلتا اس لئے سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لونڈیوں کا جواز مفلی ما
کے ذیل میں ہے۔ جیسے شراب خوری یا دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا۔ اب غور کرو کہ قرآن میں اسکی ممانعت صر
کیوں نہیں نکلتی۔ عورتوں اور مردوں کی خرید و فروخت، جنگ و جدال کا نتیجہ ہے فرض کرو کہ قرآن میں اسکو منع کر دیا جا
تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ یعنی مسلمانوں کے ہاتھ پیر تو قرآن کے حکم سے بندھ جاتے ہیں اور مشرکین و کفار مسلمان اسارٰی کے
ساتھ وہی برتاؤ جاری رکھتے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو یا تو خود اپنی عورتوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا پڑتا جیسے
ہندستان کے راجپوت کرتے تھے یعنی لڑائی پر جانے سے پہلے ان کو ہلاک کر ڈالتے۔ اور جب وہ خود کفار پر غلبہ پا
تو ازبسکہ ان کو ان کی عورتوں کو کام میں لانے کی ممانعت ہوتی وہ ان کو اور ان کے معصوم بچوں کو ہلاک کر ڈالتے
اس بڑی برائی سے بچانے کے لئے ان کو اس کی اجازت دیدی گئی کہ اب تک جو بری رسم چلی آتی ہے اس کو ہم
دیں آئندہ خود قوموں کی عقل و تہذیب کی ترقی سے رسم بد خود بخود بند ہو جائے گی۔ البتہ قرآن نے اس قدر کیا
اگر لونڈیاں خود راضی نہ ہوں تو ان سے مجامعت نہ کی جائے۔

اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ عورتیں وہی ہونی چاہئیں جو کفار سے بطور غنیمت جنگ جہاد میں حاصل ہ
کہ لفظی معنی اس کے یہ ہی ہیں کہ جسکو آدمی کا داہنا ہاتھ لڑ کر حاصل کرے رہا ان کو بازار سے خریدنا۔ وہ میرے نزدیک
ما ملکت ایمانکم میں نہیں آسکتا ورنہ پھر تو محذرات اسلام کو اپنے زرخرید غلام سے مباشرت جائز ہوتی اور ا
نہ مسلمانوں نے کبھی کیا ہے اور نہ کبھی گوارا کر سکتے ہیں۔ عورت لڑ کر مرد کو گرفتار کرے ایسا کبھی ہوا تو نہیں مگر آ
حجاب میں عورتوں کے غلاموں کو بھی ما ملکت ایمانکم کہا گیا ہے اور یہاں انکے معنی اسکے شوہر کے غلام ہیں
جنگ میں انھوں نے حاصل کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی خرید و فروخت یا غلامی کا سدباب ہو جا
مسلمان قرآن پر عمل کئے ہوتے۔

اس لئے قانون پاکستان میں ایسی دفعہ کا ہونا بہت ضروری ہے کہ عورتیں جو اغوا کی گئی ہیں یا جن
ورثار انکو فروخت کرنا چاہیں اونکو خریدنا اور انکے ساتھ مباشرت کرنا قطعی ناجائز و حرام ہو۔ میں جانتا ہ
کہ یہ بدعت اسلام میں دیرینہ ہے۔ اور آج تک اسلامی ممالک میں ہوا کیا ہے۔ بلکہ پابند اسلامی ممالک مثل
ٹیونس، حیدرآباد، بھوپال میں بھی یہ بات عام ہے۔ مگر یہ بُرا کام ہے اور قرآن کے جواز میں ہرگز نہیں۔ کیو

معلوم نہیں کہ خلفائے بنی عباس میں ایک خلیفہ ایسا نہیں ہوا جو لونڈی بچہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بجز چند ایک کے سب فاجر و فاسق تھے۔

پردہ کے متعلق جو آیتیں قرآن کی ہیں ان کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں اس مروجہ پردہ کا اگر کہیں جواز ہے تو وہ بدکار عورتوں کے لئے ایک منفی حکم کی صورت میں ہے۔ رہا برقعہ پہنکر عورت کا گھر سے باہر نکلنا تو برقعہ کے رواج دینے والے نہ عقل سے کام رکھتے ہیں نہ قرآن سے۔ قرآن میں تو مسلمان عورتوں اور مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے اپنی نظریں نیچی کریں۔ بھلا برقعہ کے اندر عورت کو کیا شرم و لحاظ کہ وہ اجنبی مرد کو جالی کے پیچھے سے نہ جھانکے۔ یوں کھلے منہ آتی تو فطری شرم کے مارے خوبخود مرد کے سامنے نظر نیچی کرلیتی اور برقعہ کے پیچھے تو وہ بڑے غور اور آنکھیں پھاڑ کر مرد کو دیکھ سکتی اور پسند کرسکتی ہے۔ شوہر صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انکی بیوی کسی مرد پر نظر نہیں ڈالتی۔

برقعہ تو دراصل عورت کو مرد کے دیکھنے کی پوری آزادی دیتا ہے اور جب عورت مرد پر مائل ہو جائے تو اسکو اس کے آگے قدم بڑھانے میں کون روک سکتا ہے اور اگر برقعہ کے بجائے گھر کا بند ہونا مرجع ہو تو یہاں اور بھی خرابی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی عورت نہیں ہے جو اپنے ان عزیزوں سے پردہ کرسکے جو اسکے یا اس کے شوہر کے قریبی رشتہ دار ہیں اور جو شرعاً اور عرفاً قطعاً نامحرم ہیں اور جنکو ایسے مردوں سے زیادہ خلا ملا کا موقع ہے۔ ایسا بھی ممکن نہیں کہ عورت کو اس کا شوہر الف لیلہ کے دیو کی طرح صندوق میں بند کر رکھے۔ پھر یہ پردے کی حماقت جس پر قرآن کا صاد نہیں بلکہ حدیث بھی خاموش ہے مسلمانوں نے کہاں سے اختیار کی ہے جو ان کو جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے اور ان کے قوائے جسمانی اور دماغی کا ستیاناس کردیا۔ ایسی خلاف عقل و فطرت بات وہ قرآن سے باہر ایسی قوموں سے لائے ہیں۔ جن سے انھوں نے قربانی اور لونڈی بازی کی بیہودہ رسم اختیار کی۔ مگر وہ قدیم قومیں اب اس کو چھوڑ چکی ہیں اور شرماتی ہیں اور ہم مسلمان ان کی سنت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ [illegible]

Marfat.com

# اوقاتِ صلوٰۃ

نماز اسلام کی ایسی ہی علامت ہے جیسے ہندوؤں میں گائے کا احترام۔ یہودیوں میں سبت اور عیسائیوں میں
صلیب۔ یہ ہی ایک چیز ہے جس سے ایک مسلم کی غیر مسلم سے تمیز ہوسکتی ہے۔ اسلئے عملی اسلام میں سارا زور نماز پر
نماز کئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ خدا کی تہلیل و تسبیح و تکبیر کے ساتھ سیدھے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔ جھکنا۔ سجدہ کر
طہارت لباس و بدن کے ساتھ۔ اصل نماز تو یہ ہے کہ خدا کی تحمید۔ تہلیل۔ تقدیس۔ تسبیح و تکبیر کی جائے کھڑے ہو کر
رکوع میں اور سجدے میں اور جس نماز میں یہ باتیں شامل نہ ہوں وہ نماز نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کے انبیا تقدیس و تہلیل
قبل طلوع آفتاب و قبل غروب آفتاب اور رات کے وقت فرض[۱] جانتے تھے اور نماز کے اندر وہ ہیکل یروشلم کی طرف رخ
کرتے تھے۔ چنانچہ دانیال کی کتاب[۲] میں دانیال نبی کا ان اوقات میں مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے
لیکن جو چیز غیر خدا کے لئے کی جائے وہ نماز میں شامل نہ سمجھی جائے گی۔ یہودیوں میں سخت ممنوع تھا کہ خدا کی تہلیل و
تسبیح کے ساتھ کسی انسان کا ذکر بھی ہو۔ حتی کہ موسیٰ اور عزیر کا نام بھی نہ لیا جاتا تھا۔ بجز اسوقت کے جبکہ نماز ختم کر
دعا مانگی جائے جب خدا کی تکبیر کے بعد نمازیوں کی جماعت کھڑی ہوتی تھی تو بالعموم اس میں وحی و الہام کے چند مخصوص
جملے خصوصاً زبور اور شریعت موسیٰ کے احکام پڑھے جاتے تھے۔ یہود سجدہ نہ کرتے تھے مگر سامری[۳] یہودیوں میں سجدہ کی
جاتا تھا۔ فی زمانہ یہود نماز کے وقت کھڑے نہیں ہوتے بلکہ ننگے سر ہو کر بیٹھتے ہیں اور نوشتہ جات کو سامنے کھول
لیتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی یہ فرض تھا کہ جہاں نماز پڑھی جائے اور جس لباس میں پڑھی جائے وہ طاہر ہو۔[۴]

---

[۱] Gomer Barchotha سوائے صابیوں کے تمام مذاہب سامیہ میں نماز کے اوقات یہی تھے۔ صابیوں نے نماز کے اوقات سات مقرر
تھے اور مجوسیوں نے پانچ۔ یہود کے اوقات کے بارے میں دیکھو قرآن فخرج علی قومہ من المحراب فاوحیٰ الیھم ان سبحوا بکرۃً وعشیا $\frac{۱۱}{۱۹}$
واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغدٰوۃ والعشی $\frac{۱۵}{۱۸}$

[۲] کتاب دانیال باب ۶۔ آیت ۱۰۔

[۳] ربی بیکاک کا قول ہے کہ یہود اپنی خاص عبادت میں پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔

[۴] Halohoth Jahil ابن میمون۔

Marfat.com

نماز کو عربی میں صلوٰۃ کہتے ہیں۔ نماز عجمی لفظ ہے اور اس کی اور سنسکرت کے الفاظ نمسکار کی ایک ہی اصلیت ہے۔ صلوٰۃ کے لفظی معنی کیا ہیں۔ اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعضوں کی رائے ہے کہ صلوٰۃ صلوین یعنی چوتڑوں کے ہلانے کے معنی میں آتا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا اور درود کے ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی کسی طرف جھکنا ہے یا اونٹ کی نشست ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لفظ عربی کا نہیں ہے بلکہ اسوری ہے جس کے معنی بھیک مانگنا ہے اور عبرانی میں بھی (جیسا مصنف تاریخ فقہ اسلامی کا قول ہے) صلوٰۃ کی اصطلاح نماز کے لئے ہے گو کہ موجودہ یہود میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔ قرآن میں نماز کی تعدیل۔ ترکیب و ترتیب کا ذکر نہیں سوائے اس کے کہ آیہ صلوٰۃ خوف میں ایک اشارہ اس بات کا پایا جاتا ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوتے تھے اور سجدے کے بعد نماز ختم کر دیتے تھے۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں رکوع۔ قیام۔ سجدہ کا ذکر بھی آیا ہے مگر التحیات۔ سلام و دعا کا کہیں ذکر نہیں۔ مگر جہاں بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نماز کو ایک خاص طریقہ سے پڑھا ہے اور چونکہ آپ کا یہ ایک مشہور و ظاہر فعل تھا یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کثرت سے رسول اللہ صلعم کی نماز میں لوگوں نے اقتدا کی۔ پھر اخلاف نے اسلاف کو دیکھا اور یہ ناممکن ہے کہ سلسلہ بسلسلہ وہ طریقہ جاری نہ رہتا اور بھلا دیا جاتا۔ غالباً اسی واسطے قرآن شریف نے نماز پڑھنے کی ترکیب کو مفصل بیان نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی سنت متواترہ سے ضرورت باقی نہ رہتی تھی اور اس میں یہ بھی مصلحت تھی کہ قوموں کے اختلاف عادات و معاشرت میں قرآن کا ایک خاص طریقے کو فرض کر دینا یا اس پر اصرار کرنا مناسب نہ تھا۔ نہ صرف قرآن شریف نے دوسری طرح (اگر ضرورت پڑے) نماز پڑھنے کو جائز کیا ہے (فان خفتم فرجالا او رکبانا) بلکہ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارکان نماز فرض نہیں بلکہ سنت[1] ہیں۔ چنانچہ عمران بن حصین کی روایت جو صحاح میں ہے اس پر دلیل ہے۔ یعنی میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے تو کیسا ہے۔ آپ نے فرمایا جو کوئی کھڑے ہو کر پڑھے افضل ہے۔ اور بیٹھ کر پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر پڑھنے والے کا آدھا ثواب ہے اور لیٹ کر پڑھنے والے کو بیٹھ کر پڑھنے والے کا آدھا ثواب ہے۔ قرآن نے نماز میں جو بات فرض کی ہے وہ اوقات صلوٰۃ ہے (انّ الصّلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً) اور چونکہ قرآن نے نماز کو وقت پر پڑھنے کو فرض کیا ہے اسلئے نہایت صراحت سے متعدد بار اوقات کو نام بنام بتا دیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی عمل جماعت یا سنت متواترہ قابل اخذ نہیں اور یہ صرف اسلئے کہ بغیر وقت کی پابندی کے نماز کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن نے

---

[1] ارکان میں بہت سی باتیں الحاقی ہیں۔ التحیات میں درود کے اندر آل محمد کو شامل کرنا یقیناً علویوں کا پروپیگنڈا ہے۔ میں کبھی قیاس نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلعم نماز میں یہ درود جو مروج ہے پڑھتے رہے ہوں۔ یا اس کے پڑھنے کی ہدایت کی ہو کیونکہ یہ خاندان پرستی ہے جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے اور قرآن کے بالکل منافی ہے۔

اوقات صلوٰۃ میں مذاہب سامیہ قدیم کی تعیین کو مناسب سمجھا اور ان اوقات میں انسان کی ان آسانیوں کا لحاظ رکھا گیا ہے جبکہ انسان فی الواقع نماز کے لئے رجوع قلب سے حاضر ہو سکتا ہے۔ یہی اوقات ہیں جب آدمی اپنے مشاغل و کاروباری زندگی سے فرصت پاتا ہے یعنی جب وہ سو کر اٹھتا ہے یا جب سونے کے لئے بستر پر جاتا ہے اور جب شام فارغ ہو کر اپنے گھر لوٹتا ہے۔

قرآن کی جن سورتوں میں وقت کی صراحت کی گئی ہے وہ یہ ہیں۔ ان میں ابتدائی مکی آیتوں سے آخری مدنی آیتوں تک شامل ہیں۔ جس سے برخلاف قول حدیث یہ ثابت ہوتا ہے کہ نماز ابتداء ہی سے وقت کے تعین سے فرض ہو گئی تھی۔

# سورہ مکیہ

(۱) وسبح بحمد ربک حین تقوم ۝ ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم (طور آیت ۴۸-۴۹)

اور خدا کی تسبیح کرو جب تم (قیلولہ کرکے) اٹھتے ہو اور رات کو اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے چھپ جانے کے بعد (یعنی علی الصباح)

(۲) وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ۝ ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود (ق)

اور خدا کی تسبیح کرو قبل طلوع آفتاب و قبل غروب آفتاب اور رات کو اور نمازوں کے بعد بھی۔

(۳) وتسبحوہ بکرۃ واصیلا ۝ (فتح-۹) اور صبح و عصر خدا کی تسبیح کرو۔

(۴) واقم الصلوٰۃ طرفی النہار وزلفا من اللیل (سورہ ہود ۱۱۴)

اور نماز پڑھو دن کے دونوں کناروں پر (یعنی قبل طلوع و غروب شمس) اور رات کے ایک حصے میں (سورہ ہود)

(۵) وسبح بحمد ربک بالعشی والابکار (مومن رکوع ۶)

اور خدا کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ صبح اور عصر

(۶) واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا ۝ ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلا طویلا ۝ (سورہ الدہر رکوع)

اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو۔ صبح اور عصر اور رات کو اس کو سجدہ کرو اور لمبی راتوں کو اس کی تسبیح کرو۔

(۷) واذکر ربک فی نفسک تضرعا وخیفۃ ودون الجہر من القول بالغدو والاصال (سورہ اعراف رکوع ۲۴)

اور اپنے رب کا ذکر چپکے چپکے عاجزی سے اور گڑگڑا کر صبح اور عصر کرو۔

(۸) فاصبر علی ما یقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا ومن آنائ اللیل فسبح واطراف النہار لعلک ترضی ۝ (طہ۔ رکوع ۸)

اور صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ کہتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح کرو ساتھ حمد کے قبل طلوع آفتاب اور قبل غروب آفتاب رات کے تھوڑے حصے میں تسبیح کرو اور دن کے دونوں طرف شاید تو راضی ہو۔

Marfat.com

(۹) اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس[1] الیٰ غسق الیل وقرآن الفجر ط ان قرآن الفجر کان مشہوداہ ومن الیل فتہجد بہٖ نافلۃ لک قف عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً ○ (بنی اسرائیل رکوع ۹)

نماز پڑھو آفتاب کے ڈھلنے پر جب تک کہ وہ رات میں نہ چھپ جاوے (یعنی عصر) اور صبح کا قرآن۔ بیشک صبح کا قرآن دیکھا جاتا ہے اور رات کی تہجد تو تیرے لئے نفل ہے۔ شاید اس وجہ سے تیرا خدا تجھے مقام محمود تک بلند کر دے۔

## سورۂ مدنی

(۱۰) حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہ قٰنتین ○ (سورہ بقرہ رکوع ۳۱)

نمازوں کی حفاظت کرو خصوصاً نماز وسطی کی۔ اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔

(۱۱) وسبحوہ بکرۃ واصیلا ○ (سورہ احزاب رکوع ۵)

اور صبح اور عصر اس کی تسبیح کرو۔

قرآن کے اوقات نماز میں اوپر کی تمام آیتوں پر غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ قرآن سے جو اوقات نماز واضح ہیں وہ صرف فجر۔ عصر اور عشا کی نماز کے ہیں۔ ظہر اور مغرب کی نماز کا کہیں ذکر نہیں۔ اور یوں بھی درحقیقت ظہر اور مغرب کوئی وقت نہیں بلکہ محض اوقات عصر و عشار میں تقدیم و تاخیر سے پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی عشار کی نماز جلدی پڑھ لی اور کبھی دیر کر کے۔ اسی طرح ظہر کی نماز کبھی دن ڈھلنے کے اول وقت پڑھ لی اور کبھی دن ڈھلنے کے آخر وقت دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے دو علیحدہ اوقات میں نماز ادا کی۔ اور چونکہ آپ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے گمان کیا کہ آپ نے دو وقت کی نماز جمع کی۔ ہم حدیث کی جانچ پڑتال اسی روشنی میں کرینگے کیونکہ میرا اپنا خیال ہے کہ فرقہ مانویہ زنادقہ کے لوگ جو پانچ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے انہوں نے حدیث میں خصوصاً حدیث معراج میں بہت کچھ تلبیس کی ہے۔ اس کی بھی تحقیق حدیث کی روشنی میں ضروری ہے۔ کیونکہ یہ منافقین اسلام پر عجیب طرح سے حملے کرتے تھے۔ ظاہرا وہ اسلام کی طرفداری کرتے تھے مگر باطنا وہ اسلام و مسلمانوں کی جڑ کاٹنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جاوے کہ اوقات صلوٰۃ میں قرآن سے زائد اوقات زنادقہ کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اسکا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو معاشرتی و کاروباری ترقی سے محروم کرنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ اسلام کو ایک سخت و ناقابل عمل مذہب دکھلا کر لوگوں کو اس سے برگشتہ کرنا چاہتے تھے۔

---

[1] دلوک شمس غروب۔ طلوع شمس کے وزن پر آفتاب کی وہ صورت ہے جبکہ وہ ڈھلنا شروع کرتا ہے۔ زوال یہ قول ہو تو ان اوقات میں ظہر و عصر بعض شامل ہو سکتے ہیں۔ اسلئے ظہر و عصر اوقات قریباً یہاں ہیں جیسا روایتوں سے بھی واضح ہے۔

Marfat.com

مجھے یہاں اسکا بھی ذکر کر دینا چاہیئے کہ بعض جرمن مستشرقین کا گمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقات صلوٰۃ میں پانچ وقت کی تعیین کو مجوس سے سیکھا۔ فون کریمر اور گولڈ زہر کی یہی رائے ہے۔ مگر ان دونوں جرمنوں کا یہ وہم و گمان ہے۔ جیسا میں نے قرآن سے دکھلایا ہے۔ قرآن کی کسی آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت نہیں ہوتی۔ بات اصل یہ ہے کہ خود عیسائیوں میں ہی نماز کے تین[1] وقت تھے۔ اور اب بھی رومن کیتھولک عیسائی دن و رات میں تین وقت عبادت کیا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کا نسطوری فرقہ جب ایران پہونچا تو اسوقت مانوی فرقے کا وہاں زور تھا۔ اور اس فرقے نے نسطوری فرقے سے مل کر مذہب کی ایک عجیب ہیئت پیش کی۔ نسطوری فرقے سے ایک فرقہ البجنسیس Albegenses پیدا ہوا جس نے دن و رات میں دس وقت کی نماز اپنے اوپر فرض کر لی۔ یعنی پانچ دن میں اور پانچ رات میں۔ ایشیائے کوچک میں ایک اور فرقہ عیسائیوں کا بنا جو مجوس کے زیر اثر تھا۔ اس نے بھی پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوپر فرض کر لیں Albegensts فرقہ زمانہ وسطیٰ تک یورپ میں پایا جاتا تھا۔ اس کے پیرو جو بگومائل کہلاتے تھے۔ یہ سرویہ و بوسنیہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ پاپائے روم نے ان پر سختیاں کیں تو وہ سب مسلمان ہوگئے کہتے ہیں کہ اُن کے مسلمان ہونے میں اوقات صلوٰۃ جو مسلمانوں کی طرح تھے۔ زیادہ مؤثر ہوئے تو بقول شخصے "وہ الزام ہم کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا"۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلکہ اُن فقہا نے جو مجوس کے ساتھ عراق و عجم میں تھے اُنھوں نے مسابقت کے خیال سے اپنی عبادتوں کو مجوس سے کم پسند نہ کیا اور اوقات صلوٰۃ میں حدیثیں وضع کی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوامر میں شریعت یہود پر بھی عمل کیا ہے جب تک کہ قرآن کے احکام ان پر نازل نہ ہوئے تھے۔ نہ اس لئے کہ آپ خدانخواستہ یہود کی تقلید میں ایسا کرتے تھے۔ بلکہ یہود کی شریعت خواہ وہ کتنی ہی محرف ہو۔ اس کی اصل اسلام ہی تھی اور الہامی۔ مثلاً رجم زانیہ میں۔ گو کہ خود توریت میں رجم زانیہ کے لئے صاف و صریح حکم نہ تھا مگر یہود اس پر عمل کرتے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ آیا تو یہود ایک زانیہ کو حضرت مسیح کے سامنے آزمائشاً لائے کہ دیکھئے آپ اس کو سنگسار کرتے ہیں یا نہیں۔ مگر حضرت مسیح نے اسکا یہ جواب دیا کہ زانیہ پر پہلا پتھر وہ مارے جو بالکل اس گناہ سے پاک و صاف ہو۔ یہود اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ موجودہ محققین اناجیل کی رائے ہے کہ یہ واقعہ جو یوحنا کی انجیل میں ہے الحاقی ہے۔ مگر بالکل یہی بات یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی کی اور آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کتاب اللہ (یعنی توریت میں) رجم کا حکم تھا۔ وہ حذف ہوگیا۔ میں (چونکہ شریعت یہود کا تکملہ ہوں) رجم کا حکم دیتا ہوں۔ مگر اس کے بعد قرآن شریف نے زناکاروں کے لئے سو درّے مقرر کئے مسلم میں عبداللہ بن اوفی سے روایت ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رجم کا حکم دیتے ہوئے سنا ہے

---

[1] ماٹن وسپر۔ دجل یعنی صبح۔ عصر و عشا

Marfat.com

راوی نے دریافت کیا۔ کیا یہ حکم سورہ توبہ کے پہلے دیا تھا یا بعد کو۔ عبداللہ بن اوفی نے کہا مجھے علم نہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلعم رمضان کے روزوں کے فرض ہونے سے پہلے عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے جو یہودیوں کی شریعت میں تھا یا نماز میں بیت المقدس کو قبلہ بناتے تھے جیسے انبیاء سابقین اور یہود کرتے تھے صرف اسلئے کہ آپ کے نزدیک یہود سے زیادہ آپ کو اس شریعت کی پیروی کا حق تھا جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی تاوقتیکہ قرآن نے اس کو منسوخ نہ کیا۔ غالباً آپ اوقات صلوٰۃ میں بھی ایسا ہی کرتے۔ مگر قرآن نے خود اوقات صلوٰۃ کی تعین قدیم شریعت اسلام کے مطابق شروع کر سے کردی تھی۔

فقہ و حدیث کی تدوین سے قبل مسلمانوں میں پانچ وقت کی نماز مقرر نہ ہوئی تھی خوارج میں تین وقت کی نماز تھی اور اسی واسطے اُن کو اطرافیہ بھی کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی اطراف النہار والی آیتوں سے نماز کے اوقات کی تعیین کرتے تھے۔ باطنیہ کا ایک فرقہ جس کے پیرو سمرقند و بخارا میں اب بھی پائے جاتے ہیں وہ بھی تین وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ تیسری صدی ہجری میں خوزستان کے ایک عرب نے جس کا نام طاہر تھا اپنے اوپر پچاس اوقات کی نماز فرض کر لی تھی۔ اس کے پیرو اپنا تمام کاروبار چھوڑ کر لگے ہر وقت نماز پڑھنے۔ اس سے سخت ابتری پھیلی اور خانہ جنگی کی نوبت آئی۔ بالآخر یہ فرقہ تباہ ہوا اور اسی فرقہ سے بعد کو باطنیہ فرقہ نکلا ہے۔ کیا عجب کہ ظاہریت کا ردعمل باطنیت میں ہوا ہو اور اُن کے بعض فرقوں نے نماز کے اوقات گھٹا کر وہی کر لئے ہوں جو درحقیقت مسلمانوں پر قرآن کے رو سے فرض تھے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اوقات صلوٰۃ کے بارے میں عرصہ تک مسلمانوں میں اختلاف رہا اور غالباً یہ اختلاف ہی کی وجہ تھی کہ امام مالک اپنی کتاب موطا میں سب سے پہلے جس چیز پہ حدیثیں لائے ہیں وہ اوقات صلوٰۃ کے بارہ میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ چیز سنت متواترہ ہوتی تو اس کے ایراد و تائید میں کسی روایت کے لانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور ایسا داباجعلنا لنا حدیثا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دو وقت نماز ادا کی۔ اس کے متعلق بھی سیر و مغازی کی کتابوں سے تاریخی شہادتیں بہم ہوسکتی ہیں۔ حتیٰ کہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں بھی بقول عروہؓ اوقات صلوٰۃ کی تعیین میں اختلاف تھا۔ خود صحاح میں ہی حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایسی روایتیں مروی ہیں جن سے اوقات صلوٰۃ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر ملا کر پڑھی اور مغرب اور عشاء ملا کر پڑھی۔ بغیر خوف اور بغیر سفر کے۔ دوسری روایت میں ہے جمع کیا نمازوں کو مدینہ میں ہوتے ہوئے۔ ابن عباس سے پوچھا گیا کہ آنحضرت نے ایسا کیوں کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کی اُمت کو تکلیف نہ ہو۔ تیسری روایت میں ہے

---

لہ الاصابہ (جلد ۵ صفحہ ۲۲) اسد الغابہ (جلد ۱ صفحہ ۲۰)

لہ اس کی تائید میں معاذ ابن جبل کی بھی روایت ہے۔

Marfat.com

مدینے میں آپ نے نماز پڑھی جمع کرکے بغیر خوف اور مینہہ کے۔ چوتھی روایت میں ہے میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعتیں اکٹھا کرکے (یعنی ظہر اور عصر) اور سات رکعتیں (عشا و مغرب) اکٹھا کرکے پڑھیں۔ راوی نے کہا میرا گمان ہے کہ آپ نے ظہر میں تاخیر کی اور عصر اول وقت پڑھی اور مغرب میں تاخیر کی اور عشاء اوّل وقت پڑھی۔ اُنھوں نے کہا میں ایسا گمان نہیں کرتا ہوں۔ پانچویں روایت میں ہے کہ ایک شخص قبیلہ بنی تمیم کا آیا نہ وہ دم لیتا تھا نہ باز رہتا تھا۔ برابر کہے جاتا تھا نماز نماز جب آفتاب ڈوب گیا اور تارے نکل آئے تب ابن عباس نے کہا۔ تیری ماں مرے کیا تو مجھے سنت سکھانے آیا ہے۔ پھر کہا کہ میں نے دیکھا رسول اللہ صلعم کو کہ جمع کیا آپ نے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو۔ عبداللہ بن شقیق نے کہا کہ میرے دل میں خلش رہی تو میں ابو ہریرہ کے پاس آیا۔ اُن سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ قول ابن عباس کا سچا ہے۔ نووی نے کہا یہ سب روایتیں صحیح ہیں اور ترمذی نے کہا ہے کہ میری کتاب میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جس کو ساری اُمت نے چھوڑ دیا ہو مگر حدیث ابن عباس کی مدینے میں دو نمازیں جمع کرنے کی بغیر خوف و سفر و مینہہ کے۔ میں بھی اس حدیث کو صحیح مانتا ہوں صرف اس شرط کے ساتھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں جمع نہیں کیں بلکہ مطابق اوقات صلوٰۃ قرآن کے نمازیں پڑھیں۔ اگر آپ نمازیں جمع کرتے تو وہ قرآن کے اس امر مبین کے خلاف ہوتا یعنی ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتٰبًا موقوتًا۔ البتہ آپ نے مطابق اوقات صلوٰۃ قرآن کے نمازیں پڑھیں۔ چونکہ آپ کو کبھی ظہر کے اوّل وقت اور کبھی ظہر کے آخر وقت اور اسی طرح کبھی عشاء کے اوّل وقت اور کبھی عشاء کے آخر وقت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اُنھوں نے غلطی سے یہ گمان کرلیا کہ آپ نے نمازیں جمع کی ہیں اور یہ ان روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ظہر اور عصر کے اوقات اور عشاء و مغرب کے اوقات درحقیقت ایک ہیں غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کو نماز سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اور اوقات معینہ اور فرضی نمازوں کے علاوہ آپ کثرت سے نوافل پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے اسکو کبھی پچاس کبھی دس کبھی پانچ نمازیں تصوّر کرلیا۔ چنانچہ اب تک بھی مسلمانوں میں اوقات معینہ کے علاوہ اور اوقات صلوٰۃ کے بھی ہیں۔ مثلاً نماز چاشت۔ اشراق۔ اوابین۔ نماز تہجد۔ نماز وتر وغیرہ اب اوّل اس کو دیکھنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوقات معینہ کے علاوہ بھی نماز پڑھتے تھے یا نہیں۔

انس رضؓ کی روایت ہے :۔

ہماری دادی نے جنکا نام ملیکہ تھا بلایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کھانے کے لئے جو اُنھوں نے پکایا تھا۔ پھر حضرت نے اس میں سے کھایا اور فرمایا کھڑے ہو۔ میں تمھاری خیر و برکت کے لئے نماز پڑھوں۔ انس نے کہا کہ میں ایک بوریا لیکر کھڑا ہوا جو بہت بچھانے سے کالا ہوگیا تھا۔ اور اس پر میں نے پانی چھڑکا اور آنحضرت اس پر کھڑے ہوئے اور میں نے اور ایک یتیم نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور بوڑھی دادی بھی آپ کے پیچھے کھڑی ہوئی پھر نماز پڑھائی آپ نے۔ دو رکعتیں پڑھیں اور سلام پھیرا۔

Marfat.com

دوسری روایت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں آئے۔ گھر میں، میں تھا اور میری خالہ۔ آپ نے فرمایا کھڑے ہو میں تمھارے لئے نماز پڑھوں۔ اور اسوقت کسی نماز فرض کا وقت نہ تھا۔ پھر آپ نے نماز پڑھی پھر دعائے خیر کی ہم سب گھر والوں کے لئے سب بہتریوں کی خواہ دنیا کی ہوں یا آخرت کی۔ پھر عرض کیا میری ماں نے اے رسول اللہ صلعم یہ آپ کا چھوٹا خادم ہے۔ اس کے لئے آپ دعا فرمائیں۔ سو آپ نے میرے لئے ہر خیر کی دعا مانگی اور اخیر میں دعا کی کہ یا اللہ اس کا مال زیادہ کر اور اولاد زیادہ دے پھر اس میں برکت عنایت فرما۔

تیسری روایت میں ہے آپ نے مجھے یا میری ماں اور یا میری خالہ کو نماز پڑھائی اور مجھے اپنی داہنی طرف کھڑا کیا اور عورت کو پیچھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ میرے چچا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا وغیرہ اور اس میں عورتوں کے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں۔

اختلافات کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نوافل کو بھی جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے اور اسواسطے لوگوں کا اوقات نماز میں مغالطہ بالکل قرین قیاس ہے۔ ایسا ہی ایک روایت میں ہے علقمہ نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا کیا حال تھا۔ آیا کسی دن کو خاص فرماتے تھے کسی عبادت کے لئے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں۔ آپ کی عبادت ہمیشہ ہر اوقات کی تھی۔ اور تم میں سے کون ہے جو آپ کی طرح سے عبادت کر سکتا ہے۔ (مسلم)

ظہر اور عصر کے اختلاف میں یہ حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظہر اور عصر ایک دوسرے کے معنوں میں بولے گئے ہیں۔

(۱) جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر پڑھا کرتے تھے جب آفتاب ڈھل جاتا تھا (صحاح)

(۲) رسول اللہ صلعم عصر کی نماز پڑھتے تھے اور سورج بلند رہتا تھا اور اس میں گرمی ہوتی تھی اور جانے والا جاتا تھا عوالی مدینہ تک (مدینہ سے آٹھ میل دور بلند ٹیکریاں) اور وہاں پہنچ جاتا تھا اور آفتاب بلند رہتا تھا (صحاح)

(۳) انس نے کہا۔ ہم نماز عصر پڑھ کر قبا کو جاتے تھے، مدینہ سے تین میل تک، اور وہاں پہونچکر بھی آفتاب بلند رہتا تھا۔

(۴) آدمی جاتا تھا بنی عمرو بن عوف کے محلہ تک اور انکو نماز پڑھتے ہوئے پاتا۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے تھے اور دھوپ میرے آنگن سے اوپر نہ چڑھتی تھی یا ابھی سایہ میرے حجرے میں ہوتا۔ (عائشہ رض)

(۶) علاء کہتے ہیں۔ وہ انس بن مالک کے گھر گئے ظہر پڑھ کر اور انس کا گھر مسجد کے پاس تھا۔ پھر جب ہم لوگ

Marfat.com

گئے اُن کے یہاں تو اُنھوں نے کہا تم عصر پڑھ چکے ہو۔ ہم نے کہا۔ ہم تو ابھی ظہر پڑھ کر آئے ہیں۔ تو اُنھوں نے کہا عص
پڑھ لو۔ پھر جب عصر پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا میں نے سُنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ فرماتے تھے کہ
نماز منافق کی ہے کہ بیٹھا سورج کو دیکھتا رہے۔ پھر جب وہ دو سینگوں میں شیطان کے ہو جاتا ہے اُٹھ کر چار چونچیں مار
ہے۔ خدا کو یاد نہیں کرتا مگر تھوڑا۔

(۷) ابن امامہ نے کہا۔ ہم نے عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر انس بن مالک کے پاس گئے اور اُن
دیکھا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں عصر کی۔ تو میں نے کہا اے میرے چچا یہ کون سی نماز ہے۔ اُنھوں نے فرمایا عصر کی اور یہ و
نماز ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

(۸) نماز پڑھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عصر کی۔ پھر جب ہم فارغ ہوئے۔ بنی سلمہ کا ایک آدمی آیا
اور اُس نے عرض کیا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم چاہتے ہیں کہ اپنا ایک اونٹ ذبح کریں اور آرزو رکھتے ہ
کہ آپ بھی تشریف لائیں اور آپ نے فرمایا اچھا۔ پھر آپ چلے اور ہم بھی گئے آپ کے ساتھ اور اونٹ بھی ابھی ذ
نہیں ہوا تھا۔ اور وہ کاٹا گیا اور پکایا گیا اور کھایا ہم نے اسے قبل غروب آفتاب کے (مسلم)

(۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دن کی گرمی آتش دوزخ کے سبب سے ہے۔ اپنی نما
ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو۔ (مسلم)

(۱۰) ہم نماز پڑھتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گرمی کی شدت میں۔ پھر جب کسی سے پیشانی
میں نہ رکھی جاتی تو اپنا کپڑا بچھا کر اس کے اوپر سجدہ کرتا تھا (مسلم)

اسی طرح شب کی نمازوں میں مغرب و عشار کے اوقات ایک دوسرے کے معنی میں سمجھے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت ع
کا قول ہے۔ نماز عشا کو اوّل شب میں پڑھ لینا چاہیے اور سونے سے پہلے ایک رکعت وتر کی پڑھ لی جایا کرے۔ ای
اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی نماز کو عتمہ مت کرو۔ یعنی جسوقت اندھیرے میں عر
اونٹ کا دودھ دوہا کرتے ہیں اور جو مغرب کا وقت ہوتا ہے۔ اسوقت نماز کو مت پڑھو۔ اسی طرح انسؓ کی رو
میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب رات کا کھانا سامنے آوے اور نماز بھی قریب ہو تو کھا
مغرب کی نماز سے پہلے اور مت جلدی کرو نماز کی طرف کھانا چھوڑ کر۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اہل عرب جب رات
کھانا کھانے بیٹھتے یا افطار کرتے تو جلدی فارغ نہ ہوتے تھے۔ حدیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ عرب رات
کھانے کو بہت طول دیتے تھے اور اسی وقت وہ اپنے قصے۔ داستانیں اور روایتیں بیان کرتے تھے۔ قرآن نے
عربوں کی اس عادت کا ذکر کیا ہے۔ جہاں خدا نے مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ جب وہ رسول کے گھر کھانے کے
بلائے جائیں تو باتوں میں لگا کر اُن کو پریشان نہ کریں۔ قرآن کی اس آیت سے حدیث کی اس روایت کی تردید ہو

Marfat.com

جس میں یہ کہا گیا ہے کہ صحابہ رات کے کھانے کے وقت آنحضرت کو جاہلیت اور بنی اسرائیل کے واقعات سنا کر آپ کا دل بہلایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی صبح کر دیتے تھے۔ آجکل کے عربوں کی بھی یہی عادت ہے۔ بلکہ سوائے ہندستانیوں کے تمام دوسری قومیں رات کے کھانے کے وقت کو ہر قسم کے مذکرات میں بہت طول دیا کرتی تھیں۔ مغرب کی نماز کے عرب دا عامل نہ تھے۔ اس کا پتہ ابن ماجہ کی اس روایت سے چلتا ہے۔ یعنی ابن ماجہ نے کہا جب عباس بن عبد المطلب کی یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اُمت ہمیشہ سنت پر قائم رہے گی جب تک مغرب کی نماز میں اتنی دیر نہ کریں جب تک تارے نہ نکل آویں تو میں نے (یعنی ابن ماجہ نے) محمد بن یحییٰ سے سنا وہ کہتے تھے بغداد میں لوگوں نے اس حدیث کو سُن کر بہت اضطراب کیا تو میں اور ابی بکر بن اعین دونوں عوام بن عباد کے پاس گئے۔ اُنھوں نے اپنے باپ کا اصل نسخہ نکالا اور اس میں یہ حدیث نکلی۔

میں نے ان حدیثوں کو اس لئے نقل نہیں کیا کہ میں قرآن کی تائید روائتوں سے کرنے کا عادی ہوں۔ میرے قرآن کے صریح الفاظ کے آگے کسی روایت و قیاس و اجماع کی ضرورت باقی ہی نہیں۔ میں صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ حدیث سے بھی اوقات کی تعیین صاف صاف نہیں پائی جاتی۔ اور نہ یہ گھڑی کی ایجاد سے پہلے ممکن تھا۔ یورپ اور انگلستان میں جاڑے کے دنوں میں ظہر اور عصر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور نہ وہاں دن کو کوئی آدمی ظہر کی نماز ادا کر سکتا ہے۔ اگر قرآن ایک ملک و قوم کے لئے اُترتا تو یقیناً قرآن اوقات صلوٰۃ میں ایسی عمدہ تصریح یعنی اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل کی ضرورت نہ سمجھتا اور صاف فجر۔ عصر ظہر اور مغرب کے اوقات کو نام بنام بتا دیتا۔ جو یہ فی الحقیقت بہترین تفسیر ہے۔ اطراف النہار۔ قبل غروب شمس۔ طرفی النہار۔ اصیلا وعشیا کی۔ یہ بھی قابل نوٹ ہے کہ اس آیت میں لفظ صلوٰۃ ہے جو واحد ہے نہ کہ جمع۔ یعنی ایک نماز سے مراد ہے نہ کئی نمازوں سے۔ جو لوگ اس سے کئی اوقات کی نماز ثابت کرتے ہیں۔ وہ اسپر غور نہیں کرتے کہ اس آیت سے صرف یہ مراد ہے کہ نماز عصر کا وقت آفتاب ڈھلنے سے آفتاب کے غروب ہونے تک یعنی جب تک تاریکی نہ پھیل جائے رہتا ہے۔

نماز پنجگانہ اسلام میں کیونکر پیدا ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ابتدا اس وقت ہوئی جب معراج کی حدیث وضع ہوئی یعنی ساتویں صدی ہجری میں۔ حدیث میں صلوٰۃ خمسہ کی تائید میں اول تو وہی روایت ہے جو میں معراج کے عنوان میں بیان کر چکا ہوں۔ ایک روایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت جبرئیل پانچ وقت آکر رسول اللہ صلعم کے ساتھ نماز پڑھ گئے تھے مگر از بسکہ جبرئیل کا دیکھنے والا رسول اللہ صلعم کی ذات کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا یہ روایت ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے اُس کے سامنے پانچ وقت نمازیں پڑھ کر دکھلائیں۔ مگر یہ حدیثیں کچھ بھی قابل یقین نہیں صرف اسلئے کہ وہ مخالف قرآن ہیں اور فقہاء نے جب یہ مشکل دیکھی تو انہوں نے قرآن کی ایک آیت یعنی فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تصبحون ۰ وله الحمد فی السمٰوٰت والارض

Marfat.com

وعشیاً وحین تظہرون کو لیکر اس کے لئے ایک قول ابن عباس کا وضع کر دیا۔ یعنی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضر
ابن عباس سے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے پانچ وقت کی نماز فرض ہے تو آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا
میں پانچ وقت کی نماز کا اشارہ ہے۔ مگر یہ قیاس و روایت غلط اور بالکل غلط ہے۔ خود کشاف کو ہی اس میں شب
کہ اس آیت سے نماز کے معنی لئے جا سکتے ہیں کیونکہ اس کے سیدھے سادے معنی یہ ہوئے کہ خدا تعالےٰ اپنے بندو
دلاتا ہے کہ تمہارے اوقات کی تبدیلی میں خدا کی عظمت کا اظہار ہے۔ یعنی کیسی پاک ذات ہے وہ جس نے تم کو دن
نصیب کیا۔ تم کو عصر و ظہر و شام دکھلائی واقعی وہ کیسا ہی زمین و آسمان میں حمد کے لائق ہے کہ آفتاب کو نصف
پر لیجاتا ہے اور پھر اس کو رات کے پردے میں چھپاتا ہے۔ قرآن کا یہ تخیل و طرز کلام نہ صرف قرآن شریف میں متعد
ہے۔ بلکہ عبرانی میں بھی بنی اسرائیل کے نوشتوں میں ایسا تخیل موجود ہے۔ دوسرے جو قول ابن عباس سے اس آیت
بارے میں مروی ہے۔ وہ خود ضعیف روایت ہے یعنی صحاح میں اس کا ذکر نہیں۔ برخلاف اسکے مشکوٰۃ کی ایک حد
جو ابن عباس کی طرف منسوب ہے اس میں اس آیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ گناہوں کے بخشوانے میں یہ دعا بہت
ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الحقیقت یہ ایک دعائیہ جملہ ہے نہ کہ اس سے اوقات صلوٰۃ کے احکام مستنبط ہوتے
درایتاً یہ روایت و قیاس یوں غلط ہے کہ اوّل تو بقول حدیث نماز پنجگانہ معراج کی شب کو فرض ہوئی تھی اور یہ آیت
روم کی ہے جو پانچ برس قبل ہجرت نازل ہوئی ہے۔ معراج ایک سال قبل ہجرت ہے۔ دوسرے اگر یہ فرض کر لیا جا
سبحان اللہ کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں اور جہاں جہاں قرآن شریف میں سبحان الذی وغیرہ آیا ہے سب جگہ نماز پڑھنے
معنی ہیں تو اس سے بھی سوائے چار وقت کے پانچ وقت کی نماز ثابت نہیں ہے۔ پس اگر اس آیت سے چار وقت
نماز ظاہر ہے تو نماز وسطیٰ کس کو کہیں گے کیونکہ وسطی تو وہی ہوگی جو تین یا پانچ کے بیچ میں ہو۔ اگرچہ وسطی درحقیقت
ہی نمازوں کی درمیانی نماز ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر پانچ وقت کی نمازیں فرض تسلیم کی جائیں تو نماز وسطیٰ کی تعیین نہیں
بلکہ جیسا حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے ہر وقت کی نماز پر وسطیٰ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر دن و رات میں تین وقت
نمازیں ہوں تو وسطیٰ یقیناً عصر کی نماز ہے۔ اور وسطیٰ کے نماز عصر ہونے پر تقریباً اجماع بھی ہے۔ مسلم میں براء بن
کی ایک حدیث قابل نوٹ ہے اور اس میں قرآن شریف پر ایک اور حملہ ہے یعنی روایت ہے کہ یہ آیت اُتری حا
علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ العصر اور پڑھتے رہے ہم اُس کو جب تک اللہ نے چاہا۔ پھر یہ منسوخ ہوگئی اور یہ آ
حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ تو ایک شخص شقیق کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا اب تو صلوٰۃ
عصر ہے۔ براء نے کہا میں تم سے کہہ چکا ہوں کیونکر اُتری اور کیونکر اللہ تعالیٰ نے منسوخ کیا اور اللہ ہی خوب جانتا

اب دیکھنا یہ ہے کہ ظہر کی نماز جو اس آیت سے ثابت کی جاتی ہے۔ اس کا کسی اور جگہ بھی قرآن شریف
سورہ نور کی آیت پڑھو یاایھا الذین اٰمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الح

ثلٰث مرّٰتٍ ط من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشآء ط ثلٰث عوراتٍ لکم ط (نور) دیکھو اس آیت میں صلوٰۃ فجر اور صلوٰۃ عشاء کے اوقات کو صاف صاف بتا دیا مگر ظہر کے وقت جبکہ عرب قیلولہ کرنے کے لئے کپڑے اُتار کر رکھ دیتے تھے۔ اسوقت یہ نہیں کہا من بعد صلوٰۃ الظھیرۃ یا من قبل صلوٰۃ الظھیرۃ۔ حالانکہ اگر ظہر کی نماز مقرر ہوئی ہوتی تو اس جگہ ضرور اس کا ذکر آتا۔ جیسے دو اور دوسری نمازوں کا۔ حالانکہ قرآن سے خود ثابت ہے کہ تم اسوقت نماز پڑھو جب تم سو کر اُٹھو اور یہ وقت یقیناً عصر کا وقت ہوتا ہے۔ اس سے صبح کی نماز بھی مراد ہو سکتی ہے۔ مگر اس آیت میں اس کے لئے صلوٰۃ الفجر آچکا ہے۔ اس کو بھی جانے دو۔ نماز جمعہ کا ذکر قرآن شریف میں ہے اور یہ قطعی ثابت ہے کہ اسکا وقت اور ظہر کی نماز کا وقت ایک ہے۔ پس اگر ظہر کی نماز مقرر ہوتی تو کیا وہ جمعہ کی نماز کے قائم مقام نہ سمجھ لی جاتی۔ مگر جمعہ کی نماز ایک علیحدہ وقت میں ایک خاص دن فرض کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وہ وقت ہوگا جبکہ اسوقت کوئی نماز نہ پڑھی جاتی ہوگی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز جمعہ کی وجہ سے نماز ظہر ساقط ہو جاتی ہے وہ اس کا خیال نہیں کرتے کہ یہ اصول صحیح نہیں نماز تو صرف ایک ہی صورت میں فقہاء نے ساقط مانی ہے اور وہ عورتوں کا زمانہ حیض ہے۔ مگر اس کی بھی قضا واجب ہے۔ حالانکہ اس ظہر کی کوئی قضا نہیں ہے۔

بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ اطراف النہار کے معنی ظہر کے سیاق عبارت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر اطراف النہار کے معنی سے دن کے دونوں کنارے مراد ہوں تو اس کا ذکر اس آیت میں ہی آچکا ہے۔ مگر خود قرآن میں دوسری آیت میں طرفی النہار آیا ہے جس سے مراد دن کے دونوں کنارے ہیں۔ اطراف النہار اصل میں قبل طلوع الشمس و قبل غروبھا کی تفسیر کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ اسواسطے کہ قبل طلوع الشمس سے تمام رات اور قبل غروب سے تمام دن مراد ہو سکتے ہیں لہذا اطراف النہار کے لانے سے یہ واضح کرنا تھا کہ طلوع الشمس کے کنارے اور غروب شمس کے کنارے سے جو فجر و عصر کا وقت ہے۔ اطراف النہار کے معنی ظہر کے کسی عربی لغت میں نہیں ہیں۔

نماز کے پانچ وقت ہونے میں یہ تو نہ کہونگا کہ مجوس کی نقل ہے۔ البتہ اسلام کی تاریخ پڑھنے سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ ابتدا میں جب مسلمانوں کو مذہب کا جوش تھا تو وہ پسند نہ کرتے تھے کہ خدا کی عبادت میں اُن سے کوئی مذہب بڑھ جائے۔ یہ روایت اس ذہنیت کا پتہ دے رہی ہے:۔ "ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر کوئی لوٹ گیا اور کوئی پیچھے رہ گیا۔ اتنے میں آنحضرت دوڑتے ہوئے آئے اور آپ نے اپنے گھٹنے کھول دئے تھے۔ آپ نے فرمایا خوش ہو جاؤ۔ یہ مالک ہے اُس نے دروازہ کھولا ہے آسمان کے دروازوں میں سے اور فخر کرتا ہے تمہاری وجہ سے فرشتوں پر۔ فرماتا ہے تم میرے بندوں کو دیکھو۔ ایک نماز فرض ادا کر چکے ہیں اور دوسری کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔" گویا واضع حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنا تمام وقت نماز پڑھنے میں صرف کرے۔ اس پر فرشتے بھی عش عش کرتے ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ اس ذہنیت نے معراج کی رات پچاس وقت کی نماز کو وضع کیا ہو۔

جو یا تو کسی واعظ نے ایسی ذہنیت رکھ کر اپنی بدعقلی سے نمازوں کے لئے ایسی ترغیب کی روایتیں وضع کیں۔ یا پھر یہ مغالطہ تھا جو زنادقہ کی طرف سے دیا گیا کہ وہ اسلام کو متشدد دکھلا کر عوام کے قلوب کو برگشتہ کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو عمل حد سے زیادہ کیا جاتا ہے وہ یا تو بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے اور یا صرف چند لوگوں کے لئے قابل عمل رہ جاتا ہے۔ جیسا خود حضرت عائشہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلعم سے کسی نے پوچھا کہ کونسا عمل اللہ کو زیادہ پیارا ہے آپ نے فرمایا جو ہمیشہ ہو مگر تھوڑا (مسلم) قرآن کے پیش نظر صرف تمھاری ذات۔ تمھارا زمانہ اور تمھارا ماحول نہ تھا۔ اسکی نظر کی وسعت تمھارے وہم و گمان میں نہیں۔ وہ ایسا جنچا تُلا حکم دیتا ہے کہ اس حکم سے ایک انچ آگے یا پیچھے بڑھو تو یقیناً نیکی برباد گنہ لازم کے مصداق ہوگے۔ قرآن اپنے اوامر اور نواہی میں تمام دنیا کے۔ تمام زمانے اور تمام معاشرت و عادات پر یکساں عمل کرانا پسند کرتا ہے۔ اگر تم اس حکم سے زیادہ کرنے کی توفیق رکھتے ہو تو تمھاری خوشی۔ لیکن تم کو کوئی حق نہیں کہ تم تمام دنیا کے آدمیوں کو اپنا ہی سا سمجھ لو۔ اسلئے قرآن کے عمومی اوامر و نواہی اور اصول کو اپنے قیاس و وسوسہ نفس سے ایک زمانہ و ملک و معاشرت میں محدود کر دینا درحقیقت قرآن کے منشا کے خلاف ہی نہیں بلکہ ناروا جسارت ہے اور قرآن کی حکمت بالغہ و وسعت نظری کا اپنی بے عقلی اور کم نظری سے مقابلہ۔ اگر تم کو یہ گمان ہے کہ غیر مسلم کی عبادت و شریعت کی سختیوں کے مقابلے میں قرآن کی آسانیاں بچوں کا کھیل ہیں اور تم سے غیر مذہب کے طعنے سُنے نہیں جاتے تو یہ تمھاری سمجھ کا قصور ہے۔ تم قرآن کی لغو تاویل کرو۔ اُس کو محرف کہو۔ ناقص کہو۔ منسوخ کہو۔ اسکے خلاف حدیثیں وضع کرو۔ مگر اہل ذکر کے سامنے تمھاری یہ سب بکواس ہے۔ تمھارے فرشتوں کو اس کی خبر نہیں کہ ان آسانیوں میں کتنی مصلحتیں مضمر ہیں۔ اور کتنی قومیں اپنی معاشرت و عادات کو تبدیل کئے بغیر اسلام کی طرف مائل ہونگی۔ تم ایک خاص ماحول سے متاثر ہو رہے ہو مگر تمھارے بعد ایسا زمانہ آئے گا۔ جسکی حالتوں میں اور تمھاری حالتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ حتیٰ کہ تم اگر زمین پر لیٹنا اور سونا ایک فطری بات جانتے ہوگے تو دوسری قومیں اُس کو بالکل انسانی فطرت و عادت کے خلاف پائیں گی۔ یقیناً تمھاری خود ساختہ شریعت اُن کے لئے بیکار ہوگی۔ لہذا انسانی قیاسات و شریعتیں ایک محدود قوم و زمانے میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ قوم میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ البتہ مسلمانوں پر آفریں ہے کہ اس کلیہ کو اُنھوں نے عجیب طریقے سے نباہا ہے یعنی بجائے شریعتوں کے تبدیل کرنے کے اُنھوں نے اپنی حالت کو بدلنا گوارا نہ کیا۔ تاکہ شریعت قدیم قابل عمل ہو سکے وہ دن کو کارخانوں میں اور کچہریوں میں اور مدرسوں میں نہ جائیں گے تاکہ کہیں ظہر کی نماز قضا نہ ہو۔ اور اگر ظہر کی نماز کا خیال کرینگے تو اُس کو ایسی بے اطمینانی اور بیدلی سے پڑھیں گے کہ اسکا نہ پڑھنا بہتر ہے۔ وہ شام کو تفریح گاہوں میں نہ جائینگے کہ کہیں مغرب کی نماز قضا نہ ہو اور اسی بے اطمینانی اور بیدلی سے مغرب کی نماز پڑھیں گے۔ یہ سوال کہ مسلمانوں نے باوجود قرآن کی صراحت کے اپنے اوپر پانچ وقت کی نماز کیوں فرض کرلی تو اسکا جواب میرے پاس یہ ہے کہ ٹھیک اسی طرح جس طرح رجم زانیہ کو اُنھوں نے اختیار کر لیا اور قرآن کے حکم کو پس پشت ڈالدیا۔ بلکہ اس جوش میں قرآن کو ناقص بنا دیا۔

Marfat.com

# تتمہ مضمون اوقات صلوٰۃ

معارف اعظم گڈھ کا نومبر ۱۹۳۱ء کا پرچہ اتفاقیہ میرے ایک دوست کے ہاں پڑا ہوا مجھے نظر پڑا۔ میں نے اسکو پڑھا۔ ایک مولوی صاحب نے میرے ایک مضمون اوقات صلوٰۃ کے جواب دینے کی کوشش میں معارف کے تین ورق سیاہ کرڈالے ہیں میری گذارش یہ ہے کہ ۵ وقت کی بجائے ۵۰ وقت کی نماز پڑھئے چشم ما روشن دل ما شاد۔ کافر ہے جو نماز کی اہمیت پر یا کثرت عبادت کی خوبی پر کلام کرے۔ میرا سوال تو یہ تھا کہ قرآن کی کس آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے اور اگر میرے نزدیک کوئی ایسی آیت قرآن میں موجود نہیں ہے جس سے تاویل رکیک کے ساتھ پانچ وقت کی نمازیں کھینچا تانی ہی کیجائے تو جسکا ایمان محض قرآن پر ہے نہ کہ حدیث پر مذبذب کیا ہے۔ یا میری طرح وہ کثرت جو ظہر و مغرب کے اوقات پر مواظبت نہیں کرسکتے اور اگر کرتے ہیں تو انمیں یکسوئی اور اطمینان قلب نہیں پاتے ہیں خصوصاً جبکہ سنت متواترہ رسولؐ ہی اوقات صلوٰۃ پر موثر نہیں اسواسطے کہ رسول اللہ صلعم کو لوگوں نے اس کثرت سے دن و رات نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ اسکے عشر عشیر کی بھی اقتدا کرنا ایک ضعیف بندے سے ممکن نہیں جیسا کہ حضرت علقمہ کی اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے :۔

"میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلعم کی عبادت کا کیا حال تھا۔ آیا کسی دن کو وہ خاص فرماتے تھے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ ان کی عبادت ہمیشہ کی تھی اور تم میں سے کون ہے جو اُن کی طرح عبادت کرسکتا ہے۔" تو ظاہر ہے کہ عامل بالقرآن اوقات صلوٰۃ کی سند قرآن ہی سے ڈھونڈھیگا۔ تو تنقیح طلب سوال تو یہ تھا کہ قرآن میں کتنے وقت کی نمازیں فرض ہیں، کون مردود کہتا ہے کہ مسلمان تین وقت کی نمازیں پڑھا کریں۔ کیا نیک کام فرض سے زیادہ کرنا پسندیدہ نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اقل ترین کتنی نمازیں مسلمانوں پر اس طرح فرض ہیں کہ انکا قضا کرنا ترک رکن نماز ہو اور انحراف از قرآن مجید ہے۔ زکوٰۃ کی طرح نماز یا کسی نیک کام کی کوئی حد مقرر کرنا یہ میرا قول تھا۔ اور کب میں مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کررہا ہوں کہ نیک کاموں میں کثرت اور استمرار ضروری نہیں ہے۔ چونکہ مجھے باوجود انتہائی تلاش کے قرآن میں تین اوقات سے زیادہ اوقات نہیں ملے تو مجھے مجبوراً قرآن کے قول کو اور عام مسلمانوں کے عمل کی مطابقت میں تھوڑی سی جستجو حدیث میں کرنا پڑی۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ اوقات صلوٰۃ کے بارے میں حدیثیں مختلف ہیں۔ مگر ساتھ ہی حدیث میں وہ اختلاف بھی نظر آیا جس کی وجہ سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ دو زائد وقت محض اصل اوقات کی تقدیم و تاخیر کے معنی میں ہیں اور دراصل فرض اوقات تین ہی ہیں[1]۔ مثلاً ان دو حدیثوں کی تاویل مطلب یہ

---

[1] ان حدیثوں سے بھی ایک یہی رائے [illegible]

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر پڑھا کرتے تھے جب آفتاب ڈھل جاتا تھا۔ جابر بن سمرہ (مسلم)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے تھے اور سورج بلند رہتا تھا۔ انس (مسلم)

بہر حال یہ امر کہ فرض نمازیں کتنی ہیں۔ اس پر تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ مسلمانوں میں بعد کو سخت اختلاف آ... ہوا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ امام مالک موطا میں جن احادیث کو سب سے پہلے لائے ہیں وہ اوقات صلوٰۃ کے بارے ... میں ہیں۔ ہر سمجھدار اس سے یہ ہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ مسئلہ حدیث کی صراحت کا محتاج تھا ورنہ اس پر اس طرح ... کا اہتمام کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ ابن ماجہ کے زمانے میں ہی کم سے کم مغرب و عشا کے اوقات معینہ میں اختلاف ... رہا۔ جیسا انکی یہ حدیث ظاہر کر رہی ہے :۔

"ابن ماجہ نے کہا جب عباس ابن عبدالمطلب کی یہ حدیث بیان کی گئی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما... میری امت ہمیشہ سنت پر قائم رہے گی جب تک مغرب کی نمازیں اتنی دیر نہ کریں کہ تارے نکل آویں تو میں نے (یعنی ابن ماجہ نے) محمد بن عیسیٰ سے سنا وہ کہتے تھے بغداد میں لوگوں نے اس حدیث کو سنکر بہت اضطراب کیا تو میں اور ابو... بن امین دونوں عوام بن عباد کے پاس گئے۔ انھوں نے اپنے باپ کا اصل نسخہ نکالا اور اس میں حدیث نکلی۔" اسکے ساتھ اسکو بھی نوٹ کرلینا چاہیے کہ عوام بن عباد وہی بزرگ ہیں جو بوجہ تقویٰ کسی سے بات نہ کرتے تھے مگر بقول تدریب الراوی روایت حدیث میں کان یکذب کذبا فاحشا۔

بغداد میں کیوں لوگوں نے اس پر اضطراب کیا۔ اگر مغرب کی نماز کا وقت وہی تھا۔ جو ہم سمجھتے ہیں۔ اس کو بھی جا... دو۔ قرآن کا حکم ہے کہ روزہ اس وقت کھولنا چاہیے جب رات ہوجائے۔ مگر ہم شام کے وقت روزہ کھولتے ہیں۔ اس واسطے کہ بغیر روزہ کھولے ہوئے ہمارا نماز مغرب میں جی نہیں لگ سکتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان دونوں اوقات میں ایسا نقیض ہیں کہ ایک کو کریں تو دوسرا جائے۔ شاید اسی وجہ سے اہل بغداد نے اضطراب کیا ہو اور اب تو اس مشکل کو ... کرنے کے لئے قرآن کا حکم کا عدم کرکے روزہ کھولنے کا وقت سر شام کردیا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں نیکی برباد گناہ لا... کی مثل صادق آتی ہے۔ اوقات صلوٰۃ پر قیل و قال ضرور ہوا ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ وسطےٰ پر اسقدر متضاد حدیثیں ہیں ... وسطیٰ کی نماز ہر نماز ثابت کیجاسکتی ہے۔ اگر اوقات کی تعیین کسی سنت متواترہ سے ہوتی تو اس بحث کی کیا ضرورت۔

مولوی صاحب نے حدیث پر جو طبع آزمائی کی ہے اس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں بجز اس کے ابن عباسؓ کی حدیث کا غلط ترجمہ کرنیکا جو الزام وہ مجھ پر لگا رہے ہیں یعنی وانا اظن ذالک کا ترجمہ اور میں ایسا گ... نہیں کرتا ہوں۔ وہی میں ان پر بھی لگاتا ہوں۔ میری کتاب میں صاف صاف وما اظن ذالک ہے اور سیاق عب... ہی اس جملہ کو کہہ رہی ہے میں انکو رائے دونگا کہ وہ اپنی کتاب کی تصحیح کرلیں۔ ہندستانی چھاپہ خانوں میں ایسی غلطیا... عام ہیں۔ ہاں ایک بات کا مجھے اعتراف ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیثیں موطا میں واقعی کم ہیں۔ بلکہ نہ ہونے کے

Marfat.com

ہیں مگر جو ہیں وہ اگر نہ ہوتیں تو میں موطا کا ترجمہ انگریزی تمام کر دیتا۔ یعنی قرآن کی تحریف اور الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا (البتہ) کی حدیث۔ حضرت ابن عباس کو محدثین کے زمرے میں عباسیوں نے اتنا کھینچا کہ بقول بیات یاران رشیدی" سے یہ کوئی بعید امر نہ تھا جبکہ وہ امام مالک سے اس باب میں شاکی ہو رہے تھے۔ حالانکہ حضرت ابن عباس کا سن آنحضرت کی وفات کے وقت اتنا ہی تھا جتنا حضرت عبداللہ ابن زبیر کا یعنی کوئی دس برس۔ وہ کب رسول اللہ صلعم کی حدیث کے سننے کے قابل ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں حضرت ابن عباس کی طرف ہزاروں حدیثیں منسوب ہیں حضرت ابن زبیر کی مشکل سے ایک حدیث بھی نہیں ہے۔ کیا ایسی موٹی بات بھی حدیث کے رموز و دقائق میں شامل ہے۔

ہاں میں انکا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے قرآن سے بھی قدرے اعتنا کیا ہے مگر مضمون کہہ رہا ہے کہ وہ اس سے سراسیمگی اختیار کر رہے ہیں اور میں وہیں انکو کھینچ کر لانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قرآن سے بہتر حکم اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں قرآن کو آسان ترین کتاب جانتا ہی نہیں بلکہ اس کو چیستان کہنے والے کو مغضوب علیہ سمجھتا ہوں۔ تو آئیے پھر دوبارہ قرآن کو سامنے رکھ کر اوقات صلوٰۃ پر گفتگو کی جائے۔ مجھے امید ہے یقیناً کہ کوئی علت نہیں [illegible] تامل اور غور سے اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ قرآن کے نزدیک اوقات صلوٰۃ وہی ہیں جنکا قرآن نے بصراحت تقریباً دس پندرہ جگہ مکی و مدنی آیتوں میں اعادہ کیا ہے اور ایک ذرہ تاویل کی ضرورت نہیں موجود رہی۔ یہ وہی اوقات ہیں جو بہ عبارت قرآن قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اناء اللیل میں بار بار لائے گئے ہیں — و فی الحقیقت یہی اوقات فطرتاً انسان کی عبادت کے لئے موزوں بھی ہیں اور یہی وجہ ہے قرآن سے پہلے بھی [illegible] کا عمل اس پر رہا ہے جیسا یہود و نصاریٰ کے اوقات صلوٰۃ سے واضح ہے۔ اوقات خمسہ پر اسلام سے پہلے [illegible] فرقہ مانویہ و صابیہ کا عمل رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام کو جو تعلق و مناسبت یہود و نصاریٰ [illegible] و مانویت سے نہیں ہے۔

قرآن شریف میں ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا آیا ہے یعنی تحقیق مسلمانوں پر نماز وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے اور یقیناً قرآن ناقص ہوتا اگر اس حکم کی تائید میں اوقات الصلوٰۃ کی صراحت نہ کرتا یا انکو ایسا مبہم چھوڑ دیتا کہ ہم کو اپنی عقل سے لگانے لگانے پڑتے۔ مگر ایک پوچھنے والا [illegible] حضرت کیا آپ کے نزدیک وہ سب مسلمان احمق تھے جو قرآن کی قرات کو اب تک نہ سمجھے جو آپ [illegible] آج سمجھ رہے ہیں تو اسکا جواب میرے پاس یہ ہے کہ میں تاریخ سے عرب و عجم میں قرآن شریف کو ایک اوقت [illegible] سے شاہ ولی اللہ کے زمانے تک ہندستان اور مصطفیٰ کمال کے زمانہ تک ترکی میں قرآن پردہ [illegible] فی الحقیقت (یعنی میں واقعہ عرض نہیں کر رہا ہوں) کہ قرآن مہجور و مقفل ہو کر اس کی کلید برداری صرف ایسے لوگوں سے متعلق ہو گئی جنھوں نے خود کو اور عوام کو حقیقی مذہب کے پاس جو قرآن میں تھا پھٹکنے نہ دیا۔ یہود و نصاریٰ [illegible]

Marfat.com

کے ہفوات واعمال یا تو وہ لوگ خود نو مسلم بن کر اسلام میں لائے یا جاہل مسلمان ان کی صحبت سے متاثر ہوئے کہ سارے
اساطیر و خرافات جنکو انھوں نے حقیقی اسلام سمجھ رکھا ہے۔ جسکا دراصل قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے معمول ہوگئے
میں نے گن گن کر مطالعہ حدیث میں اسکی تردید شروع کی تھی۔ مگر حق مغلوب ہوا۔ اوقات صلوٰۃ میں کیا ہوا جب مجوس
راہبین نصاریٰ نے جاہل مگر جوشیلے مسلمانوں سے کہا کہ ہماری عبادات کو دیکھو۔ دن میں پانچ وقت تو یوں ہم پرنما
فرض ہے مگر ہم اپنی خانقاہوں میں ہر وقت اپنے معبود کے آگے سربسجود رہتے ہیں۔ رات کو سوتے نہیں دن کو کھاتے
نہیں۔ تو ان مسلمانوں کے پاس اسکا جواب یہی ۔ ہوگا کہ ہمارے پاس بھی پچاس وقت کی نماز تھی۔ اور اگر ہم پڑھتے
نہیں یا پڑھ نہیں سکتے تو اس کی وجہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے کہ بہت گفت و شنید سے اس نے نمازیں تو
گھٹا دیں مگر ثواب اسکا وہی رکھا۔ یعنی فی نیکی دس کے حساب سے دس پانچ پچاس۔ تو ہم مسلمان عبادت میں تم سے
کم نہیں۔ خود ہمارے نبیؐ نے اتنی نمازیں پڑھیں کہ ان اوقات کا شمار ہی نہیں۔ اب بھی ہم میں سے بہت سے ایسے
ہیں جو اشراق، چاشت، اوابین، تہجد میں کوئی کمی نہیں کرتے اور یہ علاوہ پنجگانہ کے ہیں۔ ورنہ تعجب ہے کہ قرآن کی
ان صریح اور صاف عبارتوں پر کیوں مسلمانوں کی نظر نہ پڑی تھی۔ میں یہاں تمام اوقات صلوٰۃ کی آیتوں کو دوبارہ
ترتیب نزول نقل کرتا ہوں اور انکا ترجمہ بجائے خود کرنے کے قاری پر چھوڑ دونگا صرف اپنی طرف سے تھوڑی صراحت
کردوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے زیادہ صراحت اوقات صلوٰۃ کی اور کیا ہو سکتی ہے۔

| امر صلوٰۃ | وقت صبح | وقت عصر | وقت عشاء | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| ۱۔ وسبح بحمد ربک | حین تقوم<br>ادبار النجوم | حین تقوم | ومن اللیل فسبحہ | الطور ۲۸-۲۹) عربی کے لوگ دن بھر کو بھی سو<br>لئے اسلئے حین تقوم میں عصر ہی مراد ہو سکتی ہے ورنہ<br>النجوم کی تکرار زور دینے کے لئے ہے۔ |
| ۲۔ وسبح بحمد ربک | قبل الطلوع الشمس | وقبل الغروب | ومن اللیل فسبحہ | (ق ۔ ۲۹-۳۰) |
| ۳۔ وتسبحوہ | بکرۃً | واصیلا | .. | (فتح ۹ الاحزاب ۴۱) |
| ۴۔ واقم الصلوٰۃ | طرفی النہار | .. | وزلفاً من اللیل | (ہود ۔ ۱۱۴) |
| ۵۔ وسبح بحمد ربک | والابکار | بالعشی | .. | (مومن رکوع ۵) |
| ۶۔ واذکر اسم ربک | بکرۃً | واصیلا | ومن اللیل فاسجد لہٗ<br>وسبحہ لیلاً طویلا | الدھر |
| ۷۔ واذکر ربک تضرعاً وخیفۃ<br>ودون الجہر من القول | بالغدو | والاصال | .. | (الاعراف ۲۰۵) |
| ۸۔ وسبح بحمد ربک | قبل طلوع الشمس | وقبل غروبہا | ومن اناء اللیل | (طہ ۔ ۱۳ |

Marfat.com

| کیفیت | وقت عشاء | وقت عصر | وقت صبح | امر صلوٰۃ |
|---|---|---|---|---|
| پہلے جملے کی تکرار<br>(بنی اسرائیل) صلوٰۃ یہاں واحد ہے۔ جمع نہیں یعنی نماز وقت [illegible] ڈھلنے سے آفتاب غروب ہونے تک درمیان کسی وقت پڑھ لی جائے۔ | ومن اللیل فتہجد بہ | واطراف النہار<br>لدلوک الشمس الی غسق اللیل | وقرآن الفجر | ۹۔ واقم الصلوٰۃ |
| | | والصلوٰۃ الوسطیٰ | | ۱۰۔ حافظوا علی الصلوٰۃ وقوموا للہ قانتین |

دیکھو عصر کے وقت کو کتنے الفاظ میں صراحت کی ہے۔ قبل الغروب۔ عشی۔ اصیل۔ الاصال۔ ودلوک الشمس الی غسق اللیل اسی طرح صبح اور رات کے اوقات خود صلوٰت کے لئے بھی کہیں تسبیح کہیں ذکر کا لفظ استعمال کیا ہے کہ نماز نام ہے عبادت الٰہی کا جو کسی خاص طریقے کا پابند نہیں ہے۔

مولوی صاحب نے خواہ مخواہ ان آیتوں کی تاویل کی ہے۔ کسی تفسیر کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ان آیتوں سے قرآن [illegible] کوئی دوسرے اوقات کی نماز پیدا نہیں کی گئی ۔ ہاں پانچ وقت کی آیت کے لئے جو آیت لکھا نے چنی ہے [illegible] اور یہ وہی فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تصبحون ولہ الحمد فی السموات والارض وعشیا وحین تظہرون اس آیت میں میں نے خود اپنے مضمون میں بحث کی ہے۔ کہ اس میں سرے سے امر کا صیغہ ہی موجود نہیں ہے۔ [illegible] سادے بدوی سے اسکے معنی پوچھو۔ تو وہ یہی جواب دیگا کہ خدائے واحد اپنے بندے کو یاد دلاتا ہے کہ اوقات کی تبدیلی میں خدا کی شان کا ظہور ہے۔ پس سبحان اللہ کیسی وہ ذات ہے جو تم پر دن کے مختلف اوقات قائم کرتی ہے۔ جو لوگ [illegible] سامی زبان سے واقف نہیں۔ انھوں نے ظہر کا لفظ پا کر کود پڑے اور جھٹ سبحان اللہ کے معنی نماز پڑھنے کے [illegible] عجمیوں کے نوشتے کو پڑھیں تو زبور اور الیشعایاہ کے نوشتوں کو بالکل ایسا ہی تحمل پائیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کہ سبحان الذی [illegible] نہیں لے جاتے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ اگر کوئی عالم قرآن کی کسی ایک آیت سے اوقات خمسہ کی صراحت بتا دے تو میں [illegible] رجعت کی حقیقت کیا تھی جس کا معارف میں چرچا کیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت کو دنیا کی دوسری صحبت کیلئے اٹھا رکھتا ہوں۔ [illegible] اس عقیدے سے ایک پنج نہیں ہٹا کہ قرآن ہمارے دینی اور دنیاوی امراض کی مکمل شفا ہے [illegible] نہیں۔ مگر قرآن کے آگے کسی قول و عمل کی کوئی حقیقت نہیں۔ خصوصاً جب اس کا ثبوت رسول کے عمل تواتر و مشاہدہ سے نہیں ملتا۔

Marfat.com

# ایام صیام

مذاہب میں روزہ کسی طبی اصول کو مدنظر رکھ کر فرض نہیں کیا گیا اور نہ درحقیقت روزہ رکھنے سے مذہب کا خیال اصلاح معدہ تھا۔ اس سے مقصود محض امتثال امر ربانی ہے یا مذہب کی ایک عظیم الشان یادگار کو ہر سال تازہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ نہ انسان بھوکا رہ کر خدا پر کوئی احسان کرتا ہے اور نہ بزعم صوفیہ اس سے روحانیت پیدا ہوتی ہے۔ اسلا ایسی روحانیت و رہبانیت کا قائل نہیں۔ اگر بھوکے رہنے سے معدے پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے تو وہ ایک اتفا نتیجہ ہے۔ ورنہ جہاں تک مسلمانوں کے روزے کا تعلق ہے یہ فائدہ مدنظر نہیں۔ اسلام میں روزے کی غرض وغای اسقدر ہے کہ خدا نے ایک حکم دیکر ہماری آزمائش کی ہے کہ ہم کس قدر اس حکم کی تعمیل کرکے اس کے وجود کا اقرار عملی ط سے کرتے ہیں۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے یا یہ سمجھو کہ وہ انسان کی اس عادت کو جانتا ہے کہ بندہ ہر امر کی علت وغایت پر کچھ بحث کرنے لگتا ہے اسلئے روزے کا یہ سبب بتا دیا کہ وہ اسلام کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتا جبکہ خدا نے قرآن کو انسان پر نازل کیا۔

قبل اس کے کہ میں اس مضمون پر کچھ کہوں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ میں حدیث کی مخالفت اسوجہ سے کرتا ہوں کہ اس میں اکثر یہودیت کی تقلید ہے۔ لیکن یہ الزام میرے اوپر غلط ہے۔ کیونکہ میں تو یہود و نصاریٰ کے مذاہب کو خود ایسی ہی مسخ شدہ اسلام کی صورت سمجھتا ہوں جیسی اہل فقہ و حدیث کے اسلام کی بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ قرآن کے بہت سے احکام یہود کے مسائل کی روشنی میں بخوبی جانچے جا سکتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ مایقال لك الا ما قد قیل للرسل من قبلك ان ربك لذو مغفرۃ و ذو عقاب الیم ۴۱۔ یعنی میرے نزدیک اسلام کا معیار قرآن ہے۔ اگر قرآن کی تائید میں توریت۔ انجیل و حدیث ہے تو ہم کو قرآن کے معنی سمجھنے میں بے انتہا مدد ملتی ہے۔ اور اگر اسکی تائید میں قرآن نہیں ہے تو میرے نزدیک وہ سب اختراعی باتیں ہیں۔ یقیناً قرآن نے جو اسلام پیش کیا ہے یہی اسلام یہود و نصاریٰ پر پہلے پیش کیا گیا تھا اور یہود و نصاریٰ میں جو باتیں قرآن کی تائید میں ہیں۔ وہی درا ان نوشتوں میں الہامی تھیں ورنہ باقی الحاقی۔ لیکن اگر احکام شریعت و قصص انبیاء میں یہود ایسی باتیں کرتے ہیں جو قرآ میں مذکور نہیں یا اس کے برخلاف ہیں اور بالکل وہی باتیں حدیث میں پائی جاتی ہیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حدی نے وہ باتیں براہ راست یہود سے لیں۔ لیکن برخلاف اس کے اگر قرآن کے احکام کی تائید یہود و نصاریٰ کے نوشتوں

ہوتی ہے اور اس کے برخلاف حدیث میں ہے تو ہم حدیث کی تردید میں قرآن کا بیان ہی کافی نہ سمجھیں گے بلکہ ہم کو یہ بھی کہنے کا حق ہوگا کہ قرآن کے جو معنی صحیح ہیں وہ وہی ہیں جو قرآن کی عبارت سے ظاہر ہیں اور یہ معنی یہود کے نوشتوں میں بھی ہیں اسلئے یقیناً قرآن کے جو معنی حدیث نے لئے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اسکی دو مثالیں خود آیت صیام میں مل سکتی ہیں۔

یہود میں افطار کا وقت رات کا ہوتا تھا جبکہ آسمان پر تارے نکل آتے تھے اور روزہ اسوقت سے رکھا جاتا تھا کہ وہ سفید تاگے کو سیاہ تاگے سے پہچان لیتے تھے۔ قرآن کے الفاظ بالکل صاف ہیں جو اس طریقے کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) ثم اتموا الصیام الی الیل - پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۲) وکلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر

اور کھاؤ پیو یہانتک کہ کالا دھاگہ سفید تاگے سے صبح (کے سبب سے) دکھلائی دینے لگ پڑے۔

باوجودیکہ مسلمانوں ہی میں ایک فرقہ یعنی اہل تشیع کا قرآن کے صاف الفاظ کی پیروی کرتا ہے لیکن [illegible] پر تو بالکل عمل نہیں کرتے اور دوسرے کے معنی غلط لیتے ہیں اور غضب یہ ہے کہ دونوں امور کی تائید میں حدیث لاتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی حدیث قبول نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص جس کو ذرا سی عربی آتی ہے لیل کے معنی وہی سمجھیگا جبکہ تارے سامنے نکل آئیں۔ شام یا مغرب کے وقت پر لیل کبھی بولا نہیں جاتا۔ اسی طرح خیط ابیض اور خیط اسود سے رات کی سیاہی اور صبح کی سفیدی مراد لیتے ہیں اور اسکی تائید میں ایک دو روایتیں بھی وضع کر دی ہیں۔

مثلاً سہیل بن سعد سے روایت ہے کہ جب آیت کلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من [illegible] نازل ہوئی تو لوگ روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے وقت رات کو اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ ڈورے [illegible] کھاتے پیتے رہتے تاوقتیکہ ان دونوں میں تمیز ہونے لگے (صحیحین) یہانتک تو غنیمت تھا [illegible] کا مدعا تھا۔ مگر عدی بن حاتم کی روایت دیکھو جو مسلم میں ہے۔

عدی بن حاتم نے دو ڈورے اونٹ باندھنے کے ایک سفید اور ایک سیاہ اپنے تکیے کے نیچے رکھے اور [illegible] کچھ حصہ باقی رہ گیا تو وہ ان کو دیکھنے لگے مگر کچھ تمیز نہ کر سکے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے اپنے تکیے کے نیچے خیط ابیض و خیط اسود رکھے تھے مگر کچھ تمیز نہ کر سکا۔ آپ نے فرمایا [illegible] کے نیچے خیط ابیض و خیط اسود آگئے تو تمہارا تکیہ ضرور بڑا لمبا ہوگا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ خیط ابیض و خیط اسود کیا ہے۔ کیا وہ دو ڈورے نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا تمہاری گردن ضرور لمبی ہوگی کہ تم نے دونوں خیط دیکھ لئے اس کے بعد آپ نے فرمایا نہیں بلکہ اس سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔

کیا یہ حدیث قرآن کی تائید واقعی کر رہی ہے۔ میں نے آج تک کبھی آسمان پر سفید و سیاہ دھاگے [illegible] اور اگر نظر ہوئی تو عرب سے مخصوص ہوگی۔ وہاں کی فضا [illegible]

ہے۔ مگر جن ممالک میں صبح کے وقت کہر اترتا ہے اور آسمان کو کوئی آٹھ بجے تک نہیں دیکھ سکتا۔ وہاں اس پر کیسے عمل ہو سکتا ہے۔ میں نے خود بھی اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے۔ عراق و عجم میں بھی صبح کے وقت یہ خطوط نظر نہیں آتے۔ اب بتائیے اگر قرآن کا یہ مطلب ہے تو بالکل فضول بات کہی گئی اور یا پھر اس سے یہ مراد لی جائے کہ جب خوب دھوپ نکل آئے اور کہرا غائب ہو جائے اُس وقت تک آدمی کھائے پیئے۔ مگر قرآن کسی عجمی کی بنائی ہوئی حدیث نہیں ہے۔ اُس نے دو طریقہ روزے کے شروع کرنے کا بتایا ہے جو یہود کو بتایا تھا۔ اور اس زمانے میں بجائے اس کے ہمارے لئے گھڑیال ہے جو وہی سفید و سیاہ تاگے کے معنی پورے کر رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کی عبارت میں کیا پیچ تھا جو اس کی اس طرح تاویل کی گئی۔

قبل نزول قرآن سب سے بڑی یادگار کا وہ دن سمجھا جاتا تھا جبکہ بنی اسرائیل نے فرعون کے جبر و استبداد سے نجات پائی تھی۔ اور اسلئے یہود میں تشریق یعنی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو ایک روزہ اس یادگار میں رکھا جاتا تھا کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ ہم کو یہود سے زیادہ اس کا حق ہے کہ اس روزے کو رکھیں۔ اور آپ نے یہ روزہ رکھا۔ مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال آپ پر وہ احکام صیام نازل ہوئے جو سورہ بقرہ کے ۲۳ رکوع میں بالتفصیل موجود ہے۔ ان احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو رمضان کے چند دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے اُن سے پہلے کے مسلمانوں کو دیا گیا تھا تاکہ وہ لوگ خدا کے حکم کی تعمیل سے یہ ظاہر کریں کہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں۔ مریض و مسافر اپنے روزے کی قضا دوسرے دنوں میں پورا کرلیں اور جو مریض و مسافر صاحب استطاعت بھی ہوں وہ رمضان کے ایام صیام میں فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر دے سکتے ہیں اور اسکے ساتھ قضا رکھیں تو اچھا ہے اور نہ رکھیں تو یہ فدیہ کافی ہے۔ اگر مسلمان معتکف ہو تو رات کو اپنی بی بی سے مباشرت نہیں کر سکتا۔ ورنہ اجازت ہے۔

اس مضمون میں صرف ایام صیام سے بحث کرنا ہے۔ سب سے پہلے قرآن کی وہ آیت جس میں روزے کے دنوں کی تعیین کی گئی ہے قابل غور ہے:۔

یاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (پ۲) مسلمانو! جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب پر روزہ رکھنا فرض تھا۔ تم پر بھی فرض کیا گیا تاکہ تم خدا سے ڈرو۔ گنتی کے چند روز ہیں۔

ایامًا معدودٰت کے کیا معنی۔ گنتی کے چند روز۔ اگر تم کو عربی آتی ہے تو غالباً تم جانتے ہوگے کہ ایام بروزن افعال جمع ہے یوم کی اور جمع قلت ہے یعنی وہ جمع جو دہائی سے نہ بڑھے۔ اگر اہل عرب سے ملنے کا اتفاق ہو تو تم کبھی کسی عرب کو ثلاثین ایام کہتے ہوئے نہ سنوگے۔ یا عشرین یا خمسین ایام۔ یعنی تین دن ۹ تک تو کہ

Marfat.com

جمع ایام بول سکتے ہو۔ اس کے آگے اہل نجد کو تو میں نے بولتے ہوئے نہیں سنا۔ اہل حجاز و مصر کو البتہ میں نے تین سے کم کے اعداد پر ایام لاتے ہوئے سنا ہے۔ مگر اُن کی عربی سوقی ہے۔ مستند نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے یہاں سات دن کو ہفتہ اور تیس دن کو مہینہ کہتے ہیں ایسے ہی عرب میں بھی بولا جاتا ہے لیکن جب ایاما معدودات ہے تو پھر وہ کسی طرح ۲ سے کم اور ۹ سے زیادہ پر بولا ہی نہیں جاتا۔ خود قرآن شریف میں [illegible] ایاما معدودات آیا ہے اور وہاں اس سے تین دن مراد لئے گئے ہیں۔

یہود کا یہ پُرانا عقیدہ تھا کہ ان کی قوم تین دن سے زیادہ دوزخ میں نہ رہے گی۔ حضرت [illegible] جاتا ہے کہ وہ تین دن دوزخ میں رہے۔ قرآن میں آیا ہے:۔

وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات (پ)

اور وہ کہتے ہیں کہ آگ اُن کو نہ چھوئے گی۔ مگر چند دنوں کے لئے۔

معلوم نہیں جلالین نے اسکی تفسیر میں چالیس روز کہاں سے پیدا کئے۔ حالانکہ یہود کا عقیدہ تین دن کا ہے [illegible] ایاماً معدودہ کو چالیس دن کہنا خود غلط ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں ہے:۔

واذکروا اللہ فی ایام معدودات فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ (پ)

اور اللہ کو ان تین دنوں میں یاد کرو (جو ایام تشریق کہلاتے ہیں) اور جو دو دن میں عجلت کی وجہ سے [illegible] اس پر بھی گناہ نہیں ہے۔

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ رمضان[1] کے روزے ابتداء میں تین ہی دن کے فرض تھے۔ [illegible] معدودات سے تیس دن ہرگز ہرگز مراد نہیں۔ نہ معناً نہ تاریخاً۔ پھر یہ تیس روزے کہاں سے [illegible] قرآن کی جو لوگ سند پیش کرتے ہیں۔ اُن کا عروۃ الوثقیٰ یہ آیت ہے:۔

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینٰت من الھدیٰ والفرقان فمن شھد منکم الشھر [illegible]

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کا رہنما ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کے کھلے حکم ہیں۔ تو میں تم سے جو شخص اس مہینے کو پاوے یا اس میں موجود ہو جائے تو اُسکو روزے کا مہینہ پاوے۔

اگر رمضان کے پورے مہینے کا حکم اس آیت میں ہوتا تو یقیناً اس آیت کے [illegible] فعدۃ من ایام اُخر میں ایام کا لفظ نہ بولا جاتا بلکہ من شھر اخر بولا جاتا۔ لیکن رمضان کے [illegible] رمضان کی قضا کبھی نہیں رکھی جاتی۔ یہ ضرور ہے کہ شہر رمضان بولا گیا ہے۔ لیکن وہ انزل فیہ القرآن [illegible] اور یہ معلوم ہے کہ قرآن لیلۃ القدر میں نازل ہوا۔ جو آخری عشرہ رمضان میں ایک تاریخ ہے اور [illegible]

---

[1] سیرۃ نبوی علامہ شبلی جلد دوم [illegible]

Marfat.com

یادگار کے قائم کرنے کا کبھی خیال ہوتا تو یقیناً اس کی تاریخ میں اختلاف نہ ہوتا فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک جو میں نے اوپر لکھے ہیں یعنی تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پاوے یا اس میں موجود ہو چاہیے کہ اسکو روزہ کا مہینہ بنا دے یا اسمیں روزے رکھے۔ اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں یعنی رمضان کے ایام معلوم ہیں روزے رکھے جو ایام لیلۃ القدر کی مختلف تاریخوں پر حاوی ہونے چاہئیں۔ فلیصمہ میں ہ راجع ہے شہر کی طرف اور اس سے بعض نے یہ کہا ہے کہ سارا رمضان مراد ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مگر شھر رمضان میں "الذی انزل فیہ القرآن" کی صفت لگی ہوئی ہے جو اُس کو محدود کر دیتی ہے چند دنوں میں جیسا خود قرآن نے ایاماً معدودات میں اشارہ کیا ہے۔ دوسرے معنی شہر کے چاند کے ہوتے ہیں۔ یعنی تم میں سے جو شخص رمضان کا چاند دیکھے تو روزہ رکھے مگر اس سے بھی مطلب میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ البتہ ایک نکتہ اس جملے میں قابل لحاظ ہے یعنی سوال یہ ہے کہ وہ کون سے لوگ تھے جو رمضان کا مہینہ نہیں پاتے۔ ظاہر ہے کہ ہر مریض و مسافر کے لئے نہیں ہے۔ جو لوگ دنیا میں زندہ نہیں ہیں اُن سے بھی مراد نہیں ہے۔ یقیناً وہ ایسے ملک کے رہنے والے ہیں جن کے ہاں چھ مہینہ دن اور چھ مہینہ رات ہوتی ہے۔ اور جس کو اس زمانہ میں سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب بحث دو باتوں پر منحصر ہو جاتی ہے۔

(۱) آیا قرآن میں ایاماً معدودات کا حکم قرآن کی کسی آیت یا حدیث سے منسوخ ہے؟

(۲) آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہیں؟

اوّل۔ کیا قرآن کی پہلی آیت صیام منسوخ ہے۔ میں قرآن میں ناسخ و منسوخ کا قائل نہیں ہوں لیکن حنفیہ حدیثوں کو بھی آیت قرآنی کا ناسخ مانتے ہیں اور جنھوں نے پچاسوں آیتوں پر ناسخ کا حکم لگا دیا ہے وہ بھی کم سے کم اسکو تسلیم کرتے ہونگے کہ جو بات مسئلہ ناسخ و منسوخ میں سب سے عجیب و غریب ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی عبارت کے اندر ناسخ و منسوخ کو تسلیم کیا جائے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ مبتدا کے جملے میں پہلے ایک حکم دیا گیا اور خبر کے جملے میں مبتدا کے جملے کی تردید کر دی گئی۔ اگر ناسخ و منسوخ کی یہ صورت مانی جائے تب تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت صیام میں "ایاماً معدودات" منسوخ ہے اور فمن شھد منکم الشھر ناسخ ہے۔ مگر باوجودیکہ مفسرین نے ایاماً معدودات کو منسوخ مانا ہے۔ یہ قول قابل اعتبار نہیں ہے اور قرآن کے ساتھ اسقدر سخت بے ادبی ہے کہ میرے خیال میں اس عقیدے کا رکھنے والا اپنے کو مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں رکھ سکتا۔ اور وہ یقیناً نصاریٰ اور غیر مسلم کا ہمنوا ہے قرآن کا دشمن ہے۔ ناسخ و منسوخ کے لئے یہ ضرور فرض کرنا پڑے گا کہ ایک حکم اُمت میں کچھ عرصے تک جاری رہا جب اس حکم کا تجربہ ہو لیا اور حکم قابل تبدیلی نظر آیا تو دوسری آیت سے بدل دیا گیا۔ گو کہ یہ عقیدہ ہی خدائے کے علم و خبر پر سخت حملہ ہے لیکن اس مضحکہ خیز قول سے کہ قرآن ایک ہی جملے میں اپنی تردید کرتا ہے۔ بدرجہا بہتر ہے۔

Marfat.com

خیر اسکو بھی مان لو کہ پہلی اور دوسری آیتیں مقدم و موخر ہیں اور دو وقفے کے بعد نازل ہوئی ہیں اور اسکو بھی مان لو کہ ان دو آیتوں کے نزول میں اتنا وقفہ بھی تھا کہ عربوں کو روزہ رکھنے کی عادت پڑ گئی تھی کہ اسوقت پہلی رعایت ایاما معدودات اور فدیہ مساکین بہ عوض روزہ منسوخ ہو گئی تو میں پوچھتا ہوں کہ کفار عرب کی عادت ہی کے لئے یہ رعایت کیوں بخشی گئی ہر زمانے میں غیر مسلم اسلام لائینگے تو انکے لئے بھی پہلا حکم اسوقت تک قائم رہیگا جب تک کہ انکو روزہ رکھنے کی عادت نہ پڑ جائے۔ اور پھر عادت پڑنے کے معنی کیا ہوئے جب آدمی نے دو تین روزے رکھ لئے تو اسکی عادت یوں ہی روزہ رکھنے کی ہو گئی۔ خواہ دس روزہ رکھے یا مہینہ بھر۔ فاین تذھبون

صیام کی آیتوں میں پہلے یہ دیکھو کہ آیا فی الواقع یہ آیتیں ایک زمانے کی ہیں یا مختلف زمانوں کی۔ ان آیتوں [illegible] یاایھا الذین سے یکر کذلک یبین اللہ ایتہ للناس لعلھم یتقون تک خوب غور سے دیکھو۔ تم کو معلوم ہوگا [illegible] اس میں دو مختلف مگر قریب کے اوقات کی آیتیں جمع ہیں یعنی پہلے وقت کی آیت تو یاایھا الذین سے شروع ہو کر لعلکم تشکرون پر ختم ہو گئی جس میں ایاما معدودات اور فمن شھد منکم الشھر دونوں آ گئے۔ اس کے بعد دوسری بحث والی آیات اذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوالی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون [illegible] بالی۔ اور پھر ارشاد ہوتا ہے احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن [illegible] انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم فالئن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ [illegible]

آخری آیتوں سے بہت سی شک میں ڈالنے والی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اول تو یہ کہ مسلمانوں کو پہلے [illegible] وہ رمضان کے دنوں میں رات کو بھی عورتوں سے علیحدہ رہیں۔ لیکن مسلمانوں پر یہ حکم شاق گزرا اور [illegible] معاف کر دیا۔ اب پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ یہ حکم قرآن میں کہاں تھا جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا [illegible] نہیں ہے اسلئے ماننا پڑیگا کہ قرآن کے احکام مہمل ہوا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلعم [illegible] فرض کیا گیا تو کسی نے شاید پوچھا کہ رات کو عورتوں سے مباشرت بھی کی جائے حالانکہ اس قسم کے سوال کرنے کی [illegible] مسلمانوں کو ہو چکی تھی کیونکہ یہود نے اس قسم کے سوالات پیش کر کے [illegible] نے بتا دیا اُن کو رات کو بھی علیحدہ رہنے کا حکم [illegible] چونکہ یہود کا قاعدہ تھا کہ وہ روزے کی راتوں میں بیویوں سے [illegible] طریقہ بطور نمونہ کے تھا۔ انھوں نے رات کو بیویوں سے علیحدہ رہنا شروع کر دیا [illegible] تھے وہ اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے [illegible] میں قرآن کو بعد میں بتا دینا ضروری ہوا کہ رات میں عورتوں سے مباشرت [illegible] اس صورت [illegible] میں ہو جائز ہے۔

Marfat.com

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی روزے تین دن کے تھے تو وہ اسقدر کم تھے کہ اس قسم کی کوئی حجت پیدا
ہوسکتی تھی۔ اسلئے یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ روزے واقعی تین دن کے تھے۔ یہ اعتراض وزنی ہے اور میں اس اعتراض
کو تسلیم کرتا ہوں۔ میرا گمان ہے اور اس کو مدنظر رکھ کر میں حدیث کا مطالعہ کرونگا کہ درحقیقت رمضان کے روزے
آخری آٹھ یا نو دن کے روزے ہیں یعنی ۲۱ رمضان سے ۲۹ یا ۳۰ تک۔ اس نتیجے پر پہنچنے کیلئے میرے دلائل یہ ہیں:۔

(۱) عام طور سے اعتکاف رمضان کے اسی آخری عشرے میں کیا جاتا ہے اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اعتکاف
اور روزے ساتھ ساتھ ہوتے تھے یعنی جس طرح حج وعمرہ دو چیزوں سے ملکر حج پورا ہوتا ہے اور اس میں اختیار ہے
کہ خواہ حج کرے یا عمرہ اور اس کے بھی آٹھ نو روز اور زیادہ سے زیادہ دس روز ہیں۔ اسی طرح رمضان میں
اعتکاف اور روزہ ساتھ ساتھ نو دس روز ہوتے ہیں۔ روزے کے ساتھ اعتکاف کرے تو اچھا ہے اور اگر اعتکاف
نہ کرے بلکہ روزے رکھے تو بھی حرج نہیں۔ البتہ جب اعتکاف کرے تو رات کو عورتوں سے مباشرت منع ہے جیسا
ارشاد ہوتا ہے ولا تباشروھن وانتم عاکفون فی المساجد

(۲) یہودیوں میں قاعدہ تھا کہ وہ روزہ جس دن کی یاد میں رکھتے تھے وہ انکی عید کا دن ہوتا تھا اور اسکی خوشی
منانے کے لئے اس سے تین چار روز قبل سے روزے رکھے جاتے تھے تاکہ عید کے روز کھانے پینے میں زیادہ خوشی
حاصل ہو۔ اس قدر تسلیم ہے کہ قرآن کے نزول کی یادگار میں روزہ رکھنے کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے اور حق تو یہ
کہ یہ دن اسلام کی اتنی عظیم الشان یادگار ہے جس کے مقابلے میں ولادت رسول۔ معراج۔ فتح بدر وغیرہ سب ہیچ
ہیں۔ اور اس یادگار کو قائم رکھنا یقیناً ایسی صورت میں بہتر ہوسکتا ہے جبکہ اس کے سامنے کوئی ایسا عمل مسلمان اختیار
کرے جیسے روزہ ہے۔ پھر چونکہ اسقدر مسلم ہے کہ لیلۃ القدر جس میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا رمضان کے آخری عشرے
میں ہے اسلئے بہتر یہی تھا کہ ۲۱ رمضان سے روزہ شروع کیا جائے۔ اس میں نزول قرآن کی یاد تازہ کرنے کا
موقعہ تھا اور لیلۃ القدر کی اختلافی تاریخوں پر حاوی بھی ہے۔

(۳) مسلمانوں میں چار فرائض ہیں۔ دو روزانہ اور دو سالانہ۔ روزانہ صلوٰۃ وزکوٰۃ ہیں۔ اور روزہ اور حج سالانہ ہیں
سالانہ فرائض کے اختتام کا دن عید کا دن ہوتا ہے۔ حج میں سالانہ فرائض کے لئے نو یا دس دن مقرر ہیں۔ جو ذی الحجہ
کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح رمضان کے روزے اور اعتکاف کے دس دن ہیں اور اس کے
عید منائی جاتی ہے۔ دونوں کی مماثلت عید سے ہی نہیں بلکہ دنوں سے بھی ہے۔

(۴) ایاما معدودات کا اشارہ ثابت کر رہا ہے کہ روزے دس دن سے زیادہ نہیں ہوسکتے اور اس لئے درحقیقت
روزے جو مسلمانوں پر قرآن کی رو سے فرض معلوم ہوتے ہیں وہ ۲۱ رمضان سے ۲۹ رمضان یا صبح عید تک ہیں اہل
اعتکاف کرتے ہیں اور بعض صرف روزے پر اکتفا کرتے ہیں۔ رمضان کے بقیہ روزے نوافل کا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن

Marfat.com

آیت میں "ولیال عشر" (اور قسم ہے دس راتوں کی) ہے جسے بجا طور سے ایام معدودات کا اشارہ سمجھا جا سکتا ہے۔

## حدیث میں ایام صیام

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہیں۔ سو قبل اس کے کہ حدیث کا مطالعہ شروع کروں مجھے ایک بار پھر مسلمانوں کو تاریخ پر توجہ دلانی ہے۔ اگر تم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں Fasting یا روزے کا مضمون پڑھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں میں ایام صیام پر بعد کو عجیب اختلاف پیدا ہوئے۔ بعضوں نے [illegible] اور سنیچر کو روزہ رکھنا فرض جانا۔ بعضوں نے سال میں تین دن یعنی ایسٹر کے دنوں میں جب حضرت [illegible] تھی اور جب وہ زندہ ہوئے تھے یعنی جمعہ سے لیکر اتوار تک۔ لیکن عیسائیت جب رہبانیت کی طرف [illegible] ہوئی تو اس کے ساتھ ہی روزے کے لیے چالیس روز مقرر ہوگئے۔ عربوں کو سب سے پہلے یہ روزہ دار رہبانیت [illegible] فلسطین میں ملے۔ انھوں نے دیکھا کہ قرآن کے روزے اُن کے روزوں کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور یہ [illegible] فخر کرتے ہیں کہ ان میں خدا پرستی مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ لہٰذا عربوں کو یقیناً زیادہ دنوں روزہ رکھنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا۔ ادھر عجم کے فرقہ مانویہ میں بھی تیس دن کے روزے تھے۔ اس سے بھی عرب متاثر ہوئے۔

اب آئیے حدیثوں پر غور کریں۔ حدیث میں سب سے زیادہ چیز جو حیرت میں ڈالنے والی ہے وہ ثواب کی کمی و بیشی کا بیان ہے کہ مثلاً ایک شخص اپنے گھر میں نماز پڑھتے تو اسکو ایک نماز کا ثواب ملیگا مسجد میں پڑھتے تو پچاس نماز کا۔ بیت المقدس میں پڑھے تو ہزار نماز اور مکے میں پڑھے تو لاکھ نماز۔ معلوم نہیں اس مقدار میں کیا راز تھا کیا مسلمان بغیر اس لالچ کے نیک کام کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ لہٰذا میں ان حدیثوں کو تو قطعی چھوڑ دونگا جو روزے کے ثواب [illegible] ترغیب میں ہیں۔ اگر کسی کو ان کا شوق ہو تو احیاء العلوم میں امام غزالی کی روایتوں کو پڑھے جن میں خدا جانے [illegible] صحیح و ضعیف حدیثیں ہماری آسانی کے لئے جمع کردی گئی ہیں مجھے صرف ان حدیثوں پر غور کرنا ہے جن میں ایام صیام کی تعیین کی گئی ہے اور ان میں بھی وہ جو رسول اللہ صلعم کی طرف سے حکم کی صورت میں ہوں کیونکہ بانی دین رسول اللہ صلعم نوافل روزے بھی بکثرت رکھتے تھے جو عامۃ المسلمین پر شاق ہیں۔ اور اس کی تقلید ہر شخص سے نہیں ہو سکتی [illegible] شخص نبی نہیں ہو سکتا اور اس سے روزے کے دنوں کا وجوب نکالنا صحیح نہ ہوگا۔

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ حدیث میں تیس دن کے روزے کا حکم [illegible] مسلم کے باب صیام کی تمام متفرق حدیثوں کو یہاں درج کئے دیتا ہوں۔

(۱) قاسم بن عبدالرحمن نے سنا معاویہ بن ابی سفیان سے منبر پر وہ کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر فرماتے تھے۔ رمضان شروع ہونے سے پہلے۔ روزہ فلاں فلاں دن رمضان میں شروع ہوگا اور ہم تو اس سے پیشتر روزہ رکھیں گے جس کا جی چاہے پہلے سے روزہ رکھے اور جس کا جی چاہے پہلے سے روزہ نہ رکھے۔

Marfat.com

(شاید یہ کہا جائے کہ یہ حکم اسوقت کا ہے جب رمضان میں تین روزے فرض تھے۔ مگر امیر معاویہ فتح مکہ کے بعد
اسلام لائے ہیں۔ اور فتح مکہ کے دو تین سال بعد حضورؐ نے وفات پائی)

(۲) ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ۲۹ دن کے روزے رکھے اور زیادہ سے زیادہ تیس دن کے۔
(مگر اس حدیث سے کوئی حکم مستنبط نہیں ہوتا۔ صرف اس سے اسقدر معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ نفلاً تمام ما
رمضان کے روزے رکھتے تھے۔)

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب پھر چاند دیکھو تو افطار کر
پھر اگر ابر آجائے تم پر تو تیس روزے پورے کرو۔

(معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے یقیناً آخر کا جملہ بڑھا دیا ہے کیونکہ ابن عمر کی حدیث میں جو بالکل اسی طرح ہے یہ الفا
نہیں ہیں۔ مہینے کے معنی صاف ہیں۔ یعنی مہینے کے آخر ہفتہ میں چاندنی رات، رات کے آخر حصے میں شروع ہوتی ہے
رات کے آخری حصے سے روزہ شروع کرکے رات کو جب تک آسمان پر ستارے نہ نکل آئیں روزہ رکھو دوسرے چاند
غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی غلطی حدیث میں معمولی بات ہے۔ یہ حدیث ابو ہریرہ کی طرف سے ہے، اس کا موازنہ ا
حدیث سے کرو۔ تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ جو روایتیں ابو ہریرہ کی طرف نسبت دیجاتی ہیں۔ وہ اکثر ضعیف ہوتی ہیں۔
ابو ہریرہ سے روایت ہے قسم ہے کعبہ کے رب کی یہ بات کہ جو کوئی صبح کرے جنابت کی حالت میں وہ افطار کر
میں نے نہیں کہی بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی۔ باوجودیکہ اس میں ایسی زبردست قسم کھائی گئی ہے۔ حضرت عائ
وام سلمہ ہی سے اس کی تردید نہیں ہوتی بلکہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ سب متفق ہیں کہ یہ قول صحیح نہیں ہے۔)

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال اخیر رمضان کے دس دن میں اعتکاف کرتے تھے۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کے کسی دن میں عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند نہیں جتنا ان د
دنوں میں اور ایک دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر ہے اور ایک رات عبادت کرنا شب قدر کے برابر ہے۔

(۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخر دس دن میں اعتکاف کرتے۔ نافع نے کہا عبداللہ بن عمر نے
وہ جگہ بتلائی جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کیا کرتے تھے۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے آخر دس دن میں ایسی کوشش کرتے تھے عبادت میں کہ د
اور دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو رات کو جاگتے اور آزار
مضبوط باندھتے (یعنی عورتوں سے ہم بستر نہ ہوتے)

(۸) حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کے بارے میں۔ انھوں نے ک
آپ شعبان کے سارے مہینے کے روزے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اسکو ملا دیتے تھے رمضان سے۔

Marfat.com

(۹) میرے اوپر رمضان کے روزوں کے قضا ہوتی تھی تو میں اسکو نہ رکھتی یہاں تک کہ دوسرے سال کا شعبان [illegible]

(۱۰) میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ روزے سے جمعہ کے دن نہ ہوتے تھے [illegible]

## قرآن سے ایام صیام کے تین مزید نکتے

تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ قرآن مجید نے روزہ کا حکم دیتے ہوئے یہ کیوں [illegible]
یہ قطعی ثابت ہے کہ یہودیوں میں کم سے کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ [illegible]
قول صحیح نہیں ہے کہ تم پر اہل کتاب کی طرح چند روز کے لئے روزے فرض کئے گئے پھر قرآن [illegible]
ہے " یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر " یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں خصوصاً اسوقت جب کہ روزے فرض [illegible]
تھے جو ہجرت کے دوسرے سال تھے ۔ رسول اللہ نے ہجرت سخت گرمی کے ایام میں کی تھی [illegible]
اسلئے آنحضرت کی وفات تک روزے سخت گرمی کے ایام میں پڑتے تھے ۔ پھر تقریباً ہر سال مسلمان [illegible]
گرمی اور سفر میں ایک ماہ تک سخت روزے رکھنے کا حکم دینا اور پھر کہنا کہ خدا تم پر آسانی [illegible]
ہے ۔ کہاں تک شرط انصاف تھا ۔ یہ صحیح ہے کہ جہاد میں روزے نہ رکھے جاتے تھے مگر سوال [illegible]
تھی تو رمضان کے مہینہ بھر روزوں پر کوئی حدیث متواتر ہو ہی نہیں سکتی اس واسطے [illegible]
سال قبل تک مسلمان برابر جہاد کرتے رہے ۔ مگر ان سب سے زیادہ لطیف نکتہ [illegible]
کہ روزہ قرآن کے نازل ہونے کی یاد میں رکھا جاتا ہے کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ قرآن [illegible]
خصوصیت تھی کہ اسکی یادگار روزہ رکھنے سے منائی جائے ۔ بات یہ ہے کہ قرآن ایک عہد [illegible]
ہے یعنی عہد خداوندی یہ ہے کہ اگر تم ایمان لاؤ گے اور نیک عمل کرو گے تو ہم تم کو دنیا میں [illegible]
آخرت میں بھی ۔ یہی عہد خدا کا یہود و نصاریٰ سے تھا ۔ چنانچہ تک یہود و نصاریٰ اپنی [illegible]
جدید و عہد نامہ قدیم کہتے ہیں ۔ ہم اس عہدے کسقدر عہدہ برآ ہوتے ہیں خدا کو خوب معلوم ہے [illegible]
انسان نے ایسے گراں قدر عہد کو اٹھا لیا ہے کہ پہاڑ بھی ہوتا تو تحمل نہ ہوتا ۔ [illegible]
سے عہد ٹوٹے گا اور ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ اس عہد کو بار بار توڑنے [illegible]
کرتا بلکہ اپنی مہربانی سے روزہ رکھا کر ہمارے اس عہد کے توڑنے کا کفارہ ہر سال [illegible]
کا کفارہ کیا ہے ارشاد ہوتا ہے لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم [illegible]
عشرۃ مسٰکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم او تحریر رقبۃ فمن لم یجد فصیام [illegible]
ایمانکم اذا حلفتم واحفظوا ایمانکم کذلک یبین اللہ لکم ایتہ لعلکم تشکرون [illegible]

Marfat.com

یہ مضمون پنجاب کے ایک عالم کا ہے جو البیان امرتسر ماہ اپریل ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ مضمون گمنام ہے۔

# اَیّامِ صِیام

از ــــــ (ہم سخن فہم ہیں حق گو کے طرفدار نہیں)

موضوع مندرجہ عنوان پر جناب مفتی محمد دین صاحب وکیل گجرات نے گو محققانہ بحث کی ہے، لیکن امر زیر بحث پر ایک حرف بھی نہ لکھا۔ زیر بحث یہ امر ہے کہ "ایّام" جمع مکسر قلّت ہے اور اس کا اطلاق دس سے زیادہ اور تین سے کم پر نہیں ہوتا۔ مناسب تھا کہ مفتی صاحب ممدوح فرماتے کہ یہ قاعدہ غلط ہے یا کلیہ نہیں اور اس دعویٰ کو برہان سے ثابت کرتے، غلط تو ہو نہیں سکتا البتہ کلیہ نہ ہو یہ اور بات ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جس اسم کی صرف ایک ہی جمع ہو، جمع قلت اور کثرت میں استعمال ہوگا، لیکن "ایام" کی جمع الجمع "ایوام" ہے۔ اسلئے "ایام" سے کثرت کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے کچھ اور توجیہ فرمائیں۔ جمع سالم اور مکسر قلت و کثرت کے اوزان قیاسی مقررہ ہیں۔ اور ایام جمع قلت کے وزن "افعال" پر ہے، جمع کثرت کے اوزان "افاعل" اور "افاعیل" ہیں۔ بہرحال اب بار ثبوت اس امر کا کہ "ایام" جمع کثرت ہے مفتی صاحب ممدوح پر ہے۔

مفتی صاحب ممدوح نے قرآن مجید کی چند آیات کا حوالہ دیا ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ "ایّام" قلت و کثرت دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جسکا مفہوم یہ ہے کہ یوم کی جمع ایک ہی ایام ہے یا کم از کم قرآن مجید نے ایک ہی جائز رکھی ہے، آیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "واذکروا اللہ فی ایّام معدودٰت" الآیۃ اور (حج کے چند دنوں میں اللہ کا ذکر کیا کرو اور پھر جو جلد ہی دو دن میں چلا گیا الخ

اس آیت سے تو مفتی صاحب کے دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر مفتی صاحب یہ ثابت کرتے کہ حج کے ایام دس سے اوپر ہیں تو کچھ بات تھی۔ اس آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دو سے زیادہ ہیں اور معقول یہ ہے کہ دس سے کم ہیں۔ اگر نہیں تو مفتی صاحب ارشاد فرمائیں کہ کتنے ہیں؟

(۲) قالوا لن تمسنا النّار الّا ایّاماً معدودٰت۔ کہا کہ ہم کو آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر چند دن۔ یہ کسی یہودی سے دریافت کرنا چاہئے کہ اس سے مراد جمع قلت ہے کہ کثرت۔ اگر جمع کثرت ہوئی تو اس قوم کا فخر بے معنی ہے۔

مفتی صاحب ممدوح فرماتے ہیں کہ "معدودٰت" صفت ہے "ایام" کی۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے جمع مکسر ہمیشہ مؤنث ہوگی اور اس کی صفت بھی مؤنث ہوتی ہے۔ یہ امر زیر بحث نہیں۔ فرماتے ہیں کہ "ایام کے ساتھ جونسا اسم عدد استعمال کیا جائے گا اس کے مطابق وہ اپنے معنوں کا اظہار کریگا" اور مثال میں چار اسماء عدد

کئے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

(۱) ثلثة ایام (۲) اربعة ایام (۳) ستة ایام (۴) ثمنیة ایام یہ چاروں مثالیں قرآن شریف میں مذکور ہیں۔ مفتی صاحب نے دیدہ و دانستہ "حق گو" صاحب کی تائید کی ہے کہ تین سے نو تک تو ایام کی جمع قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، مناسب یہ تھا کہ آپ گیارہ اور اس سے زیادہ کی مثال پیش کرتے۔

مفتی صاحب ممدوح نے "ایام الخالیہ" اور "ایام نحسات" اور "ایام اخر" یہ بھی بحث کی ہے اس سے بھی کچھ "حق گو" صاحب کی تائید ہوتی ہے گذشتہ دن کتنے ہونگے، ہفتہ کے سات دن ہی ... دن تو طوفان گرد و باد کے ہوتے ہیں جنکا انگریزی صحیح ترجمہ "... ..." ہے اور یہ کتنے ہونگے ... ممدوح کو واضح کرنا چاہئے اور رمضان کے دنوں کی تعداد تو معرض بحث ہی ہے۔

مفتی صاحب ممدوح نے تین آیات کا اور حوالہ دیا ہے:۔

(۱) تلک الایام" الایۃ اور (شکست) کے دنوں کو ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔

اس سے جمع کثرت کا مفہوم پیدا کرنا کچھ بعید ہی معلوم ہوتا ہے۔ مفہوم تو یہ ہے کہ مثال ... فتح و شکست نہیں ہے۔ فتح کی خوشی اور شکست کا غم عارضی امور ہیں اور چند روزہ ہیں۔ ... کرتا ہے۔ کامیابی اور ناکامیابی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ بدر اور احد کے واقعات ... موضوع ہے اور اس پر بحث اس مقام پر نہیں ہو سکتی۔

(۲) "فھل ینظرون" الایۃ تو کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ ان دنوں کی مثل ... لوگوں پر گذرے ہیں۔

اس آیت سے بھی کچھ کام نہیں بنتا ہے، عذاب کے لئے طویل زمانہ معقول نہیں ... کر دیتا ہے جیسے آل فرعون و لوط اور عاد و ثمود کے حالات سے واضح ہوتا ہے۔

(۳) "وقدرنا فیھا" الآیۃ اور ہم نے ان دیہات میں آمد و رفت مقرر کر دی ... راتوں کو امن کے ساتھ سیر کرو۔

اس آیت سے بھی مفتی صاحب کا مطلب حل نہیں ہوتا کیونکہ سیر کتنے دن کوئی ... سے زیادہ ہی ہفتہ عشرہ یہ تو معقول نہیں ہے کہ ہمیشہ گردش میں رہے۔

(۴) "قل للذین امنوا" الایۃ مومنوں سے کہدو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو اللہ کے دنوں ...

اس آیت سے مفتی صاحب کی کچھ کچھ مطلب برآری ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک ... ایک ہزار برس سے پچاس ہزار برس کا ہے۔ اس کے لئے تو عربوں ہی کی عادت ...

Marfat.com

ممدوح سے توقع تھی کہ اس آیت کا مفہوم واضح کرتے۔ محض آیت اور اسکا ترجمہ لکھدینا کافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات چھ دنوں میں پیدا فرمائی۔ ہمارے حساب سے "ستة ایام" جمع قلت ہے۔ لیکن ہمارے حساب سے ۶ × ۵۰۰۰۰ = ۳۰۰۰۰۰ (تین لاکھ) برس ہوتے ہیں۔ جو جمع کثرت ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو چھ دن سے ہی تعبیر فرمایا ہے۔ اسلئے "ایام اللہ" کثرت پر دلالت نہیں کرتے۔

مفتی صاحب ممدوح "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ "پس جو شخص اس ماہ کو پائے اس کو ماہ صیام بنائے" اور نیز ضمیر "ہ" راجع ہے شہر کی طرف۔ مفتی صاحب ممدوح بات بات میں آیت کا حوالہ اور وہ بھی مدلل اور مفصل طلب کرتے ہیں۔ کیا ہمارا حق نہیں ہے کہ مفتی صاحب سے دریافت کریں کہ "شہر" سے مراد تیس یا اُنتیس دن آپ نے کس آیت سے اخذ کئے ہیں اور "شهد" کا ترجمہ "پائے" کس سند پر کیا ہے۔ آیت کا حوالہ مدلل اور مفصل ہو۔ اور یہ بھی فرمائیں کہ آیت "فمن شهد منكم" کی ضرورت کیا ہے اور اس سے کیا مفہوم واضح ہوتا ہے؟ اور نیز واضح فرمائیں کہ "ليصمه" کا حکم عورتوں پر بھی مردوں کی طرح ہے؟ آیات سے مفصل و مدلل جواب دیں۔ "حق گو" صاحب نے یونہی لکھ دیا کہ ماہ رمضان کے آخری دس روزے فرض ہیں (نو لکھتے تو بہتر تھا) لیکن تمام ماہ رمضان کے روزے رکھنا بہتر سمجھتا ہوں۔ پس مفتی صاحب اتنی سی بات پر جواب طلب کرتے ہیں۔ اور وہ بھی بحوالہ آیات مفصل اور مدلل۔ حضرت یہ تو فرمائے کہ آپ کی اور دیگر صاحبان کی تحقیق ہے کہ "صلوٰۃ" تین وقت فرض ہے۔ باقی سنت و نوافل۔ اگر کوئی شخص پانچ یا اس سے زیادہ اوقات میں صلوٰۃ ادا کرتا ہے تو کیا اُسے گمراہ سمجھ کر دست و گریباں ہوں۔ نیکی نیکی ہے جتنی ہو اتنی اچھی ہے۔ "حق گو نے کیا بُرا کہا کہ تمام ماہ کے روزے رکھنا اچھا ہے۔ اُن کے ذہن میں غالباً آخر عشرہ رمضان کی فضیلت بوجہ لیلۃ القدر ہوگی جو نزول قرآن مجید کی رات ہے لیکن اگر آپ نے کسی آیت کی رُو سے ثابت کر دیا کہ "شهر" تیس یا اُنتیس دن کا ہوتا ہے تو سمجھ لیں کہ ہر ایک شخص کو اختیار دیا گیا ہے کہ ماہ رمضان کے اوّل یا آخر یا وسطی یا مسلسل یا منقطع ایام میں بنظر سہولت روزے رکھے۔ اس طرح تمام ماہ صیام ہو جائے گا۔ "فمن شهد منكم" کا بظاہر یہی مفہوم ہے۔ ورنہ آپ واضح فرمائیں۔

---

Marfat.com

# معمولاتِ اُمّت یا غلو فی الدّین

برادرم عباد اللہ اختر نے البیان میں میرے متعلق جو نوٹ دیا ہے اسکو پڑھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے تو انکو ایک خط میں ٹوکا تھا کہ آپ بار بار شام کی نماز کا ذکر کر رہے ہیں حالانکہ قرآن میں شام یا مغرب کی نماز کہیں بھی نہیں۔ اصیلا اور اصال اور عشیا عصر یعنی قبل غروب کے معنی میں ہے جس کو قرآن نے صاف اور صریح آیت میں "قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا ومن اٰناءِ الیل" کی تین وقتوں میں سے ایک وقت کی نماز بصراحت بتا دیا ہے۔ مگر ان کی اس تحریر سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قرآن کی باوجود اس صراحت کے جب انھوں نے اوقات ثلٰثہ پر کلام کیا تو کیا عجب کہ عمر بن عبدالعزیز نے عروہ سے سوال کیا ہو قرآن میں کتنے وقت کی نماز ہے اور انھوں نے پانچ بار ہاتھ مار کر کہا کہ ان وقتوں میں جبریل نے رسول اللہ کو آ کر نماز پڑھائی تھی۔ عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ ہجرت سے نوّے سال بعد ہوا ہے۔ تو اس وقت تک لوگوں کو اوقات صلوٰۃ میں اشتباہ رہا اور کیوں نہ ہوتا۔ ابن عباس نے رسول اللہ کو بسا اوقات تین ہی وقت نماز پڑھتے دیکھا اور خود ابن عباس سے لوگوں نے سوال کیا کہ قرآن کی کس آیت میں پانچ وقت کی صراحت ہے تو انھوں نے ایسا جواب دیا کہ کسی عرب سے ایسے جواب کی امید نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے کہا فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تصبحون میں پانچ وقت کی صراحت ہے۔ حالانکہ نہ اس میں پانچ وقت کی صراحت ہے اور نہ اس میں کوئی حکم نماز پڑھنے کا ہے بلکہ خود انھیں کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ایک کلمہ دعائیہ ہے۔ اور اسکے بہت سے فوائد ہیں۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ جب برادرم عباد اللہ اختر قرآن کے الفاظ سے دو وقت کی نماز ثابت کر رہے ہیں تو جن لوگوں نے پانچ وقت کی نمازیں فرض سمجھیں۔ انھوں نے کیا قصور کیا ایک میں افراط ہے اور دوسرے میں تفریط۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب قرآن میں پیچ پیچ باتیں ہوں (نعوذ باللہ) اور لوگ اس کے معنی جو کا کچھ سمجھیں تو اس وقت دیکھنا چاہئے کہ معمولِ امت کیا ہے اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔ یہ رائے معمولی آدمیوں کی رائے نہیں محترم [illegible] صاحب [illegible] جنھوں نے یہ بات کہی ہے۔ ان سے پہلے بہت سے مولانا اسلم جیراجپوری اور مولانا سید سلیمان [illegible] نے بھی یہ بات کہی کہ ان دونوں [illegible] کو تسلیم کرتے ہوئے کہ قرآن میں پانچ وقت کی نماز [illegible] سے قرآن کے معنی سمجھا جائے۔ [illegible] ان سے ایک قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں اور وہ معمولات امت کی [illegible] قرآن کی صراحت کی بھی تغییر کر رہے ہیں اور [illegible] روایات کے وہ معنی لے رہے ہیں جو کسی مفسر نے [illegible] یا کسی نے نہیں لئے ہیں۔ یہ لوگ ایام معدودات سے ایام حیض مراد لیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سے وہ تین دن مراد

Marfat.com

تھے جب روزے تین دن کے تھے جو فمن شهد منكم الشهر سے منسوخ ہو گئے اب آپ خود قرآن کی عبارت پر غور کی
اور ان مفسرین کو دعائے خیر سے یاد کیجئے۔ ان کا یہ کہنا بھی ذرا غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ایام جمع قلت اور کثرت دونوں کے
لئے آتا ہے اور یہ غلط فہمی ان کو اور غیاث اللغات کو یوں ہوئی کہ ایام کے معنی زمانے کے بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں کئی
زمانے کے معنی میں ایام لایا گیا ہے۔ ایام الخالیہ اور تلك ایام نداولها بين الناس۔ مگر جب دنوں کیلئے ہو
تو وہ نو سے زیادہ پر بولی نہیں جاتی اس لئے وہی بات پیدا ہوئی کہ معمولات امت کیا چیز ہے اور آیا وہ ناسخ قرآن
بھی ہو سکتی ہے۔

معمولات امت کچھ اسلام میں مخصوص نہیں۔ معمولات نصاریٰ میں مسیح کا ابن اللہ اور مصلوب ہونا اور گناہوں کا کف
دینا تیسری صدی سے چھٹی صدی تک معمولات امت مسیح تھا۔ مگر کیا یہ صحیح بات ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات اصل میں یہ
کہ جو لوگ پہلے پہل ایمان لاتے ہیں ان میں مذہب کا جوش بہت زیادہ ہوتا ہے اور ان کے معمولات دراصل غلو فی الدین کے
معنی میں ہوتے ہیں۔ غلو فی الدین ہی نے پانچ وقت کی نماز اور تیس دن کے روزے قائم کر دئے میں یہ نہیں کہتا کہ غلو فی الد
بری چیز ہے۔ اچھی چیز ہے۔ تعریف تو یہ ہی ہے کہ ایک نیک کام کو اس سے زیادہ کرے۔ قرآن نے تعزیرات ہند
طرح احکام کی کم ترین عمل کو بتا دیا ہے کہ اس سے کم نہ ہو۔ زیادہ جتنا کرو۔ تمہارا شوق اور غلو فی الدین ہے۔ کوئی منع نہیں
کرتا۔ آخر نصاریٰ نے بھی تو رہبانیت کو اپنے اوپر فرض کر لیا تھا اور ہمارے ہاں نماز و روزے کی اس قدر فضیلتیں ہیں
کہ اگر حدیث کی روایتوں کو مان لیا جائے تو پھر مسلمانوں کو کسی نیک عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کے سارے گناہ اس نماز
روزے کی کثرت سے دھل جاتے ہیں مگر ایسی حدیثیں خدا نہ کرے کہ میں مانوں۔ باقی مولانا عرشی سلمہ تو اُن کو میں روکتا نہیں ایک
مہینے کے روزے رکھیں شوق سے اور کیوں نہ رکھیں۔ آخر اگر خالق رزاق جو رزق کا دروازہ ہم پر کھولتا ہے اسکی خوشی اس
میں ہے کہ ہم اپنا کھانا چھوڑ دیں اور اس کھانے کو کسی بھوکے کو کھلا دیں تو کون بے ایمان اسکو برا کہہ سکتا ہے یا ایک مجسٹ
اور جج اگر تعزیرات ہند کی آخری سزا ایک ملزم کو دیدے تو کون اسکو روک سکتا ہے۔ سوال تو ہم معمولی ضعیف الایمان لوگوں کا
جو کثرت عبادت و روزے کو معمولی سمجھ کر اس کو سرے سے کرتے ہی نہیں کہ اس سے کم پر آئیں تو وہ بیکار ہو جائے گا۔ اس
ذہنیت کے نہ پیدا ہونے کا خیال تھا جس نے مجھے مطالعہ حدیث میں اوقات صلوٰۃ اور ایام صیام پر حق بات کہنے
جرأت دلائی ہے۔ اور خدا غفور و رحیم اور علام الغیوب و مافی قلوب ہے۔

جسکو ایاماً معدودات عربی میں بولتے ہیں اسکو ہم لوگ ہفتہ عشرہ کہتے ہیں۔ قرآن تو علیٰحدہ رہا بھلا کوئی ہم میں سے ہفتہ عشرہ
کہے اور اس سے مراد مہینہ لے تو ہم ایسے شخص کو بے وقوف ہی کہیں گے۔ پھر قرآن پر کیسا نشانہ لگایا جا رہا ہے۔ ایام جمع
زمانے کے آئے ہیں۔ اسکی جمع ایوام ہے جو ایام کی جمع الجمع ہے۔ شہر کے معنی کس لغت میں ۳۰ یا ۲۹ دن کے ہیں۔ رمضان
کو روزہ کا مہینہ بتاؤ اس سے پورا مہینہ روزہ رکھنے کا حکم کہاں ملتا ہے؟"

# نصابِ زکوٰۃ و عُشر

قرآن میں زکوٰۃ کا ذکر اس تواتر کے ساتھ آیا ہے کہ بہت کم آیتیں قرآن شریف کی ایسی ہونگی جہاں نماز کی تاکید کے ساتھ زکوٰۃ دینے کی تاکید نہ کی گئی ہو۔ قرآن نے اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ اور صدقہ میں کوئی تخصیص نہیں کی ہے اور ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ مگر جس طرح نماز کی ترکیب کی کہیں صراحت قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اسی طرح نصابِ زکوٰۃ کا بھی ذکر کہیں نہیں ہے۔ حالانکہ مستفسرین نے اسکو دریافت بھی کیا جسکا قرآن شریف نے یہ جواب دیا ہے۔

ویسئلونک ماذا ینفقون ط قل العفو ط کذٰلک یبیّن اللہ لکم الاٰیٰت لعلّکم تتفکّرون

اور تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنی زکوٰۃ دیں۔ کہدے جتنا تم سے ہوسکے۔ اسطرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور [illegible] پوچھنے والوں کی اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ دوبارہ دریافت کیا۔ پھر جواب ملتا ہے۔

یسئلونک ماذا ینفقون ط قل ما انفقتم مّن خیرٍ فللوالدین والاقربین والیتمٰی والمسٰکین وابن السبیل ط وما تفعلوا من خیرٍ فانّ اللہ بہٖ علیمٌ (۲/۲۱۵)

کیا اس سے زیادہ اور وضاحت کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو بتایا جاتا کہ خیرات کوئی سرکاری ٹیکس نہیں ہے بلکہ تمہاری رافت۔ ہمدردی اور نیکدلی کا نتیجہ ہے۔ جتنا تم چاہو دو۔ اسکا دینا البتہ تمہارے اوپر ایسا ہی فرض ہے جیسے تمہاری نماز۔ قرآن نے کیوں اس نصاب سے اعراض کیا جس سے فقہ اور حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ کیا قرآن کے لئے یہ بتانا ممکن نہ تھا کہ تم ڈھائی روپیہ سیکڑہ اپنے مال میں سے ادا کرو جو تمہارے پاس سال کے آخر تک باقی بچے اس خاموشی کی کیا مصلحت تھی یا کم سے کم اگر نصاب نہ بتایا تھا تو اس کہنے میں کیا حرج تھا کہ تم زکوٰۃ اس شرح سے ادا کرو جو تم سے مانگی جائے۔

البتہ قرآن شریف کی سورہ برات۔ آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کے مصرف کی اسطرح تشریح کی گئی ہے:۔

انّما الصّدقٰت للفقرآء والمسٰکین والعاملین علیہا والمؤلّفۃ قلوبہم وفی الرّقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السّبیل ط فریضۃً مّن اللہ ط واللہ علیمٌ حکیمٌ۔ (۹/۶۰)

زکوٰۃ ان مصارف کے لئے ہے۔ فقرا۔ مساکین۔ زکوٰۃ کے محصلین۔ مولفۃ القلوب۔ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے۔ مقروض۔ مسافر۔ غریب الدیار اور راہِ خدا میں۔ یہ خدا کا فرض ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

سورہ برأت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ جس میں زکوٰۃ فرض کی گئی اور زکوٰۃ کے مصرف علیحدہ علیحدہ بتائے گئے۔ منجملہ اور مصارف کے اس کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ محصلین زکوٰۃ کو اس مد سے تنخواہ بھی دیجائے جس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن نے زکوٰۃ کی اس صورت کو بھی تسلیم کیا ہے جو سلطنت کے انکم ٹیکس پر مبنی تھا۔ لیکن اگر زکوٰۃ سے ایک وقت میں انصرام سلطنت اور تیاری جیوش اسلامی کا کام لیا گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زکوٰۃ کا صرف وہی مصرف رہ گیا۔ کیا اگر ایک سلطنت نے دوران جنگ میں مجروحین کے لئے بعض مساجد کو خستہ خانوں میں تبدیل کر دیا تو اس ضرورت کے رفع ہونے کے بعد وہ مسجد کے کام میں پھر نہیں لائے جاسکتے قرین قیاس یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جنگ کے اخراجات کے لئے زکوٰۃ مثل انکم ٹیکس کے وصول کی گئی ہو مگر تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بیت المال اور عاملین زکوٰۃ کو موقوف کر دیا تھا اور مسلمانوں کو اختیار دیدیا تھا کہ وہ بطور خود زکوٰۃ کا روپیہ جس مستحق کو چاہیں دیدیں۔ جب حضرت عثمان نے پرانے طرز عمل کو ترک کرنے میں نہ سنت سے انحراف کیا نہ قرآن سے۔ تو کیا تم اس سے آگے قدم بڑھا نہیں سکتے یعنی ان سارے قیود کو جو فقہا نے زکوٰۃ پر قائم کئے ہیں علیحدہ کر کے اس کے اصل مفہوم یعنی صدقہ و خیرات کو اختیار نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ نصاب زکوٰۃ، زکوٰۃ کو ایک ملکی انکم ٹیکس میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس مفہوم کے ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ اسلام اسلامی سلطنت میں محدود ہو۔ مگر موجودہ صورت میں جبکہ اسلام اسلامی سلطنت کے حدود سے بہت دور نکل گیا ہے اُسی پرانی لکیر کو پیٹے چلے جانا جو اُس زمانے کی یادگار ہے جبکہ ہمارے فقہا کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اسلامی سلطنت سے باہر بھی اسلام کا قیام ممکن ہے۔ حماقت ہے۔ بجائے اس کے کہ اسکی تردید میں نظری دلائل پیش کئے جائیں۔ اسقدر کہنا کافی ہے کہ اسلامی دنیا کی موجودہ صورت ان تمام خرافات کے منافی ہے جس نے دارالحرب کے سلسلہ مسائل میں ایک وقت اسلام کو فوجی و سیاسی مذہب کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس وقت اسلام دنیا کی کسی ایک قوم میں محدود نہیں ہے اور نہ ایک سلطنت کے حدود میں اندر ہے بالفعل مسلمانوں کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ اسلامی سیاست کی دست رس سے باہر ہے۔ لہٰذا اسلامی سلطنت سے باہر اسلام کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار روز روشن کا انکار ہے۔ اور اس سواد اعظم اسلام کا کام بغیر سلطان اسلام کے چل رہا ہے بلکہ ان میں عزانیت و شخصی آزادی ان ممالک سے زیادہ ہے جہاں مسلمانوں کی سلطنتیں ہیں۔ اسلئے دارالحرب و دارالاسلام کی تفریق اور دارالحرب میں قیام کی ممانعت اور وہاں سے ہجرت کی فرضیت غیرہ وغیرہ کو اب بالکل نسیاً منسیا کر دینا چاہیے۔

اسلام کا تعلق ملکی سیاست سے بتانا جبکہ ہمارے سامنے خود ہندستان کے سیاست کی مثال موجود ہے اس سے زیادہ عبث ہے جتنا دارالحرب کے مسئلے پر گفتگو کرنا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندستان کا اسلام ناقص ہے یا مسلمانا ہندستان پر ہجرت کر جانا فرض ہے۔ باوجودیکہ یہاں نہ کوئی سلطان ہے نہ مفتی نہ قاضی نہ محتسب نہ ملا۔ ہاں چند پرا وضع کے مولوی پرانی لکیر پیٹے چلے جارہے ہیں مگر ان کا وجود و عدم برابر ہے۔ نہ اُنھوں نے کبھی علم و تمدن کا

Marfat.com

دیا اور نہ علم و تمدن نے ان کا ساتھ دیا۔ جاہلوں کی ایک جماعت اُن کے ساتھ ہے جو اُن کی طاقت کو تباہ کر رہی ہے ورنہ ان کو نہ مسلمانوں کے مال پر اختیار رہا نہ اُنکی جان پر نہ اُنکی آبرو زن و بچوں پر۔ تعزیرات ہند نے اُن کیلئے کوئی دفعہ مستثنیات میں سے نہیں رکھی۔ میرا تو اپنا خیال یہ ہے کہ اسلامی قومیت توسیع اسلام کے لئے سنگ راہ ہے۔ مسلمانوں کی جماعت قومیت کا رنگ اختیار کر کے اپنی جماعت کو وسیع کرنے کے ناقابل ہو جاتی ہے اور قومیت کی جتنی برائیاں اور لعنتیں ہیں ان سب کا حامل ایک ایسا مذہب کر دیا جاتا ہے جو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے پیام امن ہے۔ خیر یہ تو ضمنی گفتگو تھی۔ اصل بحث یہ ہے کہ نصاب زکوٰۃ متعین نہ ہونا چاہیئے اگر حدیث سے اُس کی تعیین ثابت ہو تو وہ موقوف ہے ایک وقتی زمانے کیلئے اور یہ کہ اب زکوٰۃ کا مفہوم اسلامی سلطنت سے باہر اور موجودہ اسلامی سلطنت میں صرف خیرات ہے جو مسلمانوں پر جبکہ وہ مستطیع ہوں ہر وقت فرض ہے نہ اس کے لئے کوئی زمانہ درکار ہے اور نہ کوئی نصاب حامل بالقرآن کی زکوٰۃ تمام ذ مصارف روزانہ ہیں جو خیراتی فنڈ میں دیے جائیں۔ فقہ اور حدیث نے زکوٰۃ کو جو صورت دی ہے وہ درحقیقت اب اسی جگہ پر رکھے جانے کے قابل ہے جہاں انکم ٹیکس مینول اور انکم ٹیکس ٹیرف ہیں / زکوٰۃ کے نصاب میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شریعت یہود اور قوانین عجم و روم پر کہاں تک فقہا نے عمل کیا ہے۔ خصوصاً یہود کا عشر جس کے متعلق قرآن نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ جو غلہ آسمان یا چشموں کے پانی سے پیدا ہو اس میں دسواں حصہ زکوٰۃ ہے اور جو غلہ سینچنے سے پیدا ہو اس میں بیسواں حصہ زکوٰۃ۔ یہ گویا بالکل بعینہٖ یہود کا چربہ ہے جسکو قرآن سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر ایک سلطنت غلہ پر کوئی ٹیکس وصول کرتی ہے تو اسلام اور مذہب کو اس سے کیا۔ مگر شاید اس قسم کی احادیث کا مطلب یہ تھا کہ عوام کو مذہب کے ذریعہ سے سلطنت کا مطیع بنایا جائے لیکن اگر اس طرح سلطنت کی طرفداری کی گئی تھی تو کیا یہ زیبا نہ تھا کہ سلطنت کو بھی مذہب سے [illegible] کر دیا جاتا کہ عشر وصول کر کے اس سے حرم کے لئے خوبصورت لونڈیاں نہ خریدی جائیں اور علماء کو رشوت نہ دی جائے بلکہ مفلوک الحال مسلمین کی پرورش پر وقف کر دیا جائے اور عشر درحقیقت یہودیوں کی ہی ایجاد نہیں ہے اہل بابل و مصر بھی اتنا ہی حصہ اپنے دیوتاؤں پر چڑھاوا چڑھانے کے لئے الگ کر دیتے تھے اور جیسا کہ کتاب تورات سے معلوم ہوتا ہے یہود بھی بالکل یہی چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے۔ اس کے مقابل اگر قرآن میں کچھ کہا گیا ہے تو وہ مال غنیمت پر خمس تھا۔ جیسا ارشاد ہوتا ہے :-

واعلموآ انّما غنمتم مّن شیءٍ فانّ اللّٰہ خمسہٗ وللرّسول ولذی القربٰی والیتمٰی والمساکین وابن السّبیل ان کنتم اٰمنتم باللّٰہ (۸)

یہ لطیفہ بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ بعض اوقات ایسے احکام جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے تو دبخود ترک ہو جاتے ہیں ہندستان میں کوئی مسلمان کاشتکار اپنی کھیتی کا عشر نہیں دیتا باوجودیکہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ اسی طرح

حدیث نے جس بات سے منع کیا ہے اس سے مسلمانوں کو کچھ بھی اکراہ نہیں۔ چنانچہ زمین کو کرائے پر دینا حدیث میں ممنوع ہے جیسا مسلم کی اس روایت سے ظاہر ہے:۔ ابن عمر اپنی زمین کرائے پر دیا کرتے تھے۔ پھر اُن کے پاس ایک آدمی آیا اور اُس نے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کھیتوں کو کرایہ پر دینے سے۔ تو ابن عمر گئے اور میں بھی (راوی) اُن کے ساتھ تھا یہانتک کہ بلاط (ایک مقام ہے مدینہ میں مسجد نبوی کے پاس) میں رافع سے ملے اور اُن سے یہ حدیث پوچھی اُنھوں نے کہا ہاں آنحضرت نے منع کیا کھیتوں کو کرایہ پر دینے سے۔ آخر ابن عمر نے کھیتوں کو کرایہ پر دینا چھوڑ دیا۔ مگر کو مسلمان اس پر عمل نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ روایت سوشلزم کی جان ہے۔

قرآن کو چھوڑ کر دوسروں کے اقوال کی تقلید کا نتیجہ اکثر ایسا ہی ہوا ہے۔ کیونکہ انسانی اقوال انسانی طبیعت کے اختلاف پر نظر نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر تمام انسانوں کی طبیعت کو محمول کرتے ہیں اور قرآن کے خلاف نشار تشدد سے کام لیتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا بڑا حصہ سرے سے اس فرض ہی کو ادا نہیں کرتا۔ مسلمانوں میں بالعموم جو نماز روزے کی پابندی نہیں ہے۔ اسکا بھی یہی سبب ہے کہ اُن پر قرآن سے زیادہ تشدد کیا گیا اور اُنھوں نے اسکی وجہ سے اصل فرض کو ہی گم کر دیا۔

نصاب زکوٰۃ کی جو صراحت فقہا نے کی ہے۔ مجھ کو کوئی حدیث اسکی تائید میں نظر نہیں آئی۔ البتہ انس رضؓ سے مسلم میں ایک روایت ہے جس کی تائید ابن عمر کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک نے ابوبکر صدیق کا نام لیا ہے اور دوسرے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ انسؓ کی روایت یوں ہے:۔

"ابوبکر صدیق نے میرے واسطے لکھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ فرض زکوٰۃ کا بیان ہے جسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا ہے اور اللہ نے اس کا حکم اپنے رسول کو کیا۔ جب اونٹوں کی عمروں میں فرق ہو اور اس کے پاس صرف تین برس کی اونٹنی ہو تو وہی لے لی جاویگی۔ اور دو بکریاں اور لی جاوینگی اگر اس کے پاس ہوں ورنہ بیس درم لئے جاوینگے اور جسکے پاس اتنے اونٹ ہوں جن میں تین برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہے (یعنی چالیس سے ساٹھ تک) اور اس کے پاس تین برس کی اونٹنی نہ ہو تو اس سے دو برس کی اونٹنی لی جاویگی اور دو بکریاں اور بیس درم۔ اور جس کے پاس اتنے اونٹ ہوں جن میں دو برس کی اونٹنی لینا واجب ہوتی ہے (یعنی ۳۶ سے ۴۵ تک) اور اس کے پاس دو برس کی اونٹنی نہو لیکن تین برس کی اونٹنی ہو تو وہی لی جاویگی اور زکوٰۃ تحصیل کرنے والا اُس کو بیس درم پھیر دیگا اور جس کے پاس اتنے اونٹ ہوں جن میں دو برس کی اونٹنی واجب ہو جاتی ہے اور اسکے پاس دو برس کی اونٹنی نہو تو اس سے ایک برس کی اونٹنی لیجاویگی اور بیس درم اُسکو اور دینا ہونگے یا دو بکریاں۔ اور جسکے پاس اتنے اونٹ ہوں جنمیں ایک برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہے (یعنی ۲۵ سے ۳۵ تک) اور ایک برس کی اونٹنی اُس کے پاس نہ ہو لیکن دو برس کی اونٹنی اسکے پاس موجود ہو تو وہ اس سے لی جاویگی اور زکوٰۃ لینے والا بیس درم یا دو بکریاں پھیر دیگا۔ اور اگر کسی کے ایک ایک برس کی اونٹنی موجود نہیں لیکن دو برس کا نر اونٹ موجود ہو تو وہ اس سے لے لیا جائیگا اور اُس کو کچھ اور نہ دیا جائے گا۔"

یقیناً ان احکام کا تعلق مذہب سے نہیں ہوسکتا بلکہ محض ایک زمانے کے خراج ملکی کی تفصیل ہے۔ نصاب زکوٰۃ کا مدعا اگر یہ ہے کہ زکوٰۃ کی پابندی بجائے عام تاکید کے ایک فرض خاص سمجھا جاوے تو اسکو عملی حیثیت سے دیکھو اوّل تو انکم ٹیکس وخیرات میں باہم اتفاق کی صورت نہیں ایک جبریہ ہے اور دوسرا اختیاری۔ ایک کے دینے میں مسلمانوں کو حیلے کرنے پڑینگے اور دوسرا حاجتمندوں کو حقیقی معنوں میں امداد کرتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس خیرات کرنے کو مال ہے مگر فقہ کے رُو سے اسپر نصاب ابھی واجب نہیں یا وہ ایسی ترکیب کرتا ہے کہ اُس پر کبھی واجب نہ ہوگی تو تم ایسے شخص سے کیونکر خیرات کی توقع رکھ سکتے ہو۔ حالانکہ خیرات تو یہ تھی کہ اُس کو زکوٰۃ کا مفہوم وہی بتایا جاتا جس کے لئے نصاب وقت کی کوئی قید نہ ہو۔ زکوٰۃ نماز کی طرح ایک فرض روزانہ ہے۔ عیسائیوں میں ہر اتوار کو جب نماز ختم ہوجاتی ہے تو زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے اور وہ نیک کاموں میں خرچ کرنے کے لئے گرجے میں جمع رہتی ہے۔ کیا اس میں واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ کی بو نہیں آتی۔ کیا تم بھی نماز جمعہ پڑھ کر ایک آدھ روپیہ زکوٰۃ کا نہیں نکال سکتے۔ مگر تم نے اپنی روایت پرستی کے آگے قرآن کے صاف وصریح حکم کو پس پشت ڈالدیا۔ قرآن نے زکوٰۃ کا اوّلین مصرف ذوالقربیٰ اور یتامیٰ بتایا ہے۔ لیکن اگر یہ ہمارے ذوالقربیٰ سیدزادے ہیں تو وہ تمھاری سالانہ زکوٰۃ سے ہی محروم ہیں۔ کیا اس سے بڑھکر اور کوئی دوسری مثال احکام الٰہی اور آیات بینات کو روایت حدیث سے منسوخ کرنے کی مل سکتی ہے۔ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ زکوٰۃ کا دینے والا اگر وہ سید ہو تو خود اپنے محتاج اقربا کی امداد زکوٰۃ سے نہیں کرسکتا۔ یہ مت خیال کرو کہ جس شخص نے سیدوں پر زکوٰۃ حرام کرنے کی حدیث وضع کی ہے وہ اس بات کا متمنی تھا کہ اولاد رسول گداگری کا پیشہ اختیار نہ کرسکے۔ لہذا یہ حدیث چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اگرچہ قرآن کے احکام کے خلاف پڑرہی ہے مستحسن اور قابل قبول ہے۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ سیدوں نے اپنے کو تمھارے مال کا زیادہ حقدار سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ وہ تم سے اس سے زیادہ لینا چاہتے تھے جتنا تم اُن کو زکوٰۃ میں دیتے وہ تم سے خمس کے طلبگار رہتے۔ کیونکہ سیدوں کو مسلمانوں کا تمام مال مالِ غنیمت تھا۔ تو دراصل واضع حدیث کا منشا ہم سنیوں میں پورا نہ ہوا۔ اولاً یہ حدیث شیعوں میں پھیلائی گئی تھی اور یہ سمجھکر کہ اُن پر بنی فاطمہ کا حق زیادہ ہے زکوٰۃ کی بجائے خمس طلب کرنے کی سکیم بنائی گئی تھی جسکو انھوں نے قبول کرلیا۔ سنیوں نے جہاں تک اپنے طلب کی بات تھی یعنی سیدوں کو زکوٰۃ نہ دینا۔ اُسکو تو قبول کرلیا اور جس میں اپنے طلب کی بات نہ تھی یعنی مال کا خمس سیدوں کو دیدینا وہ انھوں نے شیعوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اور پھر خدا ہمارے ان فقیہوں کا بھلا کرے۔ ایسے ایسے حیل شرعی زکوٰۃ سے بچنے کے لئے پیدا کئے ہیں کہ نہ سید پائے نہ غیر سید۔ میرے ایک دوست نہایت متقی و پرہیزگار۔ صاحب نصاب اور ایک مدرسے کے فارغ التحصیل مولوی تھے۔ وہ سالانہ زکوٰۃ نکال کر ایک تھیلی میں ڈال لیتے اور ایک مسکین کے ہاتھ میں تھیلی دیکر اس سے کہتے کہ اس تھیلی کو میرے ہاتھ دس روپے میں بیچڈالو۔ مسکین خوشی سے بیچڈالتا اور اُن کے نزدیک اس حکمے سے اللہ میاں ایسے چپ ہوجاتے کہ اُنکو مولوی صاحب کو دوزخ میں بھیجنے کی کبھی ہمت ہی نہ پڑتی۔

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا

Marfat.com

# خاتمہ

## شریعت قرآن

حدیث کی انہدامی صورت کے بعد لازم ہے کہ قرآن کی انفرادی صورت پر توجہ کی جائے۔ تاکہ مسلمان عا
بالقرآن ہوکر اس سیدھے سادے اسلام پر آجائیں جو خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم کا مسلک تھا۔ اور جس
نہ صرف اُن کا ہی قلب مطمئن ہو بلکہ دنیا کی متمدن قومیں اسطرف رجوع ہوسکیں۔ ہم یہاں پر مختصراً اس اصول
فقہ وعقائد کا ایک خاکہ کھینچنا چاہتے ہیں۔ جس میں روایت وقیاس رائے کو کوئی دخل نہ ہوگا۔ ہر چیز کی سند کے لئے
قرآن اور سنت متواترہ کو کافی سمجھا جائے گا۔

مذہب کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ اوّل عقائد، دوم اعمال۔

(۱) عقائد کے معنی اس ایقان واطمینان قلب کے ہیں جو ہمارے اعمال نیک وبد کے محرک مانع ہوتے ہیں
یا ہم کو نیک وبد کے تمیز کرنے کی قوت عطا کرتے ہیں۔

(۲) ہمارے نزدیک اعمال صالح کا اساس عقائد صحیحہ ہیں۔ اگر ایک شخص ملحد ولامذہب ہے مگر اس سے نیک
عمل سرزد ہوتے ہیں یا برائیوں سے بچتا ہے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس میں سوسائٹی کا خوف یا ریاکاری یا دنیاوی
تعزیر کا ہراس شامل ہے۔ اسی طرح جو شخص ایمان رکھتا ہے مگر برائیوں سے بچتا نہیں یا ان سے بچنے کی کوشش نہیں
اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہمارے عقائد واعمال کے ضروری اجزا یہ ہیں۔

(۳) موت کے بعد حشر ونشر۔ جزا وسزا کا قائم ہونا انسان پر جو جسم وروح کے ساتھ بنا ہے۔

(۴) ہماری موت وزندگی کا ہمارے اختیار سے باہر ہونا اور ایک ایسے کے قبضے میں ہونا جو حی القیوم ہے۔

(۵) اس حی القیوم کا نام اللہ ہے۔ وہ لاشریک ہے۔ ان صفات سے متصف ہے۔ جنکی تعریف وہ خود کرتا ہے

(۶) نبوت وکتب سماوی وملائکہ اس حقیقت کے تابع اور ہمارے اور اسکے درمیان واسطہ ہے۔

(۷) ہم اُسکی ابتدا وانتہا کو سمجھ نہیں سکتے مگر ہم مظاہر قدرت پر غور کرکے اسکے وجود پر ایمان لاسکتے ہیں۔

(۸) ان مظاہر قدرت میں سب سے بڑی خیر وہدایت قرآن یا وحی ناطق ہے جو ہم کو راستی۔ نیکی وتقوے کی
لیجاکر ہمارے ایمان کو تقویت دیتی ہے۔ اس کتاب پر ایمان لانا درحقیقت ہمارے افکار مشکک ومشوشہ کا بہتر

علاج ہے۔ کیونکہ بغیر الہام و وحی کے بے چون و چرا تسلیم کرنے کے ہمارے لئے کسی ایسے وجود کا سمجھنا جو ہماری قوت بشری کے حدود سے باہر ہو ناممکن ہے۔ اسلئے قرآن پر ایمان لانا اوّلیں اساس ایمان ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن نے اس کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حق و لاریب ہے۔

(۹) قرآن کے الہامی ہونے کے متعدد ثبوت قرآن میں ہیں جو اہل بصیرت جانتے ہیں۔ ہم قرآن میں نسخ و تحریف اور قرآن کے وقتی کتاب ہونے کے شدت سے مخالف ہیں اور نہ یہ ہمارا قول ہے کہ قرآن ایک چیستان ہے جو معمولی سمجھ کا آدمی سمجھ نہیں سکتا۔ وہ تفسیر و تاویل سے مستغنی ہے۔ اگر اس میں انبیائے سابقین کے ذکر میں بعض مافوق العادۃ باتوں کا ذکر ہے تو اس کی لغو تاویل ہمارے نزدیک جائز نہیں۔

(۱۰) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام صفات سے متصف ہیں جو قرآن نے بتائے ہیں۔ آپ بشر ہیں۔ خیر البشر ہیں۔ خدا کے بندے ہیں مگر سردار رسل اور کافۃ الناس کے لئے تاقیامت نبی مرسل۔ آپ خاتم النبیین ہیں۔ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپ کا اُسوہ مبارک ہمارے لئے قابل عمل۔ آپ حلیم و رؤف ہیں۔ آپ صاحب آیات الٰہی ہیں۔ آپ کے عمل ظاہرہ و مشہور جو سنت متواترہ کہلاتے ہیں مذہب اسلام کی شیرازہ بندی کے لئے ضروری ہیں۔ آپ نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ کسی سے خدع سے کام نہیں لیا۔ آپ نے کفار کے ساتھ جہاد کیا جو قوموں میں جنگ کا ایک نمونہ ہے۔ آپ نے معاشرتی زندگی میں تعدد ازدواج کو خواہشات نفسانی کا حیلہ نہیں بنایا (نعوذ باللہ) بلکہ ان مجبورین اور مطلقین کو عزت بخشی جن کی پرورش و کفالت آپ پر ضروری تھی۔ آپ نے اس معاملہ میں قرآن کے تحدید سے تجاوز نہیں کیا۔ بلکہ قرآن کا حکم آپ کے نکاح کے بعد کا حکم ہے۔ مگر از بسکہ آپ جامہ بشریت میں تھے اور آپ میں وہ تمام خواص انسانی کاملیت کی حیثیت سے تھیں جن پر انسانیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ آپ کو انسانوں کی طرح عورتوں سے رغبت تھی اور اُن کو دوست رکھتے تھے۔ آپ نفس کش راہب نہ تھے۔ جو مال خدا عطا کرتا تھا اُس کو ھنیاً مریاً جانتے۔ خود کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے۔ آپ کی سیرۃ مبارک میں بہترین صفت آپ کی صفائی اور نفاست پسند طبیعت ہے۔ حتیٰ کہ آپ بدبو پھیلانے والے میلے کچیلے آدمیوں کو مسجد سے باہر کروا دیتے۔

(۱۱) ہمارے نزدیک شرک یہ نہیں ہے کہ خدا کی ذات و صفات میں اختلاف ہو بلکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کو خالق و مطاع کا درجہ دیا جائے۔ یا اُن کو ایسی صفت سے متصف کیا جائے جیسے عالم الغیب کی صفت یا فطرت کو قبضے میں کرنا۔ یا انسانوں کی شفاعت کرنا (بجز خدا کی مرضی کے) جو خدا کے لئے مخصوص ہیں۔

(۱۲) ہمارے نزدیک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ فطرت کا صانع و تبدیل کرنے والا بھی ہے مگر ہم یہ فلسفیانہ بحث کہ خدا اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے یا خدا کو جھوٹ بولنے پر قدرت ہے۔ یا وہ اپنے بندے کو گناہ کا اختیار دے کے کیوں اُس کو سزا و جزا دیتا ہے۔ یا اس کا کلام مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ یا خود اُس کو کس نے پیدا کیا۔ ہم اسکو [illegible]

Marfat.com

شیطانی جان کر اس میں گفتگو نہیں کرتے۔

(۱۳) ہمارے نزدیک جنت و دوزخ کی جو صراحت قرآن شریف میں ہے وہ امثالی ہے۔ اور جنت و دوزخ کے لذائذ و عذاب کی تشریح ہمارے دنیاوی تجربہ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اگر ہم میں لذائذ و عذاب کا احساس وہی ہے جو کئی ہزار سال پہلے تھا یا جواب بدل دیا گیا ہے تو ان نئے لذائذ کو سامنے رکھ کر جنت و دوزخ کی نئی تعریف کی جا سکتی ہے۔ عذاب نار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ واقعی دنیا کی آگ کی طرح ہو۔ بلکہ تکلیف و کرب کی آخری صورت جو انسان کو جلنے پر معلوم ہوتی ہے وہ ایک مثال ہے عذاب دوزخ کی۔ ہم اس کے متعلق کہ خدا کو عذاب ابدی دینے سے کیا فائدہ کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ یہ اسرار خداوندی ہیں۔ مگر ہمارے تقوے کے لئے ضروری۔

(۱۴) ہم کسی ایسے شخص کی جو خدا کا منکر نہیں ہے تکفیر نہیں کرتے۔ خواہ اسکی وضع قطع۔ عبادت میں ہم سے فرق ہو۔ اسلئے ہم منکرین رسالت و قرآن کو صرف گمراہ اور غیر مسلم جانتے ہیں مگر مستوجب نار نہیں۔ جب تک کہ اس کا اعتقاد خدا کے وجود پر ہے اور اپنے اعمال میں خدا سے ڈرتا ہے۔ اگر وہ اس جنت کا مستحق نہیں جسکا وعدہ مسلمانوں سے ہے تو وہ اعراف میں جگہ پائیگا اور بہت ممکن ہے کہ اعراف میں اس کو انکار رسالت و قرآن پر غور کرنے کا موقعہ دیا جائے اور آخر میں وہ مسلمانوں کی بہشت کا مستحق ہو سکے ہم اُن کو بھی مستوجب نار نہیں جانتے جن میں وحشت و جہالت کے سبب مذہب کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔ یا جن کو اسلام کی دعوت نہیں پہونچی۔

(۱۵) ہمارے نزدیک تاقیامت کوئی نبی یا ہادی پیدا نہ ہوگا۔ ملاحم و معاد کی تمام روایتیں جنکا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ ان کا نہ ہم کو اقرار ہے نہ انکار۔ یہ منحصر ہے راویوں کے صدق و کذب پر۔ اغلب یہ ہے کہ وہ روایتیں اہل کتاب کی ہوں۔

# اعمال

(۱) ہمارے اعمال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فرض دوسرے نوافل یا سنت۔ فرض وہ احکام ہیں جو قرآن میں بصراحت موجود ہیں۔ یعنی طہارت بدنی۔ اوقات معینہ (فجر۔ عصر۔ عشا) پر نماز پڑھنا۔ ایام صیام (آخری عشرہ) میں روزے۔ اپنے مال کا ایک حصہ فقرا کے لئے وقف کر دینا۔ حج کرنا وغیرہ۔ سنت یا نوافل وہ عمل ہیں جنکی صراحت قرآن میں نہیں مگر مسلمانوں کی جماعت ہمیشہ کرتی آئی ہے۔ مثلاً پانچ وقت کی نماز پڑھنا تعدیل ارکان و جماعت سے۔ مہینہ رمضان روزے رکھنا۔ زکوٰۃ اسلامی سلطنت میں بطور ٹیکس ادا کرنا۔ مگر ازبسکہ یہ عمل سنت ہیں۔ اگر ہم مجبوراً کو چھوڑ دیتے ہیں تو ہم احکام الٰہی سے انحراف نہیں کرتے۔ البتہ بلا عذر و سبب چھوڑنے کو ہم اسلئے بُرا جانتے ہیں کہ سے جماعت میں تفرقہ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ بشرطیکہ مسلمانوں کی بڑی جماعت ایک ایسے کام کو اختیار کرلے جو قر

Marfat.com

کے صریحاً خلاف ہو تو اُس کا ترک کرنا ضروری ہے مثلاً مشائخ و قبور پرستی۔ تعزیہ داری۔ شبرات۔ قربانی وغیرہ

(۲) ہمارے نزدیک حلال و حرام کا اصول یہ ہے کہ اوّل اس کی صراحت قرآن میں ہو۔ اگر قرآن میں نہ ہو تو ایسے عمل ہوں جن سے ہم کو یا ہمارے ابنائے جنس کو کسی قسم کی مضرت پہنچے۔ اسلئے ہمارا کوئی عمل جو ان شروط سے باہر ہو مثلاً نیچا پائجامہ پہننا۔ ڈاڑھی بڑھانا۔ مانگ نکالنا۔ سرمہ لگانا۔ سونے چاندی کا استعمال یا ساٹن۔ ریشمی کپڑے پہننا۔ تصویر کھینچنا۔ غیر ضرر لہو و لعب میں جی بہلانا۔ ماکولات لحم۔ ان کو حلال و حرام کی فہرست میں شمار نہیں کرتے۔

(۳) ہمارے نزدیک عمل کا دارومدار نیت و اعتقاد پر ہے۔ حیل شرعی اور لفظی حجت ہمارے نزدیک وسائل شیطانی ہے۔

(۴) ہمارے نزدیک مذہب کا دائرہ سیاست ملکی پر وسیع نہیں اور نہ ہمارے نزدیک کوئی فقہ کی کتاب قرآن کی طرح قابل عمل ہے۔ اگر قرآن نے بعض احکام دنیاوی و سیاسی میں کوئی بات مسلمانوں کے لئے تجویز کی ہے تو وہ وقتی اور قومی ہے۔ سلطنت اسلامی میں ہم وقت و زمانہ کے لحاظ سے ترمیم کر سکتے ہیں اور غیر اسلامی سلطنت میں تو ہم کو قانون حکومت کا مطیع ہونا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ اسلام ایک مذہبی جماعت ہے نہ ایک قوم و ملک۔ اسلام قومی ترقی کا مانع نہیں ہے۔

(۵) اسلام میں یہود کی طرح نہ کوئی شریعت ہے نہ احبار۔ ہر شخص مجاز ہے قرآن پر غور کرنے اور پڑھنے کا اور عمل کرنے کا۔ اور اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کا۔

Marfat.com

# تتمہ جات

۱۔ قربانی ——— عرشی

۲۔ مہدی ——— ڈاکٹر یعقوب بیگ

۳۔ ایصال ثواب ——— علامہ تمنا عمادی

۴۔ وقف کی دینی حیثیت ——— علامہ حافظ اسلم جیراجپوری

۵۔ المسند امام احمد ——— مولنا تمنا عمادی

۶۔ منکرین حدیث ——— مولنا اسلم جیراجپوری

۷۔ حکم وصیت و قانون وراثت ——— مولنا تمنا عمادی

۸۔ آخری مگر سچی بات ——— وہی حق گو

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تحقیق قربانی

از ——— عمر قریشی

**ماخذ**۔ یہ مضمون (تحقیق قربانی) کتب ذیل کی ورق گردانی کا نتیجہ ہے۔
قرآن[1] مجید۔ توریت[2] شریف

**تراجم**:۔ شاہ ولی[3] اللہ صاحب۔ شاہ عبدالقادر[4] صاحب۔ شاہ رفیع[5] الدین صاحب۔ ابوالکلام[6] احمد صاحب فتح محمد[7] صاحب جالندھری۔ وحید[8] الزماں۔

**تفاسیر**:۔ تفسیر بیضاوی[9]۔ ابو سعود[10]۔ ابن عباس[11]۔ تفسیر کبیر[12]۔ تفسیر طنطاوی[13]۔ تفسیر قادری[14]۔ تفسیر جلالین[15] تفسیر مظہری[16]۔ تفسیر رشید[17]۔ تفسیر خازن[18]۔ تفسیر مدارک[19]۔ تفسیر عبدالحکیم[20] تفسیر محمد علی[21]۔ تفسیر نواب[22] صدیق حسن خاں۔ بیان للناس[23] خواجہ احمد دین۔ تفسیر مولوی[24] انشاء اللہ۔ مقدمہ[25] تفسیر حقانی۔

**حدیث**۔ تلخیص[26] الصحاح

**لغت** ـــ مفردات[27] راغب۔ منتہی الارب[28]۔ تاج المصادر[29] بیہقی۔ منتخب[30] اللغات۔ قرآنی[31] ... تسہیل[32] العربیہ۔

**متفرق**:۔ ریاض[33] الحرمین۔ رسوم[34] جاہلیت۔ آئینہ[35] عرب۔ انسائیکلوپیڈیا[36] ... یورپ (لیکی) اسرار[37] حج۔ مسائل[38] حج۔

**جرائد**:۔ اہلحدیث[39] امرتسر۔ الاصلاح[40] اچھرا لاہور۔ اشاعت[41] اسلام لاہور۔ روزنامہ[42] ... ن نظامی۔ بلاغ[43] امرتسر

مجھے امید ہے کہ اس سعی ناچیز کو غور و توجہ کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ——— قریشی

تاریخ آغاز قربانی، عہد بعہد کے تغیرات۔ مختلف اقوام کے مختلف نظریے۔ قرآنی اصطلاحات ... سورۃ البقرہ اور سورۃ الکوثر سے قربانی کی تحقیق، لغت، حدیث، تفسیر اور تراجم قرآن سے استفادہ۔ مروجہ قربانی سے متعلق مختلف جماعتوں کے قائدوں کے خیالات۔ علمائے مذاہب کا عقل کے خلاف مسلسل جہاد، عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش وغیرہ مسائل کثیرہ۔

**اسلام** ـ قرآن مجید کے مطالعے سے یہ حقیقت کبریٰ واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام فطرت کائنات ...

ہر جگہ مسلّم ہے) اسلئے کسی متبرک انسانی ہستی کو "بانیٔ اسلام" کے لقب سے ملقب کرنا اسلام و قرآن سے انتہائی بے خبری ہے۔ بانیٔ اسلام یعنی فاطر کائنات اللہ تعالےٰ جل شانہٗ وعزّ اسمہٗ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، نوع انسان کتاب ہستی کا احسن حصہ ہے (خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ہم نے انسان کو بہتر انداز میں بنایا۔) اس لئے لازم ہے کہ اسکی فطرت بھی اسلام پر مجبول ہو (فطرتَ اللہ التی فطر النّاس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیّم)[1] اور کلّ مولودٍ یولد علی الاسلام ثمّ ابواہ یہوّدانہ او ینصّرانہ او یمجّسانہٗ[2] (الحدیث)

اسکا نتیجہ یہ ہے کہ تمام کائنات کی طرح انسان کا مذہب اپنے روز آفرینش ہی سے اسلام رہا ہے۔ پھر چونکہ مخلوقات الٰہیہ کا یہ حصّہ قدرے اختیار سے ممتاز کیا گیا ہے اسلئے اس نے اسلام یا اپنی فطرت کے چہرہ نورانی کو ظلم وجہل کے میل سے غبار آلودہ کیا۔ (انّہ کان ظلوماً جہولا۔ انسان بہت ظالم وجاہل ہے) اسی کو پاک وصاف کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے اور سب سے اخیر محمد رسول اللہ صلعم نے کلمات اللہ التامہ کا مجموعہ، قول فیصل، کتاب نور ہدیٰ قرآن مجید پیش کیا۔ جس نے اعتدال و اصلاح اعمال کی اٹل حدود مقرر کر دیں۔ اور انسان کو تمام قدیم و جدید نبوتوں کی تحقیق وتجسس سے بے نیاز کر کے بہت بڑی رحمت سے بہرہ یاب کیا (وما ارسلنٰک الّا رحمۃ للعٰلمین۔ نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر رحمت واسطے جہان والوں کے) یہ خطاب کسی اور نبی کو میسّر نہیں ہوا۔ اسلئے کہ اُن کی تعلیم زمانی و مکانی کے سبب ناتمامی سے مبرّا نہ تھی۔ قرآن ہر ملک، ہر عہد اور ہر قوم کے لئے ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی جدید نبوّت کا انتظار اس کے ناتمام ہونے کا کھلا ہوا اقرار ہے۔

**قبل نزول قرآن**

اسلام کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا، فطرت پر تصنّع کے پردے پڑ چکے تھے، اعتدال فی الاعمال مفقود تھا بعض قومیں حبّ دنیا میں غرق تھیں (یہود، ہنود، مجوس وغیرہ) اور بعض قطعاً ترک دنیا ہی کو فلاح ونجات سمجھتی تھیں (عیسائیت، جوگیت وغیرہ) ایک طرف جسمانی صفائی میں مبالغہ تھا، دوسری جانب جسم ناپاک رکھ کر خدا کو خوش کیا جاتا تھا۔ حج، نماز، روزہ، صدقات اور خیرات سب کچھ تھا لیکن افراط وتفریط رسوم واوہام میں محصور، حکمت وحقیقت سے دور، قرآن مجید نے ان سب اعمال وعقائد کو محکم عقلی وتجربی دلائل پر قائم کر کے حکیمانہ نتائج سے رُوشناس کیا۔

## قربانی

حج میں قربانی کا دستور بھی قدیم الایام سے چلا آتا تھا۔ بُت پرست اقوام کے اختلاط سے عرب ملّت ابراہیمی کا

---

۱؎ (یہ) خدا کی (بنائی ہوئی) سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی (بنائی ہوئی) بناوٹ میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی دین (کا) سیدھا (راستہ) ہے۔

۲؎ ہر ایک بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اسکے ماں باپ اسکو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

Marfat.com

ہو چکے تھے۔ بتوں کے سامنے جانور ذبح کرتے تھے۔ ان کا خون ان پر لگاتے تھے کہ گویا یہ ان بتوں نے کھایا ہے۔ ان کے آگے باجے بجاتے اور ناچتے کودتے تھے۔ ان کے گرد طواف کرتے تھے۔ ان پر بعض اوقات اولاد کی قربانی بھی کیا کرتے تھے۔ انکے ناموں پر جانور چھوڑتے تھے۔ جیسا کہ ہندستان میں ہندو بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے ہیں..... اللہ کے نام کی چیزوں کو بتوں پر چڑھاتے تھے[۱]۔

اس مقام پر قربانی کی تاریخ اور عہد بعہد کے تغیرات کا مختصر ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

## تاریخ قربانی

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے بیان کے مطابق۔ قدیم انسان دیوتاؤں کے سامنے قربانی کرتا تھا اور ان کو پانی، تیل، شراب، گوشت، آٹے اور پھلوں کا مشتاق سمجھتا تھا۔ روم، یونان اور دنیا کے ہر حصے میں زندگی کی قربانی بطور کفارہ ادا کی جاتی ہے، قربانی کا مقصود دیوتا کی رضامندی حاصل کرنا اور اس کے بعد اپنی مراد کو پہنچنا ہوتا تھا۔ سامی مذاہب میں یہود کا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص خدا کے سامنے خالی ہاتھ بے نذرانہ نہیں ہونا چاہئے (خروج ۲۳/۱۵) اب تک شاہی درباروں میں بے نذرانہ دکھائے حاضر نہ ہونا اسی کا اثر ہے — ہومر قدیم یونانی شاعر کہتا ہے کہ دیوتا نذرانہ سے خوش ہوتے ہیں عبری لفظ MINHO کا مفہوم نذرانہ، خراج، قربانی، بالخصوص زراعتی قربانی ہے۔ تمام قوموں میں قربانی کا زمانہ کٹائی کا وقت تھا یا مواد شراب کی تیاری کا وقت۔ جن قوموں میں زراعت نہیں وہ جانوروں کی قربانی کرتے ہیں[۲]۔ بچوں کی ولادت کے بعد پہلا بچہ خصوصیت کے قربانی میں دیا جاتا تھا جیسا کہ اب بھی رواج ہے کہ موسم کا پہلا پھل دیوتا یا ملا کی نذر کیا جاتا ہے۔ یہ ادائے نذر اس نعمت کا شکریہ بھی جاتی ہے جو غلہ، پھل یا اولاد کی صورت میں دیوتاؤں نے عطا فرمائی — [illegible] لوگ تھے اسی مناسبت سے دیوتاؤں سے لین دین کو خوش معاملگی سے قائم رکھنے کے لئے قربانی کرتے تھے۔

## دور ثانی

دور ثانی میں انسان دیوتاؤں کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔ لیکن رسم کو قائم رکھنا [illegible] ہے کہ دیوتا کو گندم وغیرہ کی ضرورت نہیں — عبرانیوں میں یہ رسم قربانی قائم ہوئی [illegible] کیا کہ خدا انسان سے کچھ نہیں مانگتا کیونکہ تمام چیزیں اسی کی ہیں۔ اس ارشاد کے باوجود [illegible] روایات پر مبنی ہوتی ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ غیر متعلمہ ذی فہم اصحاب بھی [illegible] اور یونان کے فلسفی بھی ایسے ہی تاویل پسند تھے۔ خدا کو پتھر کی صورت میں مجسم مانتے تھے۔ اور اس [illegible] اور دودھ چڑھاتے تھے، اجناس اس کے گرد رکھ دیتے تھے۔ قربانی کا [illegible] کو خوراک کا [illegible] اور قبروں پر کھانے کی چیزیں رکھ دیا کرتے تھے۔ [illegible] رحلت کیا کہ دیوتا کے حکم کے مطابق مذہبی رہنما اشیائے قربانی کو پکا کر استعمال کر لیتے تھے۔ [illegible]

---

[۱] مقدمہ تفسیر حقانی صفحہ ۱۹۱-۱۹۲

[۲] جیسا کہ عرب۔ منہ

کے یونان میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ مردے عالم مادی سے الگ ہوجانے کے سبب کثیف مادی غذائیں نہیں کھاسکتے
اشیائے قربانی کو آگ میں جلادینا چاہئے۔ تاکہ ہوا میں منتقل ہوکر لطافت حاصل کرکے تغذیہ اموات کے قابل ہوسکیں۔
پانی کے دیوتاؤں کا نذرانہ سمندر میں ڈالتے تھے۔ زمین کے نیچے کے دیوتاؤں کا ہدیہ زیر زمین دبادیتے تھے ــــ رومیو
بھی یہی خیال تھا کہ دیوتا قربانی کی چیز کو نہیں کھاتے بلکہ اسکی سوختگی کی خوشبو سونگھ کر سیر یا خوش ہوتے ہیں، اس غرض
جب تک کھانے کا کچھ حصہ آگ پر نہ ڈال لیتے، کھانے کا اقدام نہ کرتے تھے۔ غالباً یونانی بھی اس رسم کے پابند تھے۔
قدیم آریہ بھی قربانی سے دیوتاؤں کی ناراضگی کا ازالہ کرتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی عبادت شراب کے بغیر ادا نہ ہو
تھی ــــ عرب میں دیوتاؤں کے ساتھ فریب بھی کیا جاتا تھا، بعد میں ترقی تہذیب و تمدن کے سبب قربانی میں کمی
گئی، نذر کم ہوگئے، یہ اس لئے ہوا کہ دیوتا کی جسمانیت سے انکار اور روحانیت کا ایقان بڑھتا گیا اور دیوتاؤں
طبعاً مستغنی کیا گیا۔

## انسانی قربانی

نسل آدم کی قربانی آدمخوری سے متحد ہے۔ اکثر قومیں غیر یا دشمن قبائل کا گوشت کھانا مباح
سمجھتی تھیں، حیوانی بھیڑیے کی طرح انسانی بھیڑیا بھی صرف اپنے بھائی کا گوشت نہیں کھا
انسانی قربانی نے مذہب کی پناہ میں تقدس حاصل کیا، خصوصاً ان مذاہب میں جن کے دیوتا گوشت خور مانے جاتے
پھر اس سے بھی بتدریج نفرت شروع ہوئی۔ قدرے تہذیب حاصل کرنے کے بعد باپ بیٹے کی یا ایک قبیلہ اپنے اف
کی قربانی کرتے تھے۔ دیوتاؤں کی طرف سے بعض جرائم کی سزا قتل ہوتی تھی۔ بعض دفعہ مجرم کے مفقود ہوجانے پر اس
بجائے کسی دوسرے شخص کو قتل کردیا جاتا تھا، یہ وسیع خیال اکثر رسوم میں اب بھی موجود ہے۔ بکرے کی قربانی اسی کا نت
ہے۔ دراصل مجرم کے بجائے آٹے کے بت بناکر قربانی میں دیتے تھے۔ فدیہ اصل کے قریب قریب ہونا لازم تھا۔ بعض د
مجرم کے متعلقین میں سے چند اشخاص عام جماعت کے حوالے کئے جاتے تھے ــــ سامی باپ دیوتاؤں کی آتش غض
ٹھنڈا کرنے کے لئے بچوں کی قربانی دیتے تھے، دریا مصیبت کو دیوتا کے غضب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض اوقات مجر
قتل کرنے کے بجائے اس کے جسم سے خون لیکر چھڑکتے (سلاطین اول ۱۸/۲۸) یونانی زمین میں دباتے یا سمندر میں پھینک
تھے۔ عبرانی آگ میں جلاتے تھے۔ "مولخ" دیوتا کی قربانی کے بچوں کو مجاور کھاتے تھے اور عموماً نذر آتش کردیتے تھ
تہذیب نے قربانی کی کراہیت واضح کردی۔ لیکن ہم اس سے کچھ ایسے مانوس ہوچکے ہیں کہ تکلف سے اسکو مدلل بنا
کوشش کرتے ہیں کہ "قربانی حقیقت میں کفارہ ہے"، اس سے اخلاق کی حفاظت مقصود ہے۔ یہ غلطیوں کی تلافی ک
ہے، قربانی خوشی سے نہیں غم سے ہوتی ہے۔ اس میں خدا بھی شریک ہوتا ہے، اور ہمارے گناہوں پر رنجیدہ ہوت
ابتدائی یہودیت و مسیحیت میں یہ خیال زور پر تھا، پھر اسکو تبدیل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ــــ انبیائے یہود نے ان
کی مخالفت کی۔ ظہور عیسائیت کے وقت سے خونی قربانی میں کمی ہورہی ہے ــــ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں میں قربانی سے روکنے وا

اگر تم نہ رکو گے تو خدا کا غضب تم سے نہیں رکے گا" Ep.ph خطوط ۲/۱۴ ـــــ فلاسفہ یونان قربانی کی مدلل تردید کردیتے تھے اور اس رسم کا یوں مضحکہ اُڑاتے تھے کہ کیا خالق اشیاء، مادی اشیاء کا محتاج ہے ـــــ اہل یونان اور یہود نے آخر میں قربانی کی یہ توجیہ کی کہ معقول قربانی یا نذرانہ، خدا کے سامنے، پاک اور تائب دل ہے۔ ان دونوں قوموں کا یہ عقیدہ ہوگیا تھا، کہ توبہ کا زبانی اظہار یا ستائش خدا کو پسند ہے، زبور ۱/۱۵ عہد نامہ جدید میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے۔ خط عبرانیوں ۱۳/۱۵ "آؤ ہم ستائش کی قربانی متواتر خدا کے حضور پیش کرتے رہیں، یعنی اپنے لبوں کے پھل جو اس کے نام کا اقرار کرتے ہیں"ـــــ اہل یونان کا قول ہے کہ "قابل آدمیوں کی طرف سے دعائیں اور شکریہ بھی خدا کو مقبول ہے"ـــــ مسیحی خیال ہے کہ "خدا حافظ غرباء ہے، غرباء کو کچھ دینا قربانی کے برابر ہے"ـــــ جو خیرات دیتا ہے وہ گویا ستائش کی قربانی خدا کو پیش کرتا ہے۔ بھلائی اور نیکی کو نہ بھولو اس سے خدا بہت خوش ہوتا ہے۔ عبرانیوں ۱۳/۱۶ فلپائن کو خط ۴/۱۸ [1]

## توریت اور قربانی

توریت مجید کے بیان کے مطابق قربانی کا آغاز نوع انسان کے زمانہ آغاز سے شروع ہوتا ہے جبکہ آدم کے دو بیٹوں قائن اور ہابل نے اپنی اپنی قربانی پیش کی، ایک کی مقبول ہوئی اور دوسرے کی نامقبول رہی۔ پیدائش باب ۴۔ یہی مفہوم قرآن مجید کے ایک غیر متعین قصہ سے منسوب کیا جاتا ہے جس سے بعض مفسرین نے اختلاف بھی کیا ہے (واتل علیھم نبا ابنی آدم)

قول الحسن والضحاك ان ابنی ادم الذین قربا قربانا ما کان ابنی ادم لصلبه وانما کان رجلین من بنی اسرائیل ـــ الرازی

حسن اور ضحاک کا قول ہے کہ آدم کے دو بیٹے جنھوں نے قربانی کی، آدم کے صلبی بیٹے نہ تھے، بلکہ بنی اسرائیل کے دو شخص تھے۔

## مسلمان اور قربانی

مسلمان اپنی رسم قربانی کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے کرتے ہیں جس میں خلاصہ بروئے توریت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو واضح طور پر اسحاق کی سوختنی قربانی کا حکم ملا اور آپ آگ وغیرہ تیار کرکے آمادہ ہوئے تو فرشتے نے منع کردیا آپ نے اپنے پیچھے ایک مینڈھا موجود پایا، حکم الٰہی کے مطابق بیٹے کے بجائے اُس کو قربانی میں دیا[2]۔ اُس دن سے قربانی کی رسم قرار پائی۔

یہاں ایک بحث پیدا ہوتی ہے، کہ اسحاقؑ کی قربانی کا حکم ہوا تھا یا اسماعیلؑ کا؟ اہل کتاب بالاتفاق اسحاقؑ کو ذبیح مانتے ہیں، اسلئے کہ توریت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اسماعیلؑ کی طرف مائل ہے

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲۱ لفظ قربانی [illegible]

[2] پیدائش باب ۲۲۔

لیکن صحابہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اہل کتاب کے ہمنوا ہیں[۵۱] بعض مفسر دونوں بھائیوں کو ذبیح مانتے ہیں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس پر کوئی نص صریح موجود نہیں۔

تورات کے اخلاقی احکام مسلم، مگر تاریخ میں اس کا جو پایہ ہے ظاہر ہے، قرآن مجید تورات کے بہت سے تاریخی بیانات کی، جو نبیوں کے شایان شان نہیں، اصلاح کرتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کو بھی کمال احتیاط، فصاحت و بلاغت نتیجہ خیز اور اثر انگیز طریق سے بیان کیا ہے:۔

"ابراہیمؑ نے نیک بیٹے کے لئے دعا مانگی، ہم (خدا) نے اسکو بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، سو جب وہ لڑکا جوان ہوا تو ابراہیمؑ نے کہا اے میرے بیٹے، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، سوچ کر بتا اس میں تیری کیا رائے ہے، اس نے کہا میرے باپ! جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر! تو مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائے گا، سو جب دونوں نے تسلیم کیا اور اُسے ماتھے کے بل لٹایا اور ہم نے اُسے پکارا کہ اے ابراہیم! تو نے تو خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیکی کرنے والوں کو اسطرح بدلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بھاری قربانی کو اس کا فدیہ کر دیا۔"

## تورات اور قرآن کے بیان میں فرق

| تورات | قرآن |
|---|---|
| (۱) بیداری میں بیٹے کی سوختنی قربانی کا حکم ہوا | (۱) خواب میں بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا۔ |
| (۲) مینڈھا موجود پایا۔ اس کی قربانی دی | (۲) مینڈھے کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک بھاری قربانی کو اسکا فد |

ان واضح اختلاف کے ہوتے ہوئے ہمارے مفسروں نے حسب عادت تورات اور اہل کتاب کی روایتوں کو آیا مندرجہ کی تفسیر میں داخل کر کے قرآن کی اصلاحی روش پر پردہ ڈال دیا یعنی مان لیا گیا کہ گو خواب ہی میں سہی لیکن ا کو بیٹے کے ذبح کا حکم ضرور ملا تھا، اور مینڈھا بھی مہیا کیا گیا تھا جو بہشت سے بذریعہ[۵۲] جبریل لایا گیا تھا۔ اس مینڈ کو مرتبے میں جناب ذبیح کی قربانی سے عظیم ثابت کرنے کی ناکام کوششیں بھی کی گئیں تاکہ قرآن کے الفاظ "ذبح ع

---

[۵۱] علی بن مسعود عباس اور تابعین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسحاق ذبیح تھے مدارک صہ ۲۵ علی ہامش خازن طبع مص اس پر حضرت یعقوبؑ کا خط بنام یوسف بھی دال ہے جس میں لکھا ہے عن یعقوب اسرائیل اللہ ابن اسحٰق ذبیح اللہ بن ابراھیم خلیل اللہ۔

[۵۲] اس کے متعلق بہت سی مضحکہ انگیز باتیں قدیم تفسیروں میں موجود ہیں۔

Marfat.com

سے مطابقت پیدا ہو سکے۔

لیکن ان راہِ تقلید کے سالکوں سے الگ کچھ لوگ ایسے بھی ہو گزرے ہیں جنھوں نے اپنی بساط بھر حقیقت کا سراغ لگایا۔ چنانچہ امام رازی کا بیان ہے کہ معتزلہ اور فقہائے شافعیہ و حنفیہ اس خواب کو حکم ذبح نہیں مانتے۔ کیونکہ اگر یہ حکم ہے تو تعمیل سے پہلے ہی اس کا منسوخ ہو جانا حاکم کی شان کے خلاف ہے، پھر اگر یہ حکم ایک اچھے کام کے لئے تھا تو فوراً ہی ایک اچھے کام سے روک دینا کیا معنی رکھتا ہے اور اگر پہلے اس کام کو اچھا سمجھا پھر برا سمجھ کر روک دیا تو اس سے جہل لازم آتا ہے جو محال ہے۔ اور اگر یہ خدا کا حکم ہوتا تو ابراہیم بیٹے سے مشورہ لئے بغیر اس پر عمل کرتے [illegible] نتیجہ یہ ہے کہ ذبح کرنا خدا کا حکم تھا ہی نہیں۔ (تفسیر سورۂ صٰفّٰت الرازی) لہ

**تفسیر الآیہ** حقیقت یہ ہے کہ دوسرے خوابوں کی طرح یہ ایک تعبیر طلب خواب تھا، جسکو ابراہیم نے ظاہر پر قیاس کر لیا، یہ ایک لغزش تھی جو شرابِ عشقِ الٰہی کے سرمستوں کو تری سے اٹھا کر [illegible] پر پہنچا دیتی ہے۔

وللہ در من قال ع

تو و قطع منازلہا، من و یک لغزش پائے

یہ وہ لغزش ہے جو محبوب کے پاؤں پر گرا دے۔ یہ وہ لغزش ہے جو حجابات بعد و تکلف کو چاک کر دے لہ

تصرفِ ستمِ عشق بیں کہ تا چند است

پدر بکشتنِ فرزندِ خود رضا مند است (حبیبی)

**قرآن سے تعبیر خواب کی مثالیں** اسی متبرک خاندان کے ایک مبارک بچے کو خواب آتا ہے کہ سورج، چاند اور ستارے اس کو سجدہ کر رہے ہیں، اس کا محترم باپ ظاہر خواب سے ہٹ کر اس کی تعبیر کرتا ہے کہ سورج سے مراد انوار نبوت ہیں۔ چاند کا مقصود منصب حکومت ہے اور ستارے علم تاویل احادیث پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ فرمایا

| | |
|---|---|
| کذالک یجتبیک ربک و یعلمک من تاویل الاحادیث و یتم نعمتہ علیک و علٰی اٰل یعقوب (سورۂ یوسف ۱۰) | (یعقوب نے فرمایا اے یوسف [illegible] ایک نبوت ہے اور تجھے تاویل احادیث کا علم دے گا |

اور تجھ پر اور آل یعقوب پر اتمام نعمت کریگا یہ منصب حکومت ہے۔

اسی طرح یوسف کے رفقائے قید کے خواب، کہ ایک شراب نچوڑ رہا تھا اور دوسرے کے سر پر روٹیاں [illegible] کھا رہے تھے، محتاج تاویل تھے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:-

| | |
|---|---|
| احدکما فیسقی ربہ خمرا و اما الاٰخر فیصلب فتاکل الطیر من راسہ (سورۂ یوسف ۵۰) | تم میں سے ایک اپنے بادشاہ کو شراب پلائے گا اور دوسرا سولی پر چڑھایا جائے گا اور اسکے سر کو پرندے نوچیں گے |

---

لہ خازن اور مدارک میں بھی "مانومت" متوہم وارد کیا گیا ہے اور اس کا مقصد حضرت [illegible] [illegible]

[illegible] ص ۲۳۰۲۳

Marfat.com

ایسے ہی ملک مصر کا خواب جس میں سات موٹی گائیں اور سات دُبلی اور سات ہری بالیں اور سات خشک دکھائی گئی تھیں، اور اس سے مراد یہ لی گئی کہ سات سال اناج کثرت سے ہوگا اور اس کے بعد سات سال سخت قحط پڑے گا۔

ٹھیک اسی طرح کا خواب تھا جو حضرت ابراہیم کو دکھایا گیا تھا جس کی تعبیر یہ تھی کہ باپ بیٹے سے اپنی دنیوی منقطع کر رہا ہے (انی اذبحک) اور اُس کو خدا کے دین کی عظیم خدمت کے لئے وقف کر رہا ہے جہاں قدم قدم پر قربانی پڑتی ہے (بذبح عظیم) چنانچہ آنیوالے واقعات نے اسکی تصدیق کردی، مفسر اسرار حضرت خواجہ احمد الدینؒ لکھتے ہیں :-

"ممکن ہے کہ اس غلط فہمی کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے خواب کی تعبیر کے معلوم کرنے میں بھی غلطی کھائی ہو۔ اُنھوں نے اپنے خواب کو ظاہری الفاظ کے مطابق پورا کرنا چاہا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اُنکو اس کے ضرر سے بچا لیا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سخت غلطیوں سے اپنے بندوں کو جب مناسب سمجھتا ہے بچا لیتا ہے۔ انا کذالک نجزی المحسنین ۳۳

جب کوئی نیک آدمی اپنے خواب میں دیکھتا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں تو اگر وہ اپنے نیک بیٹے کو ذبح کردے تو اس سے اُس بیٹے کی زندگی ختم ہو جائے گی اور اُسکی حیات طیبہ کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہیگا۔ انسان کی قربانی کے خواب کی یہ تعبیر لینا کہ اُسے بلا وجہ قتل ہی کر دیا جائے قطعاً غلط ہے۔ نیک انسان کو جسے با اخلاق بنانا ضروری ہوتا خدا تعالیٰ اپنے وحی سے کبھی بچہ کُشی کا حکم نہیں دے گا۔ اگر کسی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنے نیک بچے کے ذبح کرنے کا خواب دکھلایا جائے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اُسے خدا تعالیٰ کی رضامندی کے کاموں پر لگایا جائے اور اُسے خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں بیچ دیا جائے۔ وہ بچہ خدا تعالیٰ کی راہ میں ہمیشہ قربان ہوتا رہے۔ یہ ایک ایسی قربانی ہے جس سے وہ بچہ خود بھی ترقی کرتا رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی مفید بنتا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کی یہی تعبیر تھی۔ خواب کو ظاہری الفاظ کے مطابق پورا کرنا صحیح نہ تھا۔ مگر نیک نیتی کے سبب سے حضرت ابراہیمؑ اور اُن کا بیٹا خواب کو ظاہری الفاظ کے مطابق سچا کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ خدا تعالیٰ نے اُن کو ایسی غلطی کے ضرر سے بچا لیا اور فرمایا کہ تو نے تو خواب کو اس کی تعبیر دریافت کرنے کے بغیر ہی سچا کر دیا۔ یعنی سکھایا کہ ظاہر خواب پر نہیں بلکہ اس کی اصل تعبیر پر عمل کرنا چاہئے تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اصل تعبیر کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کو مضر قتل سے بچا کر ذبح عظیم یعنی بڑی قربانی بنایا۔ وہ ہر وقت قربانی بنے رہے۔ یہی اصل قربانی ہے۔ کسی اونٹ یا مینڈھے کو ذبح کرنا ذبح عظیم نہیں ہے اس واقعہ کا جانوروں کے ذبح کرنے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر نقشہ گووں نے اسے اسی رنگ میں لیا ہے اسی بنا پر حج میں نسل حیوانات کی خوب تباہی ہو رہی ہے۔" (تعبیر بیان للناس منزل اوّل ص ۲۲۹)

اس سے ثابت ہوا کہ ہماری مروجہ رسم قربانی کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہم محض اپنی امانی (چاؤ) کو بنانے کے لئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر دینے کے عادی ہو چکے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید قربانی

کیا ارشاد فرماتا ہے، ہمارا دعویٰ ہے اور کامل وثوق و یقین کے ساتھ دعویٰ ہے کہ جس طرح قرآن مجید نے تمام سابق رسوم و اطوار کو اعتدال و اصلاح سے نتیجہ بخش صورت میں پیش کیا اسی طرح قربانی کو بھی وہم و اسراف کی پستیوں سے نکالکر روحانی، عقلی اور اقتصادی فوائد سے معمور کر دیا۔

ہمارے تیرہ صدیوں کے مقلدانہ لٹریچر میں غور کرنے والوں کو تحقیق کے جواہرات بھی ملتے ہیں، خود موئیدین قربانی کی کتابیں ایسے سوادسے خالی نہیں جو مروجہ رسم کے منافی ہے۔

آپ اوپر مطالعہ کر چکے ہیں کہ اقوام عالم میں قربانی دیوتاؤں کے نام پر ہوتی تھی۔ ایسا ہی عرب کرتے تھے بلکہ نماز بھی بتوں کے لئے ادا کرتے تھے۔

| | |
|---|---|
| ان القوم یصلون وینحرون للاوثان۔<br>(تفسیر الکوثر للرازی) | لوگ بتوں کے لئے نماز پڑھتے اور قربانی کرتے تھے۔ |
| انھم کانوا فی حجھم یذبحون لاجل الحج ولاجل الاصنام وقال تعالیٰ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہ لفسق<br>تفسیر رازی الجزالثانی ص۱۶۶ | وہ جانوروں کو حج کے لئے اور بتوں کے لئے ذبح کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام لیا جائے اُس کو نہ کھاؤ۔ وہ یقیناً فسق ہے ــــ ورظاہر ہے کہ فسق انسان کی روحانی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ |

# سورہ حج اور قربانی

اسی عام حقیقت کو سورہ حج میں اعمال حج کی ذیل میں بیان فرمایا ہے:۔

| | |
|---|---|
| یذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر۔ | ہم نے جو پالتو چارپائے اُن کے لئے مہیا کئے ہیں اُن کی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں پھر قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیر کو بھی کھلاؤ۔ |
| ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب لکم فیھا منافع الیٰ اجل مسمی ثم محلھا الی البیت العتیق۔ ولکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فالٰھکم الٰہ واحد فلہ اسلموا | اور جس نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے۔ ان چارپایوں میں ایک مقررہ وقت تک تمہارے لئے طرح طرح کے فائدے ہیں۔ پھر اس خانہ قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے اور دیکھو ہر امت کے |

ے منافع [illegible]

لئے ہم نے عبادت کا طور طریقہ ٹھیرادیا کہ ہمارے دئے ہوئے پالتو چار پائے ذبح کرے تو اللہ کا نام یاد کرے پ
(یاد رکھو تمھارا معبود وہی ایک معبود یگانہ ہے (اور جب اس کے سوا کوئی نہیں تو چاہئے کہ) اسی کے آگے
فرمانبرداری کا سر جھکاؤ۔

والبدن جعلنٰھا لکم من شعآئر اللہ لکم فیھا خیرٌ
فاذکروا اسم اللہ علیھا صوآف فاذا وجبت
جنوبھا فکلوا منھا واطعموا القانع والمعترّ کذٰلک
سخّرنٰھا لکم لعلکم تشکرون۔ لن ینّال اللہ
لحومھا ولا دمآؤھا ولکن ینّالہ التقوی منکم
کذٰلک سخّرھا لکم لتکبّروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم
وبشّر المحسنین ط

اور (دیکھو قربانی کے یہ) اونٹ (جنھیں دور دور سے
کے موقعہ پر لایا جاتا ہے) تو ہم نے اُسے ان چیزوں میں
ٹھہرادیا ہے جو تمھارے لئے اللہ کی (عبادت کی
نشانیوں میں سے ہیں۔ اس میں تمھارے لئے بہتری کی
بات ہے۔ پس چاہئے کہ انھیں قطار در قطار ذبح کر
ہوئے اللہ کا نام یاد کرو، پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں
(یعنی ذبح ہو جائیں) تو اُن کے گوشت میں سے خود بھ
کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمھارے لئے مسخر کر دیا تاکہ (احسا
الٰہی) کے شکر گزار ہو۔ یاد رکھو۔ اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہونچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ
سکتا ہے وہ صرف تمھارا تقویٰ ہے (یعنی تمھارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس طرح تمھارے لئے
کر دیا کہ اس کی رہنمائی پر اس کے شکر گزار رہو۔ اور اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو اور نیک کرداروں
لئے (قبولیت حق کی) خوشخبری ہے۔

**حاشیہ** ضمناً یہ بات بھی واضح کر دی کہ قربانی کی حقیقت کیا ہے۔ آیت ۲۸ اور ۳۶ میں فرمایا تھا کہ
گوشت خود بھی کھاؤ اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ یعنی مقصود اس سے جانوروں کا خون بہانا نہ
جیسا کہ لوگ سمجھتے تھے، بلکہ یہ کہ لوگوں کے لئے غذا کا سامان ہو۔ پھر آیت ۳۷ میں صاف صاف کہدیا کہ اصل
عبادت تمھارے دلوں کا تقویٰ ہے نہ کہ قربانی کا گوشت اور خون۔ بت پرست اقوام میں قربانی کی رسم اسطرح
تھی کہ اُنھوں نے خیال کیا، انسانوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی چڑھاؤں کی ضرورت ہے اور جانوروں کا خو
ان کا غضب و قہر ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے نہ تو خدا تک گوشت کا چڑھاوا پہنچ سکتا ہے نہ وہ خ
بہانے کا شائق ہے۔ اصل شے جو اُس کے حضور مقبول ہو سکتی ہے، دل کی نیکی اور طہارت ہے۔

ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد جلد ۲ صفحہ ۵۱۰

**نتائج نصوص** اگر تاریخ قربانی کے بیان کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو ان آیات مبارکہ کے مطالعہ سے
ذیل اصلاحی حقائق سامنے آتے ہیں :-

Marfat.com

## قربانی قدیم

(۱) غیر اللہ کے نام پر جمع کیا جاتا تھا

(۲) ذبیحہ کو جلا کر یا زمین میں دبا کر یا سمندر میں پھینک کر ضائع کر دیتے تھے۔

(۳) ان رسوم کا منبع یہ تھا کہ دیوتاؤں کو الوہیت میں شریک سمجھا جاتا تھا۔

(۴) جعل و تسخیر میں دیوتاؤں کا ہاتھ تسلیم کیا جاتا تھا۔

(۵) گوشت کے معقول مصرف سے بیخبری تھی اور وہمی و خیالی مصرف ٹھہرائے تھے۔

(۶) جانوروں کو بتوں کے نام سے نشان زدہ کیا جاتا تھا۔

(۷) عازمین حج کو راستوں میں تکلیف دیجاتی تھی ان کے جانور چھین لئے جاتے تھے۔

(۸) گوشت و خون پہنچا کر معبودوں کی رضامندی حاصل کرتے تھے۔

## قرآنی اصلاحات

(۱) اللہ کے نام کی تلقین کی (یذکروا اسم اللہ)

(۲) فوائد و منافع کی طرف متوجہ کیا (لکم فیھا منافع۔ لکم فیھا خیر)

(۳) اکیلے خدا کی فرمانبرداری پر آمادہ کیا (فالھکم الٰہ واحدٌ فلہٗ اسلموا)

(۴) جعل و تسخیر حیوانات کو خدائے واحد سے مختص کیا۔ (جعلنا لکم۔ سخرنھا لکم۔ سخرھا لکم)

(۵) معقول مصرف کی تشریح کی کہ حسب ضرورت خود کھاؤ اور درماندہ و محتاج کو کھلاؤ۔ پس تیسرا کوئی مصرف نہیں (کلوا منھا الخ)

(۶) خدا کے نام نشان زدہ کرنا سکھلایا (البدن والقلائد من شعائر اللہ)[۵]

(۷) نذرانے کے جانوروں کو مشترکہ فوائد کی چیز بتا کر ان کی قدردانی سکھلائی اور امن و سلام کی ترغیب دلائی (من یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب)

(۸) گوشت و خون کو نارسا بتا کر رسائی تقویٰ کو واضح کیا (لن ینال اللہ الخ)

اور اس سارے بیان کا مقصود یہ بتایا کہ تم دیوتاؤں کی تکبیر و تعظیم کرتے تھے۔ اعمال قربانی اور عقائد تعبد میں ہدایت سے بہت دور ہو چکے تھے، پس تمام صفات خلق و تسخیر کے مالک خدا کی تکبیر (بڑائی) بیان کرو جس نے تمہیں یہ ہدایات سکھائیں اور خوشخبری ہے معقول طور پر نیکی کرنے والوں کے لئے لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم وبشر المحسنین۔

## اشارات

اس کے علاوہ آیات مندرجہ بالا سے کئی ایک فوائد حاصل ہوئے۔

(۱) تعظیم شعائر اللہ۔ اللہ کے نام کی چیزوں یعنی ہسپتالوں۔ یتیم خانوں۔ مسجدوں اور صدقات وغیرہ جن میں قربانی کے جانور بھی شامل ہیں، ان کا احترام کرنا اور ان کے مفید بنانے میں مدد دینا دل کے تقویٰ کی علامت ہے،

---

[۵] قیل لانھا تشعر ھوان یطعن بحدیدۃ فی سنامھا فیعلم بذلک انھا ھدی۔ خازن جزء ثالث ص۳۰۹

اور امن عامہ کے لئے ضروری ہے۔

(۲) لکم فیھا منافع الخ قربانی کے جانوروں سے فوائد حاصل کرنا، ان پر بوجھ لاد کر غربا کی پرورش کے لئے خان[...]
میں پہنچانا، اُن پر سوار ہونا (علیٰ کل ضامر) جائز ہے۔ مسلم، ابوداؤد، اور نسائی کی بعض احادیث اور تفاسیر قدیم بھی [...]
مطلب کی موید ہیں۔

(۳) قربانی کا محل صرف جوار کعبہ ہے محلھا الی البیت العتیق نہ ہر شہر و قریہ۔ حدیث میں اسکی تصدیق ہو[...]

عن مالک انہ بلغہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بمنیٰ ھذا المنحر وکل منیٰ منحر
قال فی العمرۃ ھذا المنحر یعنی المروۃ وکل من فجاج مکۃ وطرقھا منحر حضورؐ نے فرمایا کہ منیٰ ذبح کرنے کی جگہ [...]
اور مروہ اور مکہ کا ہر کوچہ اور ہر رستہ ذبح کرنے کی جگہ ہے (تلخیص الصحاح جلد۲ صـ ۱۲۷)

عن نافع ابن عمرؓ قال من نذر بدنۃ فانہ یقلد ھا بنعلین ولیشعر ھا ثم ینحر ھا عند البی[ت]
او بمنیٰ یوم النحر لیس لھا محل دون ذلک الخ جو شخص اونٹ کی قربانی کی نذر مانے تو اُس کے گلے میں جوتو[ں کا]
ہار ڈال دے، اور اُس کے کوہان میں نشان کر دے پھر کعبہ کے پاس یا منیٰ میں اس کی قربانی کرے، اس کے سوا [...]
قربانی کا کوئی مقام نہیں الخ (۷)

اس مطلب کی مزید تصدیق آئندہ صفحات میں بھی ملے گی۔

(۴) لن ینال اللہ الخ یہود قربانیوں کے خون کو بیت المقدس کے خاص خاص مقامات پر چھڑکتے تھے [...]
گوشت کو جلاتے تھے کہ اسطرح وہ خدا کو پہنچ جاتا ہے مکہ کے مشرک بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ مکہ وادی غیر ذی [...]
(ناقابل زراعت) میں تھا۔ یہ نہایت ہی مناسب تھا کہ جو لوگ وہاں مشورہ کرنے اور اپنے حقوق حاصل کرنے [...]
(کیونکہ حج کا یہی مقصد ہے) ان میں سے دولتمند اپنے ساتھ جانور لے جائیں تاکہ وہ انھیں ذبح کرکے خود بھی ک[...]
اور غربا کو بھی کھلائیں خواہ مخواہ ذبح کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ مقصود تقویٰ ہے والتقوی۔ جعل النفس فی و[...]
مما یخاف .... وصار التقوی فی تعارف الشرع حفظ النفس عما یوثم (راغب) تقویٰ نفس کو خطر[...]
بچانے کا نام ہے .... اور زبان شرع میں گناہ سے پرہیز کرنے کو تقویٰ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اہل تقویٰ کے [...]
میں ذبح مواشی کو کہیں لازم نہیں کیا گیا۔ اہل تقویٰ وہ ہیں جو سچ بولتے ہیں۔ سچ کی تصدیق کرتے ہیں (پ۲) احسان او[ر]
نیکی پر عامل رہتے ہیں (الذاریات) ربانی ہدایت والے ہیں، فلاح پانے والے ہیں۔

(۵) کلوا منھا واطعموا الخ تمام حاضرین وشاملین کے لئے قربانی ضروری نہیں ورنہ اطعموا [...]
کو کھلاؤ کا ارشاد بیکار رہا جاتا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں — فاذا رمی جمرۃ العقبۃ ذبح الھدیٰ ان کان مع[ہ]
ھدی وذلک سنۃ لو ترکہ لا شئ علیہ اگر قربانی کا جانور ساتھ ہو تو رمی کے بعد قربانی کرے، یہ سنت ہے اگ[ر]

Marfat.com

اس کو ترک کردے تو قطعاً حرج نہیں (تفسیر کبیر جز ثانی صـ۱۷۳)

بلکہ ایک حدیث میں یہاں تک ہے کہ جو شخص ذی الحجہ کے ابتدائی ۹ دن ناخن نہ اُتروائے قربانی کے ثواب کا حقدار ہو جاتا ہے (اخبار اہلحدیث امرتسر ۱۲)

اسی سورہ مبارکہ الحج میں ایک اور آیت ہے جس سے بعض لوگ مروجہ قربانی نکالتے ہیں۔ اس کو بھی دیکھ لیں، ارشاد ہے۔

لکل امۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ فلا ینازعنك فی الامر

ہم نے ہر گروہ کے لئے منسک مقرر کر دیا ہے۔ وہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ پس لوگ تجھ سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں۔

اس آیہ کریمہ میں منسك اور امر کے معنی کی تعیین میں اختلاف ہے۔ جن اصحاب نے ان دو لفظوں سے طریقہ قربانی اور قربانی مراد لی ہے اُنھوں نے نظم قرآن کے اسرار پر توجہ نہیں کی اور ایک "ٹکڑے" کو سیاق و سباق سے بالکل الگ کر کے حسب خواہش معنی نکال لئے ہیں۔ اوپر کی آیات رد شرک، اثبات توحید اور صفات کاملہ آیہ پر روشنی ڈال رہی ہیں۔

"الم تر ان اللہ الخ زمین و آسمان کی تسخیر اور کشتیوں کا بحر میں رواں ہونا اس کے امر سے وابستہ ہے آسمان کا تھامے رکھنا، اجرام سماوی سے زمین کی حفاظت اور تصادم کرانے سے بچاؤ اس کے اذن سے ہے۔ وہ پاک ذات لوگوں کے لئے یکسر رافت و رحمت ہے، وہی منبع حیات ہے، وہی موت اور حیات اخروی پر قادر ہے۔ انسان ان انعاموں اور قدرتوں سے روگردانی کر رہا ہے ناسپاس بنتا ہے۔ قبول حق میں تاخیر کرتا ہے۔ جس طرح نظام فطرت خدا کی ساخت ہے اسی طرح نظام شریعت بھی اسی کی طرف سے ہے۔ لکل امۃ جعلنا منسکاً الخ پس امر مقصود، حق ثابت یعنی دین اسلام کے متعلق نزاع قطعاً لغو ہے (آیات مابعد) اے پیغمبر اپنے رب کی طرف دعوت دے تو بے شبہ اعتدال و استقامت کی راہ پر ہے اور اگر لوگ جدال سے باز نہ آئیں تو کہہ دے کہ اللہ تمھارے اعمال سے واقف ہے وہ قیامت کے دن تمھارے اختلافات کا فیصلہ کرے گا۔ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز سے واقف ہے الخ"

کیا اس سلسلہ بیان میں قربانی اور طریقہ قربانی کی کہیں گنجائش نکلتی ہے؟ یہی معنی جو ہم نے بیان کئے اکثر قدیم و جدید مترجمین و مفسرین نے اختیار کئے ہیں۔ قاضی بیضاوی۔ شاہ ولی اللہ۔ شاہ عبدالقادر۔ شاہ رفیع الدین فتح محمد جالندھری۔ محمد علی ایم۔ اے۔ تفسیر قادری۔ تفسیر عبدالحکیم۔ وحید الزماں۔ طنطاوی وغیرہم نے دیئے ہیں۔ امام رازی بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں:۔

اذا وقع الاسم علی کل عبادۃ فلا وجہ للتخصیص (تفسیر کبیر جز ۶ صـ۶۱)

منسک کا لفظ جب عبادت پر حاوی ہے تو اس کو قربانی کے ساتھ خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں

نواب صدیق حسن خاں کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

Marfat.com

"بعض نے منسک سے ذبائح مراد لئے ہیں مگر تخصیص کی کوئی وجہ نہیں اور خصوص سبب کا اعتبار نہیں ہوا کرتا عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے" (ترجمان القرآن ج ۱۰ صفحہ ۹۴)

ابن عباس اس سے شریعت و وعید مراد لیتے ہیں (خازن جز ثالث صفحہ ۲۱٦)

اخیر میں آیہ ما نحن فیہا کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق سن لیجئے:۔

("اے پیغمبر!) ہم نے ہر اُمت کے (عبادت کا) ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے پس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریقہ میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستے پر گامزن ہے!

حاشیہ:۔ آیت (٦٧) میں اس اصل عظیم کیطرف اشارہ کیا ہے کہ اصل دین ایک ہے البتہ "مناسک" میں یعنی عبادت کے طور طریقہ میں اختلاف ہوا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ جس کی جیسی حالت تھی اس کے مطابق ایک طور طریقہ اسے دیدیا گیا، پس طالب حق کو چاہئے کہ سب سے پہلے اصل کو دیکھے نہ یہ کہ فرع کے پیچھے پڑ جائے۔ فرمایا فلا ینازعنك فی الامر اس بارے میں تم سے نزاع کرنے کا لوگوں کو حق نہیں۔ جس بات پر اُنھیں غور کرنا چاہئے وہ تو یہ ہے کہ اصل دعوت کیا ہے؟ وادع الی ربك۔ انك لعلی ھدی مستقیم اصل دین دعوت الی اللہ ہے۔ اور یہی ہے جو ہدایت کی سیدھی راہ ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۱٦)

# سورہ بقرہ اور قربانی

ارشاد ہے:۔

واتموا الحج والعمرة للہ ط فان احصرتم فما استیسر من الھدی ولا تحلقوا رءوسکم حتی یبلغ الھدی محلہ، فمن کان منکم مریضاً او بہٖ اذی من راسہٖ ففدیۃٌ من صیام او صدقۃٍ او نسك فاذآ امنتم فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام فی الحج وسبعۃٍ اذا رجعتم

اور حج عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جا نذرانہ میسر ہو (ادا کر دو) اور اپنے سروں کو نہ منڈا کہ نذرانہ اپنے ٹھکانے (حرم محترم میں) پہنچ جا کوئی تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقہ سے یا کسی ا سے دے، پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص عمرہ کا فائدہ اُٹھائے تو جو نذرانہ آسانی سے کر دے اور جو نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھے حج میں، اور سات جب تم لوٹ کر آؤ۔

ان آیات میں سرے سے کوئی لفظ ہی ایسا نہیں جو ذبح جانور کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ ھدی

سے قربانی مراد لی گئی ہے، جو حقیقت لغوی کے سراسر خلاف اور عالمگیر قرآن کو عرب کے جغرافیائی ماحول میں جکڑ دینے کے مترادف ہے۔

**ھدیٰ** اہل لغت کے نزدیک بالاتفاق "ھدیٰ" ھدیہ کی جمع ہے جس کے معنی تحفہ ہیں جیسا کہ خود قرآن میں موجود ہے بل انتم بھدیتکم تفرحون^٢^ (النمل)

امام رازی لکھتے ہیں :-

معنی الھدی ما یھدی الی بیت اللہ عزوجل تقربا الیہ بمنزلۃ یھدیھا الانسان الی غیرہ تقربا الیہ

ھدیٰ کے معنی ہیں وہ چیز جو اللہ عزوجل کے گھر [illegible] پہنچائی جائے بطور اس تحفہ کے جس کو انسان کسی کی طرف بغرض تقرب بھیجتا ہے۔

ھدیا بالغ الکعبۃ ^٣^ کے مقام پر یہی معنی شاہ عبدالقادرؒ نے اختیار کئے ہیں۔

**نسک** اسی طرح "نسک" کا حقیقی مفہوم "عبادت" ہے جو دوسری آیات کے تحت عام تفاسیر و تراجم میں پایا جاتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں :-

اصل النسک العبادۃ قال ابن الاعرابی النسک سبائک الفضۃ کل سبیکہ منھا نسیکۃ ثم قیل للمتعبد ناسک لانہ خلص نفسہ من دنس الآثام وصفاھا کالسبیکۃ المخلصۃ من الخبث ھذا اصل معنی النسک ثم قیل للذبیحۃ نسک لانھا من اشرف العبادات التی یتقرب بھا الی اللہ (حلد ۵۹)

نسک کی اصل عبادت ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ نسک چاندی کے خالص کئے ہوئے ٹکڑے ہیں اور ہر ٹکڑہ نسیکہ کہلاتا ہے۔ پھر عبادت گزار کو ناسک کہا گیا کیونکہ وہ اپنے نفس کو چاندی کے خالص [illegible] گناہوں کے میل سے صاف کرتا ہے [illegible] ہے۔ پھر ذبیحہ کو نسک کہا جانے [illegible] قریب کرنے والی عبادتوں میں اشرف ^٤^ ہے۔

مروجہ معنوں کے ساتھ اسی کے قریب قریب عام لغت نویسوں امام راغب، امام بیہقی، صاحب تاج العروس، صاحب منتخب، منتہی الارب اور تسہیل العربیہ وغیرہ نے لکھا ہے ۔۔۔ ھدیٰ اور نسک کی اس تشریح سے ثابت ہوا کہ یہ دونوں لفظ قربانی سے عام تر ہیں۔ ھدیٰ ہر تحفے کو کہتے ہیں جس میں گائے، اونٹ، بکری وغیرہ بھی شامل ہیں اور نسک ہر عبادت کو کہتے ہیں جس میں گوشت وغیرہ پکا کر غریبوں کو کھلانا بھی داخل ہے۔

---

٢ اے اہل سبا، تم اپنے تحفے پر اتراتے ہو۔

٣ یہ امام صاحب کی ذاتی اعتقادی [illegible] کی [illegible] نہیں۔ [illegible] (الایہ) [illegible]

٤ تفسیر طنطاوی میں ہے۔ منسکا۔ متعبدا، اعلم انہ ما من امۃ خلت الا ولھا اماکن للعبادۃ [illegible] منسکا ای شریعۃ خاصۃ .... ھم ناسکوہ صفۃ لمنسکا موکدۃ (ابوالسعود)

"اسرار حج" کے مصنف مولانا عبدالوہاب صاحب دہلوی ثم مکّی نے ۱۲ مناسک حج بتائے ہیں جن میں بارھوا
منسک قربانی ہے جو صرف قارن اور متمتع کے لئے لازم ہے۔ ہر حاجی کے لئے نہیں ص۱۰
"قارن اور متمتع پر ھدیٰ لازم ہے" مسائل حج مولانا امیر احمد اللہ صاحب ص۲۰

**ایک سوال**

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ عام مفسرین نے آیات حج میں ہدیٰ و نسک کے معنی قربانی کے
ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ تاریخ عرب کے طالب علم سے یہ وجہ پوشیدہ نہیں ر
سکتی کہ عام عرب بالخصوص حجاز کے ناقابل زراعت علاقہ کے باشندوں کا سرمایہ عام طور پر بہیمۃ الانعام (مواشی) ہی ہو
تھے اُن کی دولت و جائداد کا اندازہ اُن کی بھیڑ، بکری اور اونٹوں سے کیا جاتا تھا۔ بیضاوی وغیرہ میں ہے البدن ال
هی خیار اموال العرب قربانی کے اونٹ عرب کا بہترین مال ہے ص۲۰۵ طبع مصر ۱۳۴۴ھ اُن کے باہمی لین دین ا
قرض وغیرہ میں بھی یہی جانور مستعمل تھے۔ نکاح کے موقع پر مہر میں روپیوں اور اشرفیوں کے بجائے اونٹ اور دیگر جا
مقرر کئے جاتے تھے۔ انعام و تحائف میں بھی بار بار انھیں کا ذکر آتا ہے[1]۔

**لطیفہ**

مشہور ہے کہ کسی شخص نے ایک اعرابی سے پوچھا تم کیا کھاتے ہو؟ اُس نے کہا اونٹ۔ کیا پیتے ہو؟
اونٹ۔ کیا پہنتے ہو؟ اونٹ۔ کیا جلاتے ہو؟ اونٹ۔ کیا بچھاتے ہو؟ اونٹ۔ تمھارا مسکن کیا
اونٹ۔ تمھارا مرکب کیا ہے؟ اونٹ۔ الغرض اس کے پاس ہر سوال کا جواب "اونٹ" تھا۔ سائل نے حیران ہوکر
کی تشریح پوچھی۔ اعرابی نے کہا سُن لو۔ اونٹ کا گوشت ہماری مرغوب غذا ہے۔ اونٹ کا دودھ ہمارا محبوب مشروب
اُس کی پشم ہمارا اوڑھنا بچھونا۔ اُس کی مینگنیاں ہمارے چولھوں کی رونق۔ اُس کی کھال ہمارا خیمہ، اُس
پشت ہماری سواری[2] وغیرہ۔

اس مقصد کی تائید کے لئے اگر قرآن مجید کی ان آیات کو شامل کر لیا جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے
مخالفین (عرب) پر اپنے احسان ظاہر فرمائے ہیں اور اُنکو اپنی قدرت کے نشانات کی طرف متوجہ کیا ہے، جہاں جا بج
جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا دودھ۔ گوشت۔ باربرداری صبح کو نکلنا اور شام کو گھر واپس آنا اور اُن سے بہت سے فو
حاصل کرنا وغیرہ تو یہ مضمون بہت زیادہ طویل ہو جائے گا۔

الغرض ایسے ماحول میں جبکہ اُن کے پاس ہدیہ و تحفہ اور صدقہ و عبادت کے لئے بہترین شے یہی جانور تھے
ہدیٰ و نسک کا لفظ قربانی کے جانوروں پر مستعمل ہونے لگا ہو تو کوئی محل تعجب نہیں۔ لیکن اس سے ہم کو یہ حق نہ
پہنچتا کہ ہم اُس ماحول میں محدود ہو کر ان وسیع المعنی الفاظ کے استعمال کی الٰہی حکمت کو ہمیشہ کے لئے کھو دیں۔

---

[1] اسکی تفصیل "رسوم جاہلیت"۔ "صناجۃ الطرب" دواوین عرب وغیرہ کتب میں ملے گی۔

[2] افلا ینظرون الی الابل کیف خُلقت۔

اللہ تعالیٰ کو ایسے لفظ کے آنے سے کونسا امر مانع ہو سکتا تھا جو صرف ذبح کے لئے مختص تھے جبکہ ان الفاظ کی زبان عرب میں کمی نہیں، مثلاً عتر، فرع، جزر، عقر، الحیم، ذبائح، وذائم، ضحایا وغیرہ جن میں بعض کثرت استعمال سے بعض خصائص کے حامل بھی ہو چکے تھے اس کی تفصیل اشعار عرب میں ملتی ہے۔

**لو فرضنا** ہم اپنے حامیان قربانی کی خاطر سے تھوڑے وقت کے لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہاں ایک ہی مقام پر ھدی ونسائک کے معنی صرف قربانی ہیں اور ان دو لفظوں کے علیحدہ علیحدہ استعمال میں کوئی حکمت نہیں۔ لیکن پھر بھی حتی یبلغ الھدی محلہ اور سورہ حج کی آیت ثم محلھا الی البیت العتیق اور آیہ والھدی معکوفا أن یبلغ محلہ[1] مروجہ عالمگیر رسم قربانی کے سراسر منافی ہیں۔ کیونکہ ان تینوں آیتوں سے قطعاً یہ لازم آتا ہے کہ قربانی کا محل صرف مکہ معظمہ ہے اور کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ اس کا بیان پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور بات بھی سن لیجئے کہ خود قربانی کی حمایت کرنے والے مفسرین و مترجمین کو اس مقام پر تسلیم کرنا پڑا کہ

"حج اور عمرے میں قربانی ضرور نہیں مگر کسی سبب سے۔ یہاں حق تعالیٰ نے تین سبب بیان فرمائے۔ ایک یہ کہ احرام کر کر شخص روکا گیا مرض سے یا دشمن سے تو کسی کے ہاتھ قربانی بھیجدیوے جب گنے میں قربانی ذبح ہو تب یہ احرام سے نکلے پہلے حجامت نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ آزار سے یا سر کے بالوں سے عاجز ہو کر احرام میں حجامت کرے تو اس کا بدلہ یا قربانی پہنچاوے یا تین روزے یا چھ محتاجوں کو کھلاوے۔ تیسرے یہ کہ حج اور عمرہ جدا جدا نہ کرے ایک ہی سفر میں دونوں ادا کرے تو قربانی ضرور ہے۔ پھر قربانی پیدا نہ ہو تو دس روزے تین حج کے دنوں میں اور سات پیچھے اور قربانی کم سے کم ایک بکری ایک شخص کو اور ایک گائے یا اونٹ سات شخص کو اور حج اور عمرہ ملنے سے جو قربانی کی ہو سکتے کے ساکنوں پر نہیں" (موضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی)

یہ وہ بیان ہے جس کی تحقیق کیلئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ عام مسلمانوں کے

---

[1] قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی بھی اس آیت سے استناد کرتے ہیں۔ دلیل واضح... علی ان محلہ الحرم لا غیرہ یعنی یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ قربانی کا محل مکہ کے سوا کوئی جگہ نہیں (تفسیر مظہری) اس کے آگے ایک حدیث لکھ کر یہ لکھتے ہیں ھذا الحدیث یقتضی ان النحر خارج الحرم لا یجوز یعنی اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ حرم سے باہر قربانی جائز نہیں۔ امام رازی لکھتے ہیں۔ قالوا الھدی سمی ھدیا لانہ جار مجری الھدیۃ التی یبعثھا العبد الی ربہ والھدیۃ لا تکون ھدیۃ الا اذا بعثھا المھدی الی المھدی الیہ وھذا المعنی لا یتصور الا بجعل موضع الھدی ھو الحرم۔ یعنی ھدی کو ہدیہ کا قائم مقام ہونے کی وجہ سے ھدی کہتے ہیں جو بندہ اپنے رب کے حضور پیش کرتا ہے اور ہدیہ جب ہی ہدیہ کہلا سکتا ہے کہ جسکے حضور لازماً ہے اسکے آستانہ پر بھیجا جائے اور یہ معنی متصور نہیں ہو سکتے جبتک کہ حرم کو مقام ھدی (قربانی) نہ بنایا جائے۔

[1] محلہ: الحنفیۃ علی ان محلہ الحرم ... [illegible]

گھروں میں موجود ہے، سورہ بقرہ پارہ دو رکوع ۸ میں آیات حج کے حاشیہ کو دیکھ لیں حقیقت واضح ہوجائے گی ـــــ نیز شاہ صاحب کے یہی الفاظ نواب صدیق حسن خاں نے اپنی تفسیر میں نقل کرئے ہیں جلد ۲ ص۲۵۸ نیز ارکان حج وعمرہ کی تفصیل میں قربانی کا ذکر تک نہیں کیا فرماتے ہیں :۔

"ارکان حج کے پانچ ہیں۔ایک احرام، دوسرے کھڑے ہونا عرفے میں، تیسرے طواف، چوتھے سعی، پانچویں سر کا بال منڈانا کترانا۔ ارکان عمرے کے چار ہیں۔ احرام، طواف، سعی، حلق یا تقصیر جب یہ ارکان کرلئے حج وعمرہ تمام ہوگیا (جلد ۲ ص۲۵)

اس سے صاف ثابت ہوا کہ تمام دنیا میں تو کجا خود حج میں بھی قربانی ہر ہر شخص کے لئے وجوب کا درجہ نہیں رکھتی اور جن پر واجب ہے اُن کے لئے بھی صریح گنجائش موجود ہے۔ سر منڈوانا پڑے تو روزہ رکھ لے (۲) یا صدقہ دے (۳) یا نسک (بفرض معنی ذبیحہ) کرے۔ یہاں تیسرا درجہ قربانی کا ہے۔حج وعمرہ ملا کر کرنے والوں کو جو ہدی میسر ہو اور اگر کچھ بھی میسر نہ ہو تو دس روزے رکھ لے۔ حلق راس اور تمتع حج وعمرہ کی صورت میں قربانی یا ہدی ونسک کا بدل صوم وصدقہ بتا دیا۔ ارادہ حج کے بعد رُک جانے کی حالت میں "ما استیسر" کہہ کر میسر ہونے کی شرط لگادی عدم میسر کے وقت یہ قید بھی اُٹھ گئی ـــــ غور کا مقام ہے کہ افادہ ومعقولیت اور سہولیت وتیسر کا کتنا اہتمام کیا گیا ہے کیا ہم اس سے فائدہ نہ اُٹھا کر صریح ناسپاسی وناشکری کے مجرم نہیں بن رہے۔

جس طرح سورۂ حج میں ذکر حج وقربانی کے بعد گوشت اور خون کی نارسائی اور تقویٰ کی رسائی کا ذکر کیا ہے اسی التزام سے سورہ بقرہ میں بھی مناسک حج کے بعد اس حقیقت کو آشکار کردیا ہے کہ جو شخص کھیتی اور نسل کو ضائع کرتا ہے وہ مفسد ہے۔ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔حیث قال ...... ویھلک الحرث والنسل واللہ لایحب الفساد ہمیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ کیا ہم ہر سال اطراف عالم میں کروڑوں جانوروں کو بے ضرورت کاٹ کر ضائع نہیں کرتے اور بالخصوص مکہ معظمہ میں لاکھوں جانداروں کو کاٹ کاٹ کر گڑھوں میں نہیں پھینکتے ؟ کیا اہلاک نسل نہیں ہے ؟ کیا ہم قرآن مجید کے مذکورہ الصدر فتویٰ کے مستوجب نہیں ؟ کیا ہم واللہ لایحب الفساد کے اٹل قانون کے ماتحت خدا کی نگاہ محبت سے محروم نہیں ہوچکے ؟

---

ك سنا جاتا ہے کہ ہر حاجی لازماً دو بکروں کی قربانی کرتا ہے۔ ایک کو ھدی اور دوسرے کو دم کہتے ہیں جو نادانستہ کسی کیڑے مکوڑے جوں وغیرہ کے مارے جانے کا فدیہ سمجھا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ حالت احرام میں کہیں خارش وغیرہ سے خون نکل آئے یا سر ڈاڑھی وغیرہ سے کوئی بال جدا ہوجائے یا کپڑا سر پر آجائے تو اس کا فدیہ الگ قربانی کیصورت میں دینا پڑتا ہے۔ پہلے منا کے قریب گوشت پھینکنے کے گڑھے ہوتے تھے جن سے ہر سال بیماری پھیلتی تھی۔ اب آبادی سے دور مشعر الحرام کے نواح میں لمبے لمبے گڑھے کھدوائے گئے ہیں۔ پولیس اور محکمہ حفظان صحت کی نگرانی میں عمل ذبح کیا جاتا ہے کسی شخص کو اجازت نہیں کہ آبادی میں جانور ذبح کرے وہاں ذبح کے بعد کھال اُتار لی جاتی ہے اور گوشت (گڑھے) میں پھینک دیا جاتا ہے اور حسب ضرورت بدو بھی لے جاتے ہیں۔

Marfat.com

اے جماعت علماء! اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ کیا تم میں ایک بھی نہیں جو جرأت سے اس قرآنی حقیقت کا اظہار کرے؟ افسوس

سے کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت      وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو (اقبال)

# سُورۃ الکوثر اور قربانی

حامیان قربانی کے پاس آخری دستاویز سورۃ الکوثر کی آیت ذیل ہے۔ فصل لربک وانحر۔ پس اپنے رب کے نماز پڑھ اور نحر کر۔ یہاں نحر کا لفظ متنازع فیہ ہے۔ ائمہ لغت وتفسیر اس میں بھی حسب سابق یک زبان نہیں۔ بقول رازی مفسرین اس سے ذبح شتر مراد لیتے ہیں (قول عامۃ المفسرین ان المراد هو نحر البدن) مراد کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ مرادی معنی ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں استقبل بنحرك الی القبلہ اپنی گردن قبلہ کے مقابل کر!

ایک اور قول ہے ضع یمینك علی الشمال فی الصلوٰۃ اسکا مطلب ہے کہ نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر رکھ۔

"تاج المصادر میں امام بیہقی نے بھی یہی کہا ہے" دست بر دست نہادن در نماز"

بعضوں نے کہا ہے :۔

وانحر فعل متعلق بالصلوٰۃ اما قبلها او بعدها او فیها ثم ذکر فیها وجوها الخ

نحر ایک فعل ہے جو نماز سے تعلق رکھتا ہے۔ نماز سے پہلے یا بعد یا درمیان۔ پھر مفسرین نے اسکی کئی وجوہ بیان کی ہیں :۔

(۱) فراء نے کہا ہے قبلے کی طرف منہ کر

(۲) عن علی لما نزلت هذه السورۃ قال النبی لجبرئیل ما هذه النحیرۃ التی امرنی بها ربی قال لیست بنحیرۃ ولکن یامرك اذا تحرمت للصلوٰۃ ترفع یدیك اذا کبرت واذا رکعت واذا رفعت راسك من رکوع واذا سجدت الخ

علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو آنحضرت نے جبرئیل سے پوچھا۔ یہ نحیرہ کیا ہے جس کا رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ جبرئیل نے کہا یہ نحیرہ نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ نماز کی پہلی تکبیر، رکوع، بعد رکوع اور سجود کے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں یہ ہماری نماز ہے اور ملائکہ کی نماز ہے جو ساتوں آسمانوں میں رہتے ہیں۔ ہر ایک چیز کی ایک زینت ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے نزدیک رفع یدین[1] کرنا ہے۔

(۳) علی ابن ابی طالب سے روایت ہے کہ نحر کا مطلب نماز میں ہاتھوں کو چھاتی کے اوپر رکھنا ہے اور فرمایا کہ نماز سے پہلے رفع یدین پناہ چاہنے والے کی عادت ہے اور ہاتھوں کو چھاتی کے اوپر رکھنا خشوع وخضوع کی علامت ہے۔

(۴) عطا نے کہا ہے کہ وانحر کے معنی یہ ہیں کہ دو سجدوں کے درمیان اس طرح سیدھا ہو کر بیٹھ کہ تیری چھاتی نمایاں ہو جائے

---

[1] خازن میں بھی ایسے ہی الفاظ موجود ہیں۔

(۵) ضحاک اور سلیمان الیتمی کہتے ہیں کہ دونوں ہاتھ کے کے بعد چھاتی کے اوپر کے حصے تک بلند کرا اور واحدی نے کہا ہے کہ ان سب اقوال کی اصلیت یہ ہے کہ نحر کا مفہوم صدر یعنی سینہ ہے۔

(۶) منتہی الارب میں نحر کے معنی "پیش سینہ و جائے گردن بند" لکھے ہیں۔

(۷) ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ نحر کا مطلب نماز میں محراب کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا ہے، دائیں بائیں دھیان کئے بغیر۔ اور اگر اس کے معنی قربانی ہی کئے جائیں تو بھی مروجہ عمومیت ثابت نہیں.... حنفیہ کہتے ہیں کہ "وانحر" سے آنحضرتؐ پر قربانی واجب ہوئی اور اُمت پر باتباع سنت لازم ٹھہری (فاتبعونی یحببکم اللہ) امام رازی اس کی تردید میں اپنے ہم خیالوں کا قول نقل کرتے ہیں:۔

واصحابنا قالوا الامر بالمتابعة مخصوص بقوله ثلث کتبت علی ولم تکتب علیکم الضحیٰ والاضحیٰ والوتر (تفسیر سورۃ الکوثر للرازی)

حکم اتباع مخصوص ہے جیسا کہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا۔ تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں، تم پر نہیں (۱) ضحیٰ (صلوٰۃ) (۲) اضحیٰ (قربانی) (۳) وتر (صلوٰۃ)

امام راغب کا دلچسپ بیان بھی سن لیجئے:۔

النحر موضع القلادة من الصدر...... وقیل امر بوضع الید علی النحر ـــ وقیل حیث علی قتل النفس بقمع الشهوة

"نحر چھاتی کے اوپر گلوبند کے مقام کو کہتے ہیں" لغوی تحقیق ختم ہوئی۔ اب تفسیری نکات ملاحظہ فرمائیے "کہا گیا ہے کہ وانحر میں امر ہے ہاتھوں کو نحر کے مقام پر رکھنے کا" اور نکتہ آفرینی دیکھئے "اور کہا گیا ہے کہ اس لفظ وانحر سے شہوت کی بیخ کنی کر کے نفس کشی کی ترغیب دلائی ہے"۔

میں یہ جانتا ہوں کہ جن کتب سے میں نے استفادہ کیا ہے، انھیں سے رسم پرست اصحاب بہت کچھ اپنی تائید میں نکال سکیں گے، لیکن افسوس ہے کہ انھیں قرآن اور عقل سے چشم پوشی کرنی پڑے گی۔ دین کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے علم وعقل کے ساتھ صحت فطرت، سلامت ذوق، اور شرم وحیا کی بھی سخت ضرورت ہے تاکہ لغو ومہمل اور مضر ومفسد رسوم کی تائید میں قلم اُٹھاتے ہوئے انسان کا ضمیر ملامت کرے اور شرم دامنگیر ہو کہ ہم اسلام جیسے بے حد معقول مذہب کے نام لیوا ہوتے ہوئے کن نامعقول اور مضر باتوں کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں لہ۔

---

لہ ایسی قربانی اپنے لئے واجب کر کے ہم اپنے اوپر ایک ایسا بوجھ لے رہے ہیں جس سے خدائے تعالیٰ نے ہمیں معاف رکھا ہے۔ مسلمانوں کی مثال ان بنی اسرائیل کی سی ہے جو خود اپنی حماقت سے اپنے اوپر بوجھ ڈالتے تھے اور بعد میں اس سے منحرف بھی ہو جاتے تھے۔ کلام اللہ نے مسلمانوں کو اپنے اوپر ایسا بوجھ ڈالنے یا ڈلوانے سے صریح منع فرمایا ہے۔ اہل کتاب کیطرح مسلمان بھی رفتہ رفتہ ان خودساختہ واجبات کے التزام کر رہے ہیں اور جوں جوں انکی آنکھ کھلتی جاتی ہے وہ ان رسموں سے نادم ہو کر انھیں ترک کر رہے ہیں۔ (اصغر)

Marfat.com

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں برطانیہ کے مشہور فاضل ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی مشہور کتاب ہسٹری آف یورپین مارلس (مترجمہ جناب عبدالماجد دریابادی) کے بعض اقتباسات سے اپنے ناظرین کو روشناس کراؤں جو سیحی غالیان مذہب کے ساتھ ہمارے اجارہ داران فردوس پر بھی کچھ کم چسپاں نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں :۔

"جب ہمارے شارحین مذہب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر منقولات سے معقولات کو دبا دیا ہے جب انھوں نے سینکڑوں ہزاروں سال کی پیہم کوششوں سے نفس بشری میں یہ اعتقاد راسخ جما دیا ہے کہ ایمان بالغیب تحقیق و عقل پرستی سے افضل ہے تو ایسی حالت میں لازمی ہے کہ ہم جبلۃً عقل و راستبازی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور کورانہ تقلید کے خوگر بن جائیں۔ (صفحہ ۹۵) لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سیاسی و فلسفیانہ راستبازی کے نشوونما کا راستہ بالکل صاف رہا ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ علمائے مذہب قدم قدم پر اس کی مخالفت بیجا کرتے رہے اور صدیوں تک اُن کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جہاں کوئی تصنیف اُن کے عقائد کے خلاف نکلی بس اس کو ممنوع الاشاعت قرار دیا اور جب پھر اتنا اقتدار باقی نہ رہا تو یہ کوشش بہر صورت جاری رکھی کہ آزاد خیالی و روشن خیالی کو معصیت قرار دیتے رہے (صفحہ ۱۰۰)

اس سوال کا جواب کہ قدمائے قربانی کے اسرافی پہلو کے خلاف کیوں آواز نہ اُٹھائی اور اس زمانے کے اکثر اہل علم کیوں خاموش ہیں، بھی 'لیکی' کے الفاظ میں سنئے :۔

"قدیم حکماء اپنی آزاد خیالیوں کو پرائیویٹ صحبتوں یا اپنی ان تصانیف تک جو صرف ایک مخصوص [illegible] اشاعت پذیر ہوتی تھیں محدود رکھتے تھے۔ اور بلحاظ عمل مذاہب مروجہ کی دل سے [illegible] عوام کے سامنے ان کی تائید کرتے تھے۔" (صفحہ ۱۳۵)

"[illegible] علانیہ کہتا تھا کہ بہت سے مذہبی حقائق ایسے ہیں جن سے عوام کا لاعلم رہنا ہی [illegible] اکاذیب ہیں جن پر عوام کا اعتقاد رکھنا ہی قرین مصلحت ہے۔ [illegible]"

ایک مسیحی معجزہ کا ذکر کرتا ہے :۔

"ایک شب کو مسیح نے کھانا کھاتے وقت اپنے جسم کو [illegible] [illegible] کردیا جنھوں نے اُسے کھا لیا۔ پھر [illegible] [illegible] مستبعد و محال نہ قرار دیا؟ لیکن [illegible] [illegible] کرتے ہیں۔ اس کا باعث سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اعتقاد تو [illegible] [illegible]"

اس تقلید و توہم کے باوجود مقام مسرت ہے کہ اس غیر قرآنی رسم کی مخالفت [illegible] [illegible]

[illegible]

عصر حاضر کے متعدد فضلاء و مشاہیر نے اس کے خلاف جرأت سے قلم اٹھایا اور [illegible]

Marfat.com

اظہار برأت کیا۔ ہندستان کے مصلح اعظم سرسید احمد خاں کی تحقیق سنئے :۔

"حج میں قربانی کی کوئی مذہبی اصل قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی۔ مکہ ایک بیابان غیر ذی زرع تھا۔ اسقدر لوگوں کے جمع ہونے سے خوراک کا میسر آنا مشکل تھا اسلئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھ لے جاتے تھے جو بُدن اور قلائد کے نام سے مشہور تھے اور جو نہ لے جاتے تھے وہ مکہ میں خریدتے تھے۔ اُن کو ذبح کرکے خود بھی کھاتے تھے اور لوگوں کو بھی کھلاتے تھے۔ حج میں صرف یہی اصل قربانی کی قرآن مجید سے پائی جاتی ہے ..... وہاں پر نہ کوئی دیوتا ہے نہ دیبی ہے نہ پہاڑ پر کوئی چیز ہے جس پر بکرا یا مینڈھا یا اونٹ چڑھایا جاوے نہ خدا کو اُس کی بو خوش آتی ہے نہ اُن کا خون پیتا ہے نہ اُنکی جان لینے سے خوش ہوتا ہے بلکہ وہ تو صرف نیکی اور بھلائی چاہتا ہے۔ جیسے کہ خود اُس نے کہا لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن یناله التقوی منکم پس اس زمانہ میں جو حج کے دنوں میں حاجت سے زیادہ قربانی کی رسم ہے اور لاکھوں جانور ذبح کرکے جنگل میں ڈالتے ہیں جنکو گیدڑ کوّے بھی نہیں کھاتے اس کا کچھ بھی نشان مذہب اسلام میں نہیں ہے۔" (تفسیر القرآن سرسید احمد خاں جلد ا صفحہ ۲۱۲)

لاہوری احمدی جماعت کے قائد خواجہ کمال الدین مرحوم لکھتے ہیں :۔

"اسوقت تو کل کی کل قومیں کفارہ پرست ہوگئیں۔ اور ہمارا بھی یہی حال ہوگیا۔ عمل وہ مصیبت افزا چیز ہے کہ جسکی مثل آجکل کی دنیا نہیں ہوسکتی۔ سب کے سب اسی فکر میں ہیں کہ کسی کا کفارہ یا کسی کی سفارش ہمیں اس بوجھ سے آزاد کردے چنانچہ مسلمانوں نے بھی اپنے صدقات اور قربانیوں کو جن کی غرض وغایت کچھ اور تھی۔ کفارہ کے رنگ میں ہی تسلیم کرلیا۔ عیسائی بھی ہمیں یہی کہتے ہیں کہ تم جو عید الضحیٰ کے موقعہ پر لاکھوں جانیں قربان کردیتے ہو اور تم سے بھی پہلے ہر مذہب و ملت والے ایسی ہی قربانیاں کیا کرتے تھے اور قربانیوں کے ذریعہ ہی خدا کی آتش غضب فرو ہوا کرتی تھی۔ لہذا ان ہی قربانیوں کے قائم مقام خدا کا بیٹا خدا کے مذبح پر آچڑھا۔ یہ وہ ذبح عظیم ہے کہ جس نے سب چھوٹی موٹی قربانیوں کا عوض دیدیا ہے۔ اگر عید کے ذبح شدہ جانوروں پر چڑھ کر مسلمانوں کے لئے پلصراط پر سے گزرنا آسان ہوسکتا ہے تو خدا کا بیٹا بھی اپنے بھیڑوں کو اپنے کندھوں پر چڑھا کر پار اُتار سکتا ہے۔ لہذا بتیجۃً ان دونوں کفاروں میں کیا فرق ہے۔ اسکے علاوہ سینکڑوں پیر فقیر اگر ہمارے وسیلہ اور شفیع ہوسکتے ہیں تو مسیح کیوں شفیع و منجی نہیں ہوسکتا؟ اگر فی الواقع یہی اسلام ہے تو پھر اسلام اور دیگر کفارہ یا شفاعت کے مذاہب میں کون سا فرق ہے۔ اختلاف شخصیت یا اختلاف اسی سے تو حقائق میں اختلاف پیدا نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ جو مذہب قصہ کہانی پر آ ٹھہرا اور آج ہماری بھی یہی حالت ہے تو اسکا حشر یہی ہوگا۔ (رسالہ اشاعت اسلام ماہ اپریل ۱۹۲۷ء صفحہ ۱۵)

ہندستانی صوفیوں کی ایک جماعت کے مشہور پیشوا خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے :۔

"جب سے قرآن مجید کے ارشاد کو پڑھ کر سمجھا ہے کہ خدا کو خون اور گوشت درکار نہیں بلکہ وہ پرہیزگاری طلب کرتا ہے اسوقت

Marfat.com

سے میں نے خون بہانا چھوڑ دیا۔" (حسن نظامی روزنامچہ ۸ اپریل ۱۹۳۲ء)

تحریک خاکساران کے فاضل بانی جناب مشرقی کے تاثرات دیکھئے :۔

"قرآن حکیم نے مسلمان کو واضح طور پر حکم دیا تھا کہ "اے مسلمانو! اپنے دشمن کے بالمقابل جہاں تک تمہاری طاقت کی حد ہے قوت کے سامان تیار رکھو، بالخصوص گھوڑوں کی چھاؤنیاں تاکہ تم ان چھاؤنیوں سے خدا کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کر سکو۔" انہی گھوڑوں کی چھاؤنیوں کی اہمیت کو مسلمان کے دل میں ذہن نشین کرنے کے لئے خدائے عزوجل نے قرآن حکیم میں گھوڑوں اور اُن کے قدموں کی ٹاپوں کی قسمیں کھائی ہیں۔ دلاغے ہوئے فوجی گھوڑوں کا شد و مد سے ذکر کیا ہے۔ ہزارہا مسلمان ہر علاقے میں آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہر سال قربانی کے دُنبوں اور بکروں کی پرورش اس محبت سے کرتے ہیں کہ بعض اوقات عقل اس غلو فی الدین پر دنگ رہ جاتی ہے۔ ان دُنبوں کو روز نہلاتے ہیں۔ ان کی مالشیں کرتے ہیں۔ ان کو زیور پہناتے ہیں، ان کے اوڑھنے اور دوشالے تیار کرتے ہیں۔ ان پر رنگ [illegible] بیل بوٹے بناتے ہیں، قرآن حکیم میں ان دُنبوں کو اس طرح موٹا کرنے کا کہیں ذکر نہیں۔ نہ خدا کو ضرورت تھی کہ قربانی کے بکرے کے لئے جو چند منٹ میں جان دے کر بیکار ہو جاتا ہے اس قدر اہتمام کرنے کی ضرورت سمجھتا۔ اس نے تو صاف طور پر قرآن حکیم میں کہہ دیا تھا کہ "مجھے تمہارے بکروں کے خون اور گوشت نہیں پہنچتے اگر کچھ پہنچتا ہے تو تمہارا تقویٰ اور قانون خدا کا خوف پہنچتا ہے۔" لیکن ہمارے نفس پرست مولوی اور عالم دین کو چربی دار اور گوشت کی ضرورت [illegible] وقت تھی، وہ اپنے آپ کو اور اپنی ذریت کو پشتوں تک تر نوالے دینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ جب تک قربانی کے دُنبوں کو قیامت کے دن کے "پل صراط" کے گھوڑے بنا کر جنت کے سبز باغ نہ دکھائے جائیں گے [illegible] کبھی موٹے نہ ہو سکیں گے۔ الغرض "پل صراط" کی روایت پیدا کر دی گئی۔ فوجی گھوڑے اور چھاؤنیاں [illegible] کی نہ تھیں۔ وہ اگر قرآن کی مذکورہ بالا آیت کو ظاہر کرتا تو اپنے لئے ہمیشہ کی مصیبت مول [illegible] سپاہی بننا پڑتا۔ اس نے قرآن کے حکم کو اپنے نفس کے آرام کے زیر بار [illegible] اور خدائے عظیم کے عظیم الشان حکم و پروگرام کے بار دفعت [illegible] کہ تیرہ سو پچاس برس کے بعد بھی امت کے [illegible] ہو چکے ہیں۔

(الاصلاح ۲ [illegible] ۱۹۳۶ء)

میں نے اس مضمون میں گزشتہ و موجودہ اکابر و علمائے لیڈرز تاریخی فقرے نقل کئے ہیں لیکن واضح رہے [illegible] میرے لئے یا کسی مسلم قرآن کے لئے سند و حجت کا درجہ نہیں رکھتے۔ شخصیت پرستوں کی تسلی کے لئے ان اقتباس و رجال کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے، جس طرح دوائیں انسان کا جزو غذا نہیں ہوتیں۔ لیکن مریضوں کے لئے انکی ضرورت پڑتی ہے ہماری روح کی اصل غذا صرف کلام الٰہی ہے۔ قرآن مجید کی نص صریح کے خلاف ہزاروں امام، لاکھوں مجتہد

Marfat.com

کروڑوں مفسر پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ پس جو صاحب اس مضمون کے خلاف قلم اُٹھائیں وہ صرف قرآن اور علوم عق
کو پیش کریں، جس پر غور کرنا راقم کا فرض ہوگا۔ کسی شخص کا قول محض اس شخص کی حیثیت سے قابل قبول یا درخور
نہیں سمجھا جائے گا۔

# خلاصہ مقصود

قربانی قدیم رسم ہے، قریباً تمام اقوام عالم کا معمول رہی ہے، لوگوں کی جہالت کی وجہ سے قربانی بجائے مف
ہونے کے سخت مضر ہوگئی، قرآن نے اس کی اصلاح کرکے اس کو مفید اور معقول بنایا اس حد تک ہم اس کے قا
ہیں، بلکہ ضرورت شرعی کے وقت حیوان کیا انسانی جان کی قربانی بھی فرض ہوجاتی ہے، قرآنی اصلاح کے بعد مسلما
جلدی ہی قدیم اسراف و توہم کی طرف جھک پڑے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس غریب قوم کا کروڑوں روپیہ ہر سال بر
ہوتا ہے جس سے تمام کائنات اسلامی خصوصاً حجاز کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی حالت سدھر سکتی ہے ہسپتال اور اسکو
بنائے جاسکتے ہیں۔ غربا کی امداد کے لئے کارخانے قائم کئے جاسکتے ہیں۔ مفید لٹریچر کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ اسلحہ ف
ہوسکتے ہیں۔ ریلیں، نہریں، سڑکیں اور مسافر خانے تیار ہوسکتے ہیں۔ مروجہ قربانی' حج کے بعض موجودہ غیر قرآنی مراسم کو صح
تسلیم کرلینے کے بعد بھی خود عاملین قربانی کے نزدیک ارکان حج میں داخل نہیں۔ ہاں حسب ضرورت جانوروں کی
قربانی صرف مکہ معظمہ میں ہونی چاہیے۔ دوسرے بلاد و امصار میں اس کی قطعاً ضرورت نہیں مکہ میں بھی چاروں اماموں
اور عام علما کے ارشاد کے مطابق ایسا شخص مختار ہے چاہے روزہ رکھے چاہے صدقہ دے نصف صاع، چاہے
بکری ذبح کرکے فقرا کو بانٹ دے۔ غرضکہ ان تینوں کام میں سے جو کریگا وہ کافی ہوگا۔ قرآن پاک میں اس جگہ ا
سے سہل لفظ بولے گئے ہیں، فدیہ طعام ہو یا صدقہ یا نسک۔

(تفسیر نواب صدیق حسن صاحب جلد ۲ صفحہ ۲۵۸)

---

یہ مضمون کثرتِ اشغال کے باعث متفرق اوقات میں تھوڑا تھوڑا لکھا گیا، اس لئے اسکی ترتیب میں خامیوں
کا رہ جانا اغلب ہے۔ بعض مباحث کو ماخذوں کے نہ ملنے کے سبب اور بعض کو طوالت کے خوف سے تشنہ چھوڑنا پ
تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ کوشش مخلص محققین کے لئے اس حالت میں بھی فوائد سے خالی نہیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ما ارید الا الاصلاح ما استطعت ط و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

---

## تتمہ بر مضمون قربانی حضرت عرشی

از :- مؤلف

"نسک کی جمع مناسک ہے اور مناسک کے معنی اعمال حج ہیں (دیکھو ترجمہ قرآن مولانا اشرف علی) اعمال حج میں ایک چیز جانوروں کا ذبح کیا جانا بھی ہے۔ اس لئے نسک کے معنی جانوروں کا ذبح کیا جانا بھی ہو سکتا ہے یعنی جو جانور مکہ میں ایام حج میں لائے جاتے تھے۔ یہ جانور جو حاجی لوگ باہر سے لاتے تھے۔ ان کو بدن کہتے ہیں۔ قرآن نے ان بدن کو شعائر اللہ کہا ہے یعنی وہ خدا کے نام پر وقف ہوتے تھے۔ اس لئے راستے میں ان کا غارت حرام ٹھہرا۔ بدن کی تمیز کے لئے ان پر جھول ڈال دی جاتی تھی۔ یا گلے میں پٹہ ڈال دیا جاتا تھا۔ مکہ میں یہ جانور اسلئے لا کر ذبح کئے جاتے تھے کہ ایام حج میں خوراک کی کمی نہ ہونے پائے جس سے اہل مکہ اور باہر کے آنے والوں کو تکلیف ہو۔ ان ذبیحہ کے علاوہ دوسری طرف سے جانوروں کا شکار کرنا حرم میں حرام تھا۔ اور تاکہ لوگ ان جانوروں کی خرید و فروخت نہ کریں۔ ان کا ذبح کیا جانا بعض مناسک حج کا فدیہ قرار پایا۔ ظاہر ہے کہ خوراک کی بہم رسانی اسی طرح ممکن تھی کہ باہر سے جانور لائے جاویں جو خدا کے نام پر وقف ہوں اور ایام حج میں ذبح ہوں۔

یہ کہنا نادانی ہے کہ حج اسلام میں ایک وقت معین پر فرض کیا گیا تھا۔ حج کی رسم حضرت ابراہیم کے وقت سے چلی آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں بھی اسکا اظہار ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ رسم حج اسلام میں بھی باقی رکھی گئی۔

جانوروں کا بے ضرورت مکہ میں ذبح کرنا نہ واجب ہے نہ مسنون اور نہ یہ کوئی نیکی ہے۔ نیکی کی تعریف قرآن نے لیس البر ان تولوا وجوھکم میں کر دی ہے۔ اس لئے تمام ایسی حدیثیں جن میں نفس قربانی یا ذبیحہ کرنے کو موجب ثواب بنایا گیا ہے وہ میرے نزدیک موضوع اور باطل ہیں۔ مثلاً یہی جانوروں کے خون بہانے اور خدا کے اس سے خوش ہونے اور اس پر انعام دینے کا کوئی تعلق کم از کم اسلام سے نہیں ہو سکتا۔ دوسری قومیں جو اس خیال سے قربانی کرتی تھیں ان کے فلسفہ اور تاریخ پر میں فلسفہ مذہب میں کافی لکھ چکا ہوں۔ اگر جانوروں کے ذبح کرنے پر خدا کو خوشی ہوتی ہے تو پھر ہر بوچڑ ولی اللہ ہو جائے گا۔ بقرعید کے دنوں میں جانور ذبح کئے جاویں تو یہ اپنا شوق ہے۔ کوئی منع نہیں کرتا بلکہ گوشت کا ایک حصہ خیرات کر دیا جائے اور بھوکوں کو کھلا دیا جائے تو اس کا ثواب بھی ہے مگر ہندستان سے باہر بھی مسلمان مہذب ملکوں میں رہتے ہیں جہاں ہر شخص کو اپنے گھر کو بوچڑ خانہ بنانے کی حکومت بنظر حفظان صحت اجازت نہیں دے سکتی۔ تو کیا تمام دنیا کے مسلمان ہندستان میں اکٹھے ہو جائیں اس لئے کہ جانوروں کا خون دل کھول کر بہائیں۔

یہ کہنا کہ رسول اللہ نے مدینہ میں بقرعید منائی ہے اور قربانی کی ہے تو اگر اس روایت کو مان لیا جائے تو اس کا واجب ہونا کہاں سے ٹھہرا۔ رسولؐ کا ہر فعل مسلمان کے لئے واجب نہیں ہو سکتا۔ ان کی بہت سی قومی رسمیں تھیں جو

Marfat.com

عرب ہونے کی حیثیت سے وہ کرتے تھے۔ مثلاً عقیقہ عرب کی رسم تھی اور ممکن ہے کہ رسول اللہ نے بھی کیا ہو مگر وہ نہ ہمارے لئے واجب ہے نہ سنت۔ کرے یا نہ کرے۔

قابیل کی قربانی میں یہ کہاں ذکر ہے کہ اُنھوں نے بکرا ذبح کیا تھا۔ قربانی کے لفظی معنی تو تقرب حاصل کرنے کے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی بڑے آدمی سے تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ تو لوگ کچھ اس کے لئے نذر یا تحفہ لیجاتے ہیں خدا کو تحفہ یا نذر لے جانا اور اس کی قربت حاصل کرنا وہ ہمارے نیک کام ہیں۔ یہ ہی چیزیں خدا کو پہنچتی ہیں اور یہ تقرب کا ذریعہ ہے۔ جانوروں کا گوشت و خون اس کو نہیں پہنچتا۔

"فصل لربك وانحر" پر مولانا مودودی نے نہیں لکھا۔ مگر دوسرے علماء نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔ ان سے اگر قربانی مراد ہے تو بھی اس کو فرض ہونا چاہیئے کہ قرآن کا صاف و صریح حکم ہے۔ پھر آپ قربانی کو واجب کہتے ہیں۔ کیوں واقعہ یہ ہے کہ اونٹ کا ذبح کرنا نحر بولا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اونٹ حرام تھا۔ حضرتؐ متردد تھے کہ حرام ہے یا حلال کیونکہ عرب اس کو کھاتے تھے ان کے اس تردد کو اس آیت میں دور کر دیا گیا اور اونٹ حلال کیا گیا الکوثر کے معنی میں مفسرین کو بہت اختلاف ہے۔ ابن عباس نے اس کے معنی خیر کثیر کے لئے ہیں۔ کسی نے اسکو بہشت کی نہر کہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور اس کے معنی "پاک گوشت" کے ہیں۔

---

# مہدی آخر الزماں

(ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب سول سرجن رحیم یار خاں)

امام مہدی کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اور پہلی صدی ہجری میں اس عقیدہ کی موجودگی کا ثبوت تاریخ اسلام میں نہیں سنیوں کی معتبر کتب احادیث موطا امام مالکؒ میں (جو پہلی صدی ہجری میں لکھی گئی) اور بخاری و مسلم میں بھی امام مہدی نہیں ہے۔ البتہ سنیوں کی دوسری کتب احادیث میں بہ اختلاف کثیر متعدد احادیث امام مہدی سے متعلق پائی جاتی یہ اختلاف امام مہدی کی قوم، وقت آمد، حلیہ اور جائے نزول وغیرہ میں ہیں۔ عقیدۂ خلافت و امامت سنیوں کے ہاں مذہب میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن وہ مہدی کے منتظر ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پہلی صدی ہجری میں خلفاء اربعہ بنو اُمیہ کی خلافت تھی۔ اور بنو اُمیہ سے کسی نے بھی دعوائے مہدیت نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقیدۂ مہدیت اس وقت تک مسلمانوں میں رائج نہ تھا شیعوں کے ہاں مسئلہ امامت اصول دین سے ہے۔ روایات ائمہ سے پایا جاتا ہے کہ تمام ائمہ منصوص یعنی خدا اور رسول کے نامزد کردہ ہیں اور قرآن میں سب ائمہ کے نام تھے[1] جو مخالفین نے نکال دیئے

---

[1] شیعوں کے سب فرقے اس پر متفق نہیں ہیں۔

اُن کا عقیدہ ہے کہ "اصل قرآن" ائمہ کے پاس تھا اور ایک امام سے دوسرے امام کے پیچھے منتقل ہوتا رہا، مگر تعجب ہے کہ باایں ہمہ شیعوں کے دونوں بڑے فرقوں، امامیہ و اسمٰعیلیہ میں امامین کے متعلق اختلاف کثیر ہے۔ امامیہ یعنی اثناعشری بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ حضرت علیؓ پہلے امام ہیں اور امام محمد بن عسکری (مہدی) بارھویں۔ شیعہ اسمٰعیلیہ ان میں سے صرف پہلے چھ ائمہ کو جائز امام مانتے ہیں اور ساتویں امام (موسیٰ کاظمؒ) اور ان کے جانشینوں کو امام نہیں مانتے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ چھٹے امام (جعفر صادقؒ) نے اپنے بڑے بیٹے امام اسمٰعیل کی نصِ امامت بیان کی۔ اس لئے وہ جائز امام ہیں۔ وہ بعد میں امام جعفر صادقؒ کے اس نص کو بدلنے کے فعل کو جائز نہیں مانتے۔ امام اسمٰعیلؒ کے بعد اس فرقہ کے علیحدہ امام ہیں۔ مثلاً امام محمد المکتوم۔ امام جعفر المصدق مکتوم اور امام محمد الحبیب مکتوم اور امام عبداللہ المہدی وغیرہ۔ دونوں شیعہ فرقوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی زمانہ بلا امام کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسمٰعیلیہ اور اُن کے مختلف فرقوں میں امام اسمٰعیل کے بعد ہر زمانہ میں موجودہ امام تسلیم کئے گئے ہیں۔ شیعہ امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ گیارھویں امام (حسن عسکریؒ) کی وفات کے بعد جو ۲۶۰ھ میں ہوئی اُن کے فرزند امام محمدؒ جن کی عمر اُس وقت چار سال کی تھی، بارھویں امام ہوئے۔ وہ ایک غار (سر من رائے) میں جو سامرہ کے پاس تھا، چلے گئے اور پھر نظر نہ آئے۔ اس غیبت کے پہلے ۷۰ سالوں کو غیبت صغریٰ کہتے ہیں۔ چونکہ اس عرصہ میں چار بزرگوں کی معرفت جو باپ کہلاتے تھے امام اپنے متبعین سے خط و کتابت یعنی مفارقت رکھتے تھے، لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور امام آج تک غیبت کبریٰ میں ہیں۔ وہ قرب قیامت میں تشریف لا کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اور زمانہ غیبت امام کے نیک و بد لوگوں کو زندہ کر دیں گے (عقیدہ رجعت) اور جزا و سزا پائیں گے۔ وہ بارھویں امام (محمد بن عسکری) کی آمد کے منتظر ہیں۔ اس لئے امام کا نام امام منتظر، امام قائم، امام غائب یا امام مہدی یا آخرالزمان ہے۔ سنیوں اور شیعہ کے مذکورہ انتظار کے باوجود تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ دوسری صدی ہجری میں جب کہ بنو امیہ کا ایوان خلافت متزلزل ہو گیا تھا۔ پیدا ہوا اور مہدی کے متعلق جس قدر احادیث سنیوں اور شیعوں کے ہاں پائی جاتی ہیں، غالباً خلافت و امامت کے مختلف امیدواروں کے متبعین نے اپنے اپنے دعوے کی تائید میں وضع کیں اور یہ بات مضامین احادیث کے اختلاف سے بھی عیاں ہے جس سے متعلق ابتدا میں اشارہ ہو چکا ہے۔ احادیث مہدی مختلف امیدواروں کے حالات پر ہو بہو منطبق ہیں۔ حلیہ تک ملتا ہے۔ البتہ شیعہ کا خیال کہ تمام ائمہ منصوص اور نامزد تھے اور خدا و رسولؐ نے قرآن اور احادیث میں اُن کی خبر دی تھی بظاہر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے ائمہ اور مہدی کا یہ عقیدہ موجود تھا اور ائمہ کی حدیث اس دعویٰ کی موید ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ اس ضمن میں پہلی بات جو قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ اس عقیدہ کا انحصار قرآن میں ائمہ کے نام موجود ہونے پر ہے۔ چنانچہ وہ "اصل قرآنؐ" جو ائمہ کے پاس تھا، موجود نہ ہو دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور روایات جو اس دعویٰ کی موید ہیں کہ

---

لہ اگر اصل قرآن دنیا میں غائب رہنے کے لئے ہی آیا تھا، تو مقصود اس کی نزت اور بہت سی آیات جو صفات قرآن میں ہیں باطل ٹھہرائی گئی ہو

خود اُن کا اپنا وجود دوسری صدی ہجری سے پہلے ثابت نہیں ہے، اسلئے وہ کافی متصور نہیں ہوسکتیں۔ دوسری بات غور طلب ہے کہ شیعہ کے ہاں مسئلہ امامت اصول دین سے ہے اور ایسے اہم مسئلہ کے لئے روایات یقیناً کافی نہیں ہوسکتیں۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد دوسروں کی طرح بنو فاطمہ بھی مدعی خلافت و امامت تھے۔ گمان غالب ہے کہ اُن کے متبعین نے بھی انکی تائید میں احادیث و روایات وضع کرلی ہوں۔ اسکے علاوہ دو اُمور بالخصوص قابل غور ہیں۔

**(۱) تعیین امام**۔ اس میں بنو ہاشم بلکہ بنو فاطمہ میں قدم قدم پر اختلاف ہے، جو صریحی نص قرآنی اور نامزدگی کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا تھا۔ مثلاً تیسرے امام (حسینؓ) کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے فرزند محمد بن حنفیہؓ نے چوتھے امام (زین العابدینؓ) کے بالمقابل امامت کا دعویٰ کیا۔ تصفیہ استحقاق سنگِ اسود کے سپرد کیا گیا، مگر سنگِ اسود کے فیصلہ کو دونوں فریق نے اپنی اپنی تائید میں شمار کیا۔ نزاع طے نہ ہونے پر محمد بن حنفیہؓ بنو اُمیہ سے جاملے اور یزید کی بیعت کی۔ پھر چوتھے امام کے بعد اس کے پسر پانچویں امام (باقرؓ) کو اُن کے بھائی امام زیدؒ نے تسلیم نہ کیا اور علیحدہ امامت و جماعت (زیدیہ) قائم کی۔ جو خلفائے اربعہؓ کو جائز خلیفہ اور امام مانتے ہیں اور امام زیدؒ نے دعویٰ مہدویت بھی کیا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ پھر چھٹے امام (جعفر صادقؓ) نے اپنی جانشینی کی نص کا اعلان پہلے بحق امام اسمٰعیلؓ اور پھر بحق امام موسیٰ کاظمؓ کیا۔ اور اس تبدیلیٔ نص پر رفع اعتراض کے لئے خداوند جل شانہٗ کو بداء[۵] کا واقع ہونا اور امام اسمٰعیلؓ کے نقضِ عصمت کی دلیل ہیں پیش کیا، جیسا کہ روایاتِ امامیہ سے پایا جاتا ہے۔ اسمٰعیلیہ اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے اور وہ اپنے اماموں کے لئے نص صریح کے مدعی ہیں اور پھر بنو عباسؓ نے خلافت و امامت خلفاء اربعہ کو تسلیم کیا اور بمقابلہ بنو فاطمہ و بنو امیہ اپنی خلافت و امامت کے مدعی ہوئے اور اپنے دعویٰ کو احادیث و دلائل سے ثابت کیا۔ اُنھوں نے ۱۳۲ھ سے ۶۵۶ھ تک بغداد میں اور ۶۵۹ھ سے گیارھویں صدی تک مصر میں خلافت و امامت کی۔

**(۲) دعویٰ مہدویت**۔ بنو ہاشم اور بنو فاطمہ میں سے متعدد بزرگوں نے دوسروں کی طرح پے در پے دعویٰ مہدویت کئے مثلاً چوتھے امام کے فرزند امام زیدؒ نے جو حسینی تھے۔ ۱۲۲ھ میں بمقابلہ امام باقرؓ اور خلیفہ ہشام اُموی کے دعویٰ امامت و مہدویت کیا اور شہید ہوئے، جس پر جوشیلے مخالفین نے مہدی کا انجام سولی پر ہونے کے طعن کئے اور امام زیدؒ شہید کے بھتیجے امام جعفرؓ بددعا کی اور محمدؒ بن علیؒ بن عبداللہؓ بن عباسؓ نے ۱۱۱ھ میں دعویٰ خلافت و امامت کیا، جس کا نتیجہ ابو مسلم کا خروج اور قیام خلافت عباسیہ ہوا۔ سنیوں کی چند احادیث مہدی اُن کی تائید میں موجود ہیں۔ پھر ۱۳۲ھ میں عبداللہ بن علی حسنیؒ نے بمقابلہ خلیفہ عبداللہ ابوالعباس عباسی کے دعویٰ کیا۔ اُن کی تائید میں احادیث موجود ہیں۔ پھر ۱۴۵ھ میں امام محمد بن عبداللہ امام حسنؓ نے جن کا لقب اُن کی پاکیزگی و طہارت کی وجہ سے النفس الزکیہ تھا۔ بمقابلہ خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی دعویٰ سنیوں کی چند احادیث اُن کی تائید میں موجود ہیں، جو نام، ولدیت اور حلیہ تک کا تعین کرتی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام

---

۵ رائے بدلنا (مدیر)

Marfat.com

اور امام جعفر صادق نے ان کی تائید کی۔ مدینہ حجاز و یمن فتح کیا اور اعلان خلافت و امامت کیا، لیکن ناکامیاب ہوئے۔ وہ اور اُن کے بھائی ابراہیم شہید ہوئے۔ پھر خلیفہ منصور نے النفس الزکیہؓ کے کامیاب دعویٰ سے خائف ہو کر اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس کا نام مہدی رکھا، تاکہ دعویٰ مہدویت آئندہ کے لئے بند ہو جائیں۔ مہدی عباسی ۱۵۸ھ میں خلیفہ ہوئے۔ یہ بڑے سخی، عادل اور کامیاب تھے۔ مہدی کی متعدد احادیث جو سنیوں کے ہاں ہیں۔ اُن پر خوب منطبق ہیں۔ مہدی عباسی دس سال کی خلافت و امامت کے بعد ۱۶۹ھ میں فوت ہوئے۔ اس عرصہ خلافت کی طرف بھی احادیث میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ خلیفہ ابوالعباس عباسی کی وصیت کے مطابق خلیفہ منصور کے بعد اُن کا بھتیجا عیسیٰ امام اور خلیفہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر منصور نے عیسیٰ اپنے بھتیجے کو بحق مہدی اپنے پسر کے دست بردار ہونے کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ احادیث میں عیسیٰ کی موجودگی میں مہدی کے امام ہونے کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ اس عیسیٰ نے مہدی، النفس الزکیہ اور اُن کے بھائی ابراہیم کو شکست دے کر شہید کیا تھا۔ اور مہدی عباسی نے خراسان کے "برقعہ پوش پیغمبر" یعنی مقنع خراسانی کا، جس نے مزدک کے فلسفہ کا مطالعہ کر کے پیغمبری اور اوتار ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مقابلہ کیا اور اُس کو صفحہ ہستی سے مٹایا۔ احادیث میں اس کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ خلیفہ منصور عیسیٰ کی شجاعت و قابلیت کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ عیسیٰ اُس کے پسر مہدی عباسی کا مددگار ہو۔ چنانچہ عیسیٰ و مہدی کے مل کر اسلام کو فروغ دینے کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ پھر ۲۹۶ھ میں امام عبیداللہ فاطمی حسینی نے اپنے باپ امام محمد الحبیب مکتوم کی بیان کردہ پیش گوئی و نص مہدی کے مطابق سلامیہ میں جو حمص کے پاس تھا دعویٰ مہدویت کیا اور شمالی افریقہ فتح کیا اور خلافت و امامت کی۔ یہ اسمٰعیلی تھے۔ یہ مہدی خلافت بنو فاطمہ کے پیش رو ہیں جنھوں نے افریقہ اور مصر میں ۲۹۶ھ سے ۵۶۷ھ تک خلافت و امامت کی۔ اور المعز نے عزیز کے زمانہ میں حجاز اور شام فتح کیا۔ اور دنیا میں اپنا خطبہ جاری کیا۔ پھر ۵۱۴ھ میں مراکو میں امام محمد ابن تومرت حسنی نے بحوالہ پیش گوئی رسول صلعم اور نص صریح شہر سوس میں دعویٰ مہدویت کیا اور موحدین کی جماعت قائم کی ۵۲۴ھ میں ان کے انتقال کے بعد اُن کے نامزد کردہ خلیفہ امام عبدالمومن نے شمالی افریقہ اور ہسپانیہ فتح کئے اور خاندان موحدین کی بنیاد ڈالی، جس میں امام عبدالمومن کے جانشین یوسف اور ان کے پسر یعقوب المنصور بڑے کامیاب اور عظیم الشان خلیفہ گزرے ہیں۔ انھوں نے جنگ ارک کے موقعہ پر یورپ کے مقابلہ میں مسلمانوں کی امداد کی، جیسا کہ مضامین احادیث میں ذکر ہے۔ یہ گروہ مہدیان بنو ہاشم اور بنو فاطمہ سے ہے، جن کو بوجہ خاندان نبوت ہونے کے نص امامت و مہدی کے متعلق یقینی علم ہونا لازم ہے۔

پس مذکورہ تاریخی واقعات کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اماموں اور مہدی کی منصوصیت اور نامزدگی کا دعویٰ پہلی صدی ہجری کے بعد وضع ہوا۔ مذکورہ مہدیوں کی بھیڑ کے علاوہ دنیا میں غیر بنو ہاشم اقوام میں سے بھی متعدد دعوے داران مہدویت گزرے ہیں، مگر وہ دعویٰ منصوصیت نہ کرتے تھے۔ ان کا دعوے غیر منصوصہ مہدویت کا عموماً احادیث

Marfat.com

اہل سنّت والجماعت کے مطابق تھا۔ اور علیٰحدہ بحث کا محتاج نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صرف یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سنّیوں کے ہاں بعض احادیث مہدی، مہدی کو کسی خاص قوم سے قرار نہیں دیتیں، بلکہ عام اُمّتِ مسلمہ سے ہونا بیان کرتی ہیں۔ غیر ہاشمی مدعیوں نے اُن احادیث سے استفادہ کیا ہے۔ یہ احادیث غالباً پہلی قسم کی احادیث کی روک اور اُن کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وضع ہوئیں، یہ بھی ممکن ہے کہ عجمیوں نے وضع کی ہوں۔

اس مضمون کا مقصد یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آمد مہدی کی صحّت وعدم صحّت پر بحث کا دروازہ کھو جائے۔ مدّعا صرف یہ ہے کہ کتنی بے بنیاد شے ہے، جس پر دینی رنگ میں معرکہ جدال وقتال گرم ہوتا رہا ہے اور ہو ہی رہے گا۔ جب تک مسلمان قرآن حکیم کی پناہ میں نہ آجائیں گے، اس عقیدہ کی نہ کوئی دینی حیثیت ہے، نہ تاریخ عظمت، نہ سیاسی حکمت، محض نفسِ دُنیوی کی کارفرمائیاں ہیں، جن کے بطن سے ہمیشہ یہ مولودِ نامسعود متولد ہوتا رہا ہے۔

---

# ایصال ثواب

علامہ تمنّا عمادی مجیبی پھلواری شریف

"ایصال" کے معنی فرستادن، پہنچانا۔ "ثواب" کے معنی مُزد عمل۔ مزدوری۔ یعنی ایک مسلمان کوئی عمل نیک خود کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ میں نے جو یہ عمل نیک کیا ہے اس کا اجر اسکی مزدوری جو مجھ کو ملتی وہ فلاں مسلم کو ملے میں نے اسکو بخش دیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کوئی عمل نیک کرے۔ اس نیت سے اور اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ کر کہ میں یہ کا فلاں مسلمان کی طرف سے کر رہا ہوں، اسلئے اس کا ثواب یعنی اس کا اجر اس کی مزدوری اُسی کو ملے۔

قرآن مبین میں ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریقے کی تعلیم نہیں فرمائی گئی۔ عہد نبوی میں کوئی معمول بہ طریقہ نہ تھا کہ جب کوئی مرے تو اُس کیلئے ایصال ثواب کیا جائے۔ اسیطرح عہد خلفائے راشدین میں بھی ایصال ثواب کا کوئی معمول نہ حج بدل وغیرہ کی روایتیں یا مُردہ کی طرف سے قربانی اور سعد بن عبادہ والا واقعہ، یہ ساری روایتیں بہت زیادہ مشتبہ ہیں اور ناقابل اعتبار، محدثانہ طریقہ سے اگر ان کی تنقید کی جائے تو تھوڑی سی کوشش میں ان کی حقیقت روز روشن کیطرح واضح ہو جائے۔ چونکہ یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں اسلئے سردست ان سے قطع نظر کرتا ہوں۔

**کیا قرآن مبین اس کے متعلق خاموش ہے؟** ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مبین میں

ایصال ثواب کے مذکورہ بالا دونوں طریقے مذکور نہیں ہیں۔ تو اس سے تو اسی قدر معلوم ہوا کہ قرآن مبین ایصال ثواب کے متعلق خموش ہے تو پھر وہاں لم نجد فبسنۃ رسولہ کے مطابق ہم اسکو حدیثوں میں کیوں نہ ڈھونڈھیں؟ بعض روایتیں جرح و تعدیل اور عام عقل و درایت کی کسوٹی پر کسنے سے کمزور معلوم ہو سکتی ہیں، مگر ممکن ہے کہ وہ صحیح ہوں۔ ایک ہزار سال سے جس چیز پر اُمت کا تعامل چلا آ رہا ہے وہ کیوں خواہ مخواہ بے اصل مان لی جائے۔

اس سوال کے متعلق مجھے سب سے پہلے تو یہی کہہ دینا تھا کہ جس چیز کے متعلق قرآن خموش ہے اور اس کا تعلق عقاید یا عبادات سے کہا جاتا ہے تو پھر وہ دین میں کانٔ لم یکن شیئاً مذکوراً کا حکم رکھتی ہے اور باطل بے اصل چیز ہے۔ عقاید و عبادات سے متعلق دین اسلام میں کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جا سکتی جس سے قرآن خاموش ہو اور وہ صرف روایات سے ثابت ہو۔ مگر چونکہ اس جواب سے ممکن ہے کہ ایک نیا موضوع بحث چھڑ جائے اور ایصال ثواب کا مسئلہ بالائے طاق رہ جائے اور یہاں تو یہ واقعہ بھی نہیں ہے کہ قرآن مبین مسئلہ ایصال ثواب کے متعلق بالکل خموش ہے۔ اسلئے صاف یہی کیوں نہ کہہ دوں کہ قرآن مبین اسکے متعلق ہرگز خموش نہیں۔ دیکھئے سورۂ والنجم میں صاف فرما دیا گیا کہ وان لیس للانسان الا ما سعی اور سورہ حٰم السجدہ میں ارشاد ہے من عمل صالحا فلنفسہ اور سورہ والطور میں ہے کل امرئٍ بما کسب رھین ان تین آیتوں سے تین باتیں بعبارۃ النص نکل رہی ہیں۔

۱۔ انسان کا حق اپنے ہی سعی و عمل پر ہے، دوسرے کی سعی و عمل پر نہیں۔

۲۔ جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرتا ہے۔ اس کا نفع اُسی کرنے والے کو حاصل ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں۔

۳۔ ہر شخص اپنے کسب عمل میں رہن ہے۔ اس معاملہ رہن کو توڑنے یا ٹوٹ جانے کا جو طریقہ خود اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔ اس کے سوا کسی اور طریقے سے کوئی شخص بھی بطور خود اس معاملہ رہن کو توڑ نہیں سکتا۔ مثلاً عمل نیک کے تباہ ہو جانے کے جو اصول قرآن میں مذکور ہیں، اُن کے سوا کسی اور طریقے سے عمل نیک کا رہن نہیں ٹوٹ سکتا۔ اسی طرح عمل بد کے عفو و محو ہو جانے کے جو جو طریقے قرآن میں مذکور ہیں، اُن کے سوا کسی اور طریقے سے عمل بد کا رہن نہیں ٹوٹ سکتا۔ غرض جس نے رہن کیا ہے۔ وہی اس رہن کو توڑ سکتا ہے بطور خود یا کسی خود ساختہ قاعدے سے کوئی بھی اُس کے باندھے ہوئے عقد رہن کو توڑ نہیں سکتا۔

ایصال ثواب کے جواز کا عقیدہ ان تینوں آیات قرآنیہ کے بالکل خلاف ہے اور یہ تینوں آیات اسی طرح ایصال ثواب کے جائز ہونے کے عقیدہ کو باطل کر رہی ہیں۔ اسکو اسطرح مطابق کر کے دیکھا جائے تو اصل مسئلہ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے:۔

| قرآن مبین | ایصال ثواب کا قائل |
| --- | --- |
| ۱۔ انسان کا حق اپنی ہی سعی و عمل پر ہے۔ | ۱۔ انسان کا حق دوسرے کی سعی و عمل پر بھی ہے۔ |

لہ گویا وہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔

Marfat.com

۲- جو شخص بھی کوئی عمل نیک کرتا ہے اُسکا نفع اُسی کرنیوالے کو حاصل ہوتا ہے، دوسرے کو نہیں۔

۳- ہر شخص اپنی کمائی میں گرو ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بیان کردہ قرآنی اصول کے مطابق اس رہن کو توڑ سکتا ہے۔ کوئی شخص بطور خود کسی ایسے طریقے سے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا، اس رہن کو نہیں توڑ سکتا۔

۲- یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک عمل نیک کرے اور اسکا اجر و ثواب کسی دوسرے کو بخش دے۔

۳- اللہ تعالیٰ کے باندھے ہوئے عقد رہن کو ایسے طریقے سے جس کو قرآن مبین میں نہیں بتایا گیا ہے ہم بطور خود اللہ تعالیٰ سے دعا کرکے توڑ دے سکتے ہیں یا تڑوا دیسکتے ہیں۔

اس لئے یہ کہنا کہ قرآن مبین ایصال ثواب کے متعلق خموش ہے، بالکل غلط ہے۔ اگر ایصال ثواب کا طریقہ جائز اور صحیح ہوتا تو یقیناً قرآن مبین میں اس کا ذکر ہوتا اور جس طرح عام متوفی مسلمانوں کے لئے دعائے رحمت و مغفرت کی تعلیم فرمائی گئی۔ اُسی طرح ایصال ثواب کی بھی ضرور تعلیم ہوتی۔ عام مسلمان نہیں تو کم سے کم اہل قرابت اور والدین کے لئے تو ایصال ثواب کا حکم ہوتا۔

**دعائے رحمت و مغفرت اور ایصال ثواب۔** ایصال ثواب کے قائل، ایصال ثواب کو ثابت کرتے ہوئے دعائے رحمت و مغفرت کی تعلیم کے سلسلہ میں جو آیتیں آئی ہیں، عموماً اُن کو پیش کردیا کرتے ہیں۔ حالانکہ دعائے رحمت و مغفرت اور ایصال ثواب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دعائے رحمت و مغفرت ایک سفارش ہے، بارگاہ الٰہی میں چاہے وہ سُنے یا نہ سُنے اور ایصال ثواب خود جو عمل نیک وہ کرتا ہے، اسکی مزدوری جو اُس کو ملتی اپنی مزدوری دوسرے کو دلواتا ہے اس لئے اس میں ایک حق، اور دباؤ کی صورت پیدا ہے۔ مثلاً ایک نوکر آپ ہی سے کہے کہ آپ فلاں محتاج کو ایک روپیہ دیدیجئے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہرے تنخواہ میں سے ایک روپیہ آپ سے اُس محتاج کو دلوادے۔ کیا یہ دونوں صورتیں ایک کہی جاسکتی ہیں؟ پہلی صورت میں آپ کو اختیار ہے، چاہے دیجئے یا نہ دیجئے اور دوسری صورت میں آپ دے دینے پر مجبور ہیں۔ اگر آپنے نہ دیا تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔

**عبادت اور ثواب۔** ایک بہت بڑا دھوکا ایک مدت دراز سے کھایا جارہا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ہر عبادت پر جنت ملتی ہے نعمت ملتی ہے۔ مثلاً ایک رکوع قرآن مجید پڑھا اور جنت میں ایک دیگ پلاؤ تیار کرکے رکھ دیا گیا مرنے کے بعد خود نہیں کھایا۔ زندگی ہی میں دوسرے کو دلوادیا۔ دو رکعتیں پڑھیں اور جنت میں ایک قاب حلوا تیار ہوگیا۔ وہ کسی دوسرے کو دلوادیا گیا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ہر مسلم اپنی مدت عمر میں اپنے عقاید صحیحہ کی نگہداشت کے ساتھ اعمال حسنہ اگر کرتا

Marfat.com

دنیا سے باایمان اٹھا تو یا تو وہ مقربوں میں ہے یعنی السّٰبقون[1] الاولون من المھٰجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان میں ہے اور رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ والی جماعت میں شامل ہے یا اصحاب الیمین میں ہے یعنی واٰخرون[2] اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملاً صالحاً واٰخر سیئا تو اس کے لیے بھی یہ وعدۂ الٰہی ہے کہ عسی اللہ ان یتوب علیھم ان اللہ غفور رحیم اہل جنت اور نیک کاروں کی یہی تقسیم ہے اور بس۔ مگر اس کا پتہ کہ وہ کس درجہ کا جنتی ہے۔ اس کے موت تک کے عقاید و اعمال کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور اس کا دفتر بھی مرنے کے بعد ہی مرتب ہو سکتا ہے کیوں کہ الاعتبار[3] بالخواتیم اور اس کے لیے عبادت کی مقدار و کمیت سے زیادہ ان کی صحت و کیفیت کا اعتبار مرعی ہوتا ہے۔

عبادات کی غرض تزکیہ نفس ہے ورنہ کچھ وقت یا کچھ پیسے صرف کر دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ کتنے لوگوں کی نمازیں اور روزے قیامت میں اُن کے منہ پر پھینک دیے جائیں گے۔ یعنی قابل قبول نہ ٹھیریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اُن کا اثر تزکیہ عابد کے نفس پر دنیا میں مترتب نہیں ہوا۔ نمازیں تو پڑھتا رہا اور ساری عمر پڑھتا رہا۔ مگر فانک لم تصلّ[4] کی طرح۔ روزے تو بہت رکھے مگر لعلکم تتقون[5] کا مصداق نہ بنا۔ حج تو بہت کیے مگر حج کی بھٹی میں جب پڑا تو اُس کے ایمان کا وہ سونے کا سا رنگ اُڑ گیا اور وہ سونا لوہا بن کر رہ گیا۔ زکوٰتیں تو عمر بھر دیتا رہا مگر ان کو من واذٰی[6] کے ذریعہ ہمیشہ ضائع کرتا رہا۔ اس لیے درحقیقت پاکی نفس کے بغیر کسی عبادت کا کوئی اجر نہیں ہے۔ قرآن میں صاف فرما دیا گیا ہے کہ قد افلح من تزکی اس لئے آخرت کی کامیابی نفس کی پاکیزگی ہی پر موقوف ہے، عبادات کے ظاہری ڈھانچوں پر نہیں۔ اسی لیے ایک شخص جو سو برس کی عمر میں مرا اور اسی سال تک عبادتیں کرتا رہا اور دوسرا جو پچیس سال کی عمر میں مر گیا اور اس نے پانچ ہی برس تک عبادتیں کیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی پانچ سال کی عبادت اس کی اسی سال کی عبادت سے کہیں زیادہ اجر اس جواں مرگ کو دلوا دے۔ اس لئے کہ تزکیہ نفس کثرتِ عبادت پر موقوف نہیں ہے بلکہ صحت عبادت پر موقوف ہے اور صحت عبادت نفس کے پاک ہونے کے بغیر اللہ کے حضور معتبر نہیں۔ نماز کی خاصیت بتا دی کہ تنھی عن الفحشاء والمنکر (بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے) روزے فرض کیے گئے لعلکم تتقون (تاکہ تم متقی بنو) تو اگر دنیا میں

---

[1] وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سبقت کی اور وہ لوگ جنھوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی۔

[2] دوسرے لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا اور ملے جلے نیک و بد عمل کیے قریب ہے کہ [illegible] ان کی طرف متوجہ ہو۔

[3] اعتبار کا تعلق خاتمہ سے ہے۔

[4] تو نے نماز نہیں پڑھی [5] تاکہ تم متقی بنو [6] احسان جتانا اور تکلیف دینا

Marfat.com

ہماری نمازیں ہمیں فحش و منکر سے مانع نہ ہوسکیں۔ ہمارے روزے ہم میں تقویٰ نہ پیدا کرسکے تو یہ ہماری نمازیں ا
ہمارے روزے غرق مئے ناب اولیٰ ہیں۔ دنیا میں یہ عبادتیں ہمیں بڑا عابد و زاہد جو کچھ بھی مشہور کردیں، مگر
کے بعد کچھ بھی کام نہ آسکیں گی اور میزان قیامت میں ان کا مطلقاً کچھ وزن نہ ہوگا۔

اسی طرح تلاوت قرآن مبین ہے کہ ہمیں تدبر فی القرآن کے ساتھ تلاوت کا حکم ہے۔ ورنہ علیٰ قلوبٍ اقفا
(دلوں پر تالے ہیں) کا مصداق بنا پڑے گا۔ ہمیں ترغیبی و ترہیبی آیات سے نفس کی پاکیزگی کا اثر حاصل کرنا ہوگا
دنواہی کے مواقع میں بزبان ایمان و ایقان سمعنا و اطعنا (سن کر اطاعت کی) کہتے رہنا ہوگا۔ وعظ و عبرت ک
آیتوں کے وقت نصیحت و عبرت کے سبق لینا ہوں گے اور واذا تلیت علیھم اٰیتہ زادتھم ایمانا اور تقشعر
منہ جلود الذین یخشون ربھم ثم تلین جلودھم و قلوبھم الی ذکر اللہ[1] کا مورد بن کر یا بننے ک
کے ساتھ تلاوت کرنا ہوگی، اسی طرح اور عبادتوں کو بھی سمجھ لیجئے۔

تو ہماری نماز ہمیں کو فحش و منکر سے روک سکتی ہے، ہمارے روزے ہم ہی میں تقویٰ پیدا کرسکتے ہیں اور ہما
تلاوت قرآن مجید ہمارے ہی دل کو اللہ کی یاد کی طرف لگا کر ہمارے ہی ایمان میں زیادتی پیدا کرسکتی ہے غرض ہما
ہر عبادت خود ہمیں میں اثر تزکیہ نفس ڈال سکتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ فحش و منکر سے جو رکاوٹ ہم میں پیدا ہوتی ہے
یا تقویٰ جو ہم میں آگیا ہے، خشیت الٰہی و زیادت ایمان جو ہم کو حاصل ہوتی ہے اور تزکیہ کا جو اثر ہمارے نفس
پر پڑا ہے، ان چیزوں کو کسی دوسرے زندہ یا مُردہ کی طرف کسی طرح منتقل کردیں تو ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں

**دعائے محال** بعض بھولے بھالے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ عبادت تزکیہ نفس کی تاثیر ک
بغیر مفید نہیں اور بے شک تزکیہ نفس کی تاثیر ایسی چیز ہے کہ بظاہر ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں
ہوسکتی۔ مگر ہمارا ایمان ہے کہ ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر اس لئے اگر ہم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق ک
ادعونی استجب لکم دعا کریں کہ بار الٰہی فلاں عبادت جو میں نے کی اور اس سے جو تزکیہ نفس کا اثر مجھ
ہوا ہے وہ فلاں شخص کی طرف تو محض اپنی قدرت کاملہ سے منتقل کردے۔ یا یہ عبادت میں فلاں کی طرف
کر رہا ہوں۔ اس لئے اس کا اثر تزکیہ نفس فلاں فلاں شخص پر مترتب ہو تو آخر یہ دعا کیوں قبول نہ ہوگی
کیا اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں ہے؟

---

[1] جب ان پر آیات الٰہی تلاوت کیجاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھتا ہے جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں انکے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں
پھر ان کی جلدیں نرم ہوکر دل اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔

تو میں ان سیدھے سادے حضرات سے یہ عرض کرتا ہوں کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا کیجیے بلکہ خود پیٹ بھر کر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ یا اللہ! یہ شکم سیری جو مجھ کو حاصل ہوئی ہے، فلاں بھوکے تک اپنی قدرتِ کاملہ سے منتقل فرمادے۔ اور جاڑوں میں کبھی غربا و مساکین میں کمبل تقسیم نہ فرمائیے بلکہ خود عمدہ لحاف کمبل اوڑھ کر دعا فرمائیے کہ بارِ الٰہی! یہ جو گرمی مجھ کو محسوس ہو رہی ہے جتنے لوگ جاڑے سے کپکپا رہے ہیں، اُن تک منتقل فرمادے۔ کیونکہ ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ادعونی استجب لکم اور وعدہ ہے کہ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔

آپ یہ دعا کرسکتے ہیں کہ یا اللہ فلاں بھوکے کی شکم سیری کا کوئی سامان کردے۔ یہ دعا کرسکتے ہیں کہ یا اللہ فلاں غریب مسکین جو جاڑے سے کانپ رہا ہے۔ اسکے لئے کوئی سامان کمبل وغیرہ کا کردے۔ یعنی کسی کو توفیق دے دے کہ اُس کو کھلادے اُس کو کمبل خرید کر دے دے۔ مگر وہ دعائیں نہیں کرسکتے جن کا ذکر میں نے پہلے کیا۔ اسی طرح ایک لڑکا یونیورسٹی کا امتحان دینے کے لئے گیا ہے تو آپ یہ دعا کرسکتے ہیں کہ یا اللہ! فلاں لڑکا امتحان پاس کرجائے مگر یہ دعا نہیں کرسکتے کہ فلاں فلاں مسائل جو مجھ کو یاد ہیں میرے ذہن سے اُس لڑکے کے ذہن تک منتقل فرمادے۔ غرض امرِ محال کی دعا قطعاً ممنوع ہے۔ آپ ایک بیمار کی شفا کے لئے دعا کرسکتے ہیں مگر خود جواہر مہرہ کھا کر یہ دعا نہیں کرسکتے کہ یہ جواہر مہرہ جو میں نے کھایا ہے اور اُس سے جو تقویتِ روح مجھ کو حاصل ہوئی وہ اُس بیمار تک منتقل ہوجائے۔ بالکل اسی طرح آپ کسی زندہ یا مردہ کے لئے دعائے رحمت و مغفرت و ترقی درجات وغیرہ کرسکتے ہیں مگر خود کوئی عمل نیک کرکے اُس سے جو اثر تزکیہ آپ کے نفس پر مترتب ہوسکتا ہے، اس کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے کی دعا نہیں کرسکتے خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ من عمل صالحا فلنفسہ[1]۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ[2]۔ کل امرء بما کسب رھین[3]۔ کیا ان آیتوں کے بعد بھی اور ان روایات عقلیہ قرآنیہ کے باوجود بھی ایصال ثواب و جائز [illegible] ان یبدلوا کلام اللہ کا مصداق نہ ہوگا؟

**کچھ روایات سے متعلق۔** میں نے روایات سے اسوقت بحث کرنے کا قطعی ارادہ نہیں کیا ہے بلکہ بہت احتیاط کی ہے اور بشرطِ ضرورت اس کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے مگر اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ جو روایتیں نصِ قرآنی کے صراحتہً مخالف ہوں کم سے کم ان کو تو موضوع سمجھنا چاہیے۔ اور ایسا تو نہ کیا جائے [illegible] آیات قرآنیہ کو اُن کے مرکز عبارۃ النص سے تاویلات رکیکہ کے ذریعہ ہٹا دینے کی جرأت اختیار [illegible]۔

یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ روایتیں موضوع ہوسکتی ہیں۔ ائمہ مجتہدین سے غلطیاں ہوسکتی ہیں [illegible]

---

[1] جو نیک عمل کرتا ہے وہ اسی کے لئے ہے۔

[2] انسان کو اپنی ہی کوششوں کا پھل ملے گا۔

[3] ہر شخص اپنے کسب و عمل میں گروی ہے۔

Marfat.com

سال کا تعامل معنی پر غلط ہوسکتا ہے۔ مگر قرآن مبین کی ایک آیت بھی اپنے ما ثبت[1] بعبارۃ نصھا او اقتضاء نصھ کے خلاف مفہوم نہیں پیدا کرسکتی۔ اسی طرح کسی آیت کا وہ مفہوم جو اُس کی دلالۃ النص یا اشارۃ النص سے نکالا جائے یا کسی دوسری آیت کے اس مفہوم کے خلاف نہیں ہوسکتا جو کسی آیت کی بھی عبارۃ النص یا اقتضاء النص سے نکل رہا ہو۔

قرآن کے مفہوم کو باقی رکھنے کے لئے حدیثوں کی تاویل کیجا سکتی ہے اور کرنی چاہئے مگر حدیثوں کے مفہوم کو باقی رکھنے کے لئے آیات قرآنیہ کی تاویل حد درجہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ حدیثیں غلط اور موضوع ہوسکتی ہیں۔ قرآن کی تو کوئی آیت ضعیف بھی نہیں ہوسکتی۔

**ایک آخری التجا۔** میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، محض احقاق حق کے لئے لکھا ہے، اسکے سوا میری کوئی غرض نہیں وکفیٰ باللہ شھیدا۔ اسلاف کی عزت و احترام میرے دل میں بھی اُسی قدر ہے جس قدر ایک مسلم کے دل میں ہونی چاہئے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون[2] مجھ سے قیامت کے دن کبھی نہیں پوچھا جائے کہ فلاں فلاں اماموں اور راویوں کا تم نے کیوں اتباع نہ کیا؟ مجھ سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے قرآن و رسول کا اتباع کیوں نہ کیا؟ البتہ رسول اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں کہ اُن سے حدیثوں کی تصحیح کرسکوں مگر قرآن ہے۔ ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

---

# وقف کی دینی حیثیت

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری)

دولت مند مسلمانوں نے جو اوقاف مختلف اغراض مثلاً مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں یا امام باڑوں وغیرہ کے لئے کئے ہیں، ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟ یہ سوال کئی مخلص احباب نے مجھ سے کیا۔ اس لئے میں نے اس مسئلہ کی تحقیق اور چھان بین کی۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر ائمہ حدیث و فقہ کے نزدیک وقف کی شرعی حیثیت مسلّم چلی آرہی ہے۔ انکے بیانات سے وقف کی جو حقیقت میں سمجھ سکا، وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے:-

ایکسی مال یا جائداد کو مالک اپنی ملکیت سے نکال کر ایک خاص غرض کے لئے روک دے کہ اس کی آمدنی پیداوار اُسی مخصوص غرض میں صرف کی جائے۔

---

[1] جو اس سے صراحتاً ثابت ہو۔

[2] یہ لوگ گزر گئے اُن کے عمل اُن کے لئے ہیں اور تمھارے عمل تمھارے لئے انکے عمل سے متعلق تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

Marfat.com

۲۔ بہت سے فقہانے تصریح کی ہے کہ اس میں ابد تک کی شرط لگانا ضروری ہے، یعنی وقف ہمیشہ کے لئے ہونا چاہیے ورنہ صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ وقف کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ کسی کو اس کا متولی بنادے اور اس سلسلہ ولایت کا ہمیشہ کیلئے سامان کرجائے۔

۴۔ موقوفہ مال کی آمدنی یا موقوفہ جائداد کی پیداوار ابداً آباد تک واقف کی معینہ غرض کے سوا بشرطیکہ وہ دین کے خلاف ثابت نہ ہو، کسی دوسرے کام میں صرف نہ ہو سکے گی۔

۵۔ الوقف لا یملک ولا یباع ولا یوھب ولا یورث یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے نہ بیچا جاتا ہے نہ ہبہ کیا جاتا ہے نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔

یہ وقف میرے نزدیک قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ اس میں جتنی صورتیں مال کے انتقال، یعنی ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں جانے کی بیان کی گئی ہو، مثلاً خرید و فروخت، وصیت و وراثت، ہبہ وصدقہ، زکوٰۃ و خیرات وغیرہ ان میں کہیں اشارۃً یا کنایۃً بھی ایسے وقف کا ذکر نہیں ہے جو کسی کی ملکیت میں نہ آئے بعض فقہانے اسکو وصیت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وصیت اور وقف میں دو نمایاں فرق ہیں:۔

۱۔ وقف میں فقہا کے بیان کے مطابق وقف کرتے ہی مال واقف کی ملکیت سے خارج ہو جاتا ہے بخلاف وصیت کے کہ اس میں موصی کے مرجانے کے بعد وصیت کا مال دوسرے کے ہاتھ میں جاتا ہے۔

۲۔ وقف میں مال واقف کی ملکیت سے نکل کر کسی کی ملک نہیں ہوتا۔ بخلاف اسکے وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد موصیٰ لہٗ اس کا مالک ہو جاتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے۔

ایسی کوئی وصیت قرآن سے ثابت نہیں کی جاسکتی، جس پر موصی کے مرنے کے بعد کسی کی ملکیت نہ قائم ہو۔

اور وقف عقل کے خلاف حسب ذیل وجوہ سے ہے:

۱۔ مال و جائداد فطرۃً مملوک ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہوں۔

یہی دشواری تھی، جس کی وجہ سے بعض فقہا کو یہ کہنا پڑا کہ مال موقوفہ کا مالک اللہ ہوتا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اس پر تصرف بھی اللہ ہی کا ہوگا اور امام وقت جو حکومت الٰہی کا نائب ہوتا ہے۔ اپنی صواب دید کے مطابق اس کو صرف کرے گا نہ کہ مردہ کی خواہش کے مطابق۔

۲۔ وقف کرنے میں مال جب واقف کی ملکیت سے نکل گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب نہ یہ اس کا تصرف رہا، یہ بیک وقت اجتماع نقیضین ہے کہ وہ مالک مال کا بھی نہیں ہے۔ مگر وہ تصرف جو چاہے اس کی خواہش ارادہ کے مطابق

۳۔ مال یا جائداد سے جو آمدنی یا پیداوار ہوتی ہے، وہ زندوں کی محنت سے ہوتی ہے، اسلئے اس کے ورثہ

Marfat.com

ہی کو متصرف بھی ہونا چاہئے۔ مُردہ کی خواہش کا اس پر مسلط ہونا کسی صورت سے جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کیونکہ اس سے اکثر حالات میں نقصان ہوتا ہے۔ وقف کرنے والے کو کیا خبر کہ کل زمانہ کی ضروریات کا تقاضا کیا ہوگا؟ یہ تو زندہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

چنانچہ خود ایک مضحکہ خیز معاملہ میرے شہر میں در پیش ہے۔ وہاں ایک وقف تعزیہ اور امام باڑہ کے اخراجات کے لیے ہے۔ جو لوگ اس کے متولی ہیں وہ اہلِ سنت ہیں اور اب اہل حدیث ہوگئے ہیں جو ان امور کو شرک سمجھتے ہیں اگر وقف کے شرائط کے مطابق ان کو یہ سب مشرکانہ رسوم ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ہر چند چاہتے ہیں کہ ہم اس امام باڑہ کو مدرسہ بنالیں اور وقف کی آمدنی کو تعلیم پر صرف کریں لیکن نہیں کر سکتے۔ اگر مقدمہ بھی دائر کریں کہ یہ امور شریعت کے خلاف ہیں لہذا فقہاء کے فتووں کے مطابق ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم اس آمدنی کو دوسری جائز مد میں صرف کریں تو واقف کی ذریت جو شیعہ ہے اسکو عین مذہب کے مطابق ثابت کردیگی۔

علاوہ بریں یہ سلسلۂ وقف اگر جائز قرار دیا جائے اور اسی طرح جاری رہے تو نہ معلوم دولت مند کس قدر جائدادیں وقف کرڈالیں گے، جن سے آئندہ نسلوں پر دنیا تنگ ہوجائے گی۔ آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اوقاف کا شمار کیا جائے، تو ان کی آمدنی سالانہ کروڑوں روپیہ تک پہنچتی ہے، جس کا بڑا حصہ بے کار مصارف میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بعض سادہ دل بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اوقاف ملت کا سرمایہ ہیں، جن سے بڑے بڑے قومی کام چل سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملت کا سرمایہ نہیں بلکہ مُردوں کا سرمایہ ہیں جو اُن کے مخصوص اغراض سے وابستہ ہیں ان میں سے کچھ تو مفید۔ لیکن زیادہ تر غیر مفید کاموں میں صرف ہو رہے ہیں۔

۴۔ وقف کردینے سے مال جب واقف کی ملکیت سے خارج ہوگیا تو اسکو اس پر تولیت کا حق کہاں رہا؟ اگر اس نے اسوقت کسی کو متولی بنایا تھا، جب وہ اس کا مالک تھا تو اسکی ملکیت ختم ہوتے ہی متولی کی ولایت بھی ختم ہوگئی، کیونکہ حق تولیت کی بنیاد حق ملکیت پر تھی۔ جب یہ نہیں رہا تو وہ بھی نہیں رہا۔

الغرض عقلاً وقف میں اس قدر قباحتیں ہیں کہ وہ جائز ہو ہی نہیں سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اُسوقت جبکہ اسلامی خلافت استبدادی حکومت بن گئیں اور مسلمانوں میں سرمایہ داری آگئی دولت مندوں نے جہاں مال سے دنیاوی آسائشیں حاصل کیں، وہاں یہ بھی چاہا کہ اس سے ایک مستقل جائداد آخرت کے لئے بھی بنالیں، جس کا ثواب ابد تک ملتا رہے، اس لئے وقف کا طریقہ اختیار کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کی قانونی امور میں بہت باریک بیں تھی، وقف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ امام ابو یوسف بھی جو ان کے شاگرد اور بغداد کے قاضی القضاۃ تھے، اس مسئلہ میں اپنے استاد کے تابع تھے، مگر بعد میں انکی رائے بدل گئی۔ امام سرخسی لکھتے ہیں

وکان ابو یوسف یقول اوّلاً بقول ابی حنیفۃ ولکنہ لما    امام یوسف پہلے ابوحنیفہ کے قول پر تھے، لیکن جب انھوں

Marfat.com

حج مع الرشيد فرأى وقوف الصحابة بالمدينة ونواحيها رجع فافتى بلزوم الوقف

(كتاب المبسوط ج ۱۲ صفحہ ۲۸)

ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اور مدینہ اور اس کے اطراف میں صحابہ کرام کے اوقاف دیکھے تو ان کے قول سے رجوع کر لیا اور وقف کے جواز کے فتوے دے دیئے۔

امام سرخسی کے بیان کے مطابق امام ابو حنیفہ کے نزدیک "وقف" یا "حبس" کا مفہوم صرف یہ تھا کہ وقف کرنے والا مال کو اپنی ملکیت میں روک لے اور اس کے منافع کو صدقہ کردے۔ یقیناً اس صورت کے جواز میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کی مثال عاریت کی ہے جو دینے والے کی ملکیت میں رہتی ہے مگر نفع اٹھانے کا حق دوسرے کو دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس صورت میں ظاہر ہے کہ واقف کے مرنے کے بعد مال موقوفہ ورثہ میں تقسیم ہوگا کیونکہ وہ ورثہ کی ملکیت میں ہے۔

وقف کے جواز پر فقہا کا استدلال قرآن سے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف اس روایت سے ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر میں ایک اچھا نخلستان ملا تھا جس کا نام ثمغ تھا۔ انھوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ میں اسکو صدقہ کرنا چاہتا ہوں جس طرح حکم ہو عمل کروں۔ سرورؐ عالم نے فرمایا: ان شئت حبست اصلها وتصدقت بها۔ اگر تمہاری خواہش ہو تو اس کو روکے رہو اور صدقہ کرو۔ ائمہ ستہ حدیث کے متفق علیہ الفاظ روایت کرتے ہیں۔ ان سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضورؐ کا فرمان یہ تھا کہ نخلستان کو اپنی ہی ملکیت میں روکے رکھو اور اس کے پھل کو صدقہ کردو، کیونکہ اس وقت "حبس" یا "وقف" کا لفظ ان اصطلاحی معنوں میں نہیں بولا جاتا تھا، جن میں بعد کے فقہا ان کو استعمال کرنے لگے۔ غالباً امام ابو حنیفہ کا یہ خیال کہ مال موقوفہ واقف ہی کی ملکیت میں رہتا ہے۔ اسی روایت کی بنا پر تھا۔

بعد میں اس روایت پر اضافے ہوئے اور اسکے الفاظ میں تبدیلیاں کی گئیں یہاں تک کہ وہ [illegible] وقف کی [illegible] بنالی گئی جو فقہاء نے تجویز کیا تھا۔ حالانکہ ایسی روایتیں بھی ہیں جو وقف کے خلاف ہیں۔

امام طحاوی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ سورہ نساء میں فرائض میراث نازل ہو جانے کے بعد رسولؐ نے حبس کی ممانعت فرمادی جو میں نے خود سُنی۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وراثت سے کوئی چیز روکی نہیں جا سکتی بجز اسلحہ اور سواری کے یعنی جنگ کے ہتھیار یا سواریاں جو جہاد کے لیے دے دی جائیں۔ ان کے سوا کسی شے کو کسی خصوص غرض کے لئے روکنا جائز نہیں ہے۔ وہ ورثہ میں تقسیم ہوگی۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے، لیکن حضرت علیؓ کے قول کے متعلق بعض فقیہوں نے کہا ہے کہ وہ ثابت نہیں ہے اسلئے کہ ان کا عمل اسکے خلاف تھا، کیونکہ مصر میں انہوں نے اپنا ایک گھر اپنی اولاد کے لئے خود وقف کیا تھا۔ مگر مصر میں حضرت علیؓ کب گئے؟ وہاں کون سا مکان بنایا یا خرید کیا؟ اور وہ کونسی اولاد تھی وہاں کی جس کے لئے وقف کیا؟ ان میں سے کسی بات کا بھی جواب تاریخ سے نہیں ملتا۔

Marfat.com

# التاریخ المستند

## لمسند الامام احمد

(از مولانا تمنا عمادی پھلواری شریف…

حضرت مولانا تمنا عمادی مدظلہ کا یہ مضمون جس محنت و کاوش سے لکھا گیا ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جن کو ایسی ٹھوس اور عمیق علمی تحقیق کا موقع ملا ہے، مولانا نے پوری کوشش سے اس مقصد کو پورا کر دکھایا ہے۔ جسکو پورا کرنا "البیان" کا نصب العین ہے۔ محترم ناظرین اس میں عام لذت کا سامان نہ پائیں گے کیونکہ یہ ایک دوائے تلخ ہے جو مواد فاسد کو باریک رگوں کے اندر سے نکالنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی عمر و صحت میں برکت دیں اور انھیں اپنے دین کی خدمت کی توفیق سے بہرہ یاب رکھیں۔ —— مدیر

حدیث کی بعض کتابیں متاخرین نے خود جمع کیں مگر ان کو اگلے بزرگوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا… نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام ہیں، بعض خواص بھی کچھ دنوں کے بعد اس نسبت سے دھوکا کھا گئے اور اس کتاب کو انھیں بزرگ کی تالیف سمجھنے لگے، جن کی طرف اسکی نسبت کر دی گئی تھی۔

حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن حمزۃ الحسینی نے مسند امام شافعیؒ و مسند امام ا… کا ذکر اس طرح کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ان بزرگوں کی خاص تالیف سمجھتے تھے۔ حالانکہ مسند شا… کو بعض نیشاپوریوں نے کتاب الام وغیرہ سے اور بعض حدیثیں ابو العباس الاصم سے لے کر جن کو وہ تنہا ربیع بن سلیمان… روایت کرتے تھے۔ ایک مسند شافعی مرتب کر رکھی تھی۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے تین سو برس بعد ابو محمد الحارثی نے امام ابو حنیفہ ہی کے شیوخ پر کچھ حدیثیں مرتب کر… ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام مسند ابی حنیفہ رکھ دیا۔ اس کے بعد اسی میں سے مرفوع حدیثیں چُنکر ابو بکر بن المقری… ایک مختصر سی مسند ابی حنیفہ مرتب کی۔ پھر حافظ ابو الحسن ابن المظفر نے بھی ایک مسند ابی حنیفہ جمع کی اور سب کے… میں ابن خسرو نے ایک ضخیم مسند ابو حنیفہ لکھ ڈالی۔ جو اگلی کتابوں کی جامع ہے۔

تو جب ابن حمزۃ الحسینی جیسے محدث و رجال، جو ابن حجر سے بھی متقدم تھے، صرف نسبت کیوجہ سے دھوکا کھا…

تو تا بدیگراں چہ رسد۔

مگر یہ جامعین مسند چونکہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے بہت زیادہ متاخر تھے اور پھر انکی یہ جمع و… کسی خاص اجتماعی سازش کے ماتحت نہ تھی بلکہ مختلف اصحاب کی الگ الگ کوششیں تھیں اور ہر مؤلف کی کوشش…

خاص اپنے ہی فرقے کی تائید میں تھی، جس کی وجہ سے دوسرے فرقہ والوں نے ان کتابوں کی نسبتوں کو صحیح ثابت نہ ہونے دیا اور خود اس فرقے کے ثقہ لوگوں نے بھی دوسروں کی تکذیب کی تائید کی، جیسا کہ ابن حجر نے خود اعتراف کیا کہ مسند شافعی امام شافعیؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان کے بہت بعد بعض نیشاپوریوں نے اس کی تالیف کی۔

بخلاف مسند امام احمد کے کہ یہ ایک خاص اجتماعی سازش کے ماتحت جمع کی گئی اور اس کے جامعین کی غرض ہی یہی تھی کہ اسکو جس طرح بھی ہو، خاص امام احمد کی تالیف ثابت کرکے رہیں اور اس کا اہتمام امام احمد کی وفات کے کچھ بعد ہی سے نہیں بلکہ عجب کیا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کے وقت ہی سے اس کی تالیفی داغ بیل ڈال دی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسند امام شافعی کے جامع کی غرض اس کتاب سے مسلک امام شافعی کی تائید تھی اور مسند امام ابی حنیفہ کے جامع کی غرض اس کتاب سے مذہب امام ابوحنیفہ کی تائید تھی، اس لئے ان میں سے ہر ایک میں اپنے اپنے رنگ کی حدیثیں جمع کی گئیں تھیں۔

مگر مسند احمد میں مسلک امام احمد کے موافق و مخالف ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں جمع کر دی گئی ہیں اور اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ ہر فرقے کے موافق بھی کچھ حدیثیں اس میں ملتی ہیں اور مخالف بھی۔

مسند شافعی سے صرف شوافع ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور مسند ابی حنیفہ سے صرف احناف ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دوسرے فرقے والے ان کتابوں سے بہت کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ مگر مسند احمد سے جس طرح حنابلہ مستفید ہوتے ہیں، بلکہ اسی طرح شوافع و احناف و مالکیہ بھی۔ اور صوفیہ اور شیعہ کے لئے تو یہاں خزانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے یہاں تک کہ زنادقہ و ملاحدہ بھی اس کی بارگاہ سے محروم نہیں جا سکتے۔ ۵ [illegible]

یہی وجہ ہے کہ مسند شافعی سے احناف کو اختلاف ہو سکتا ہے اور مسند ابی حنیفہ پر شوافع وغیرہم معترض رہتے ہیں اور کہتے ہیں، مگر مسند احمد کی پالائش سب کے سب کرتے ہیں کیونکہ یہ مجموعہ کل حزب بما لدیہم فرحون کی ایک عجیب غریب تماشا گاہ ہے۔ مسند احمد میں یوں کہ ہر فرقے کے موافق بھی روایتیں ہیں اور مخالف بھی اس لئے ہر فرقہ اس کی بعض حدیثیں لینے کے لئے جس طرح ہاتھ بڑھاتا ہے اسی طرح بعض کی طرف سے ہاتھ کھینچ بھی لیتا ہے۔ اس کے لئے بات یوں بنائی جاتی ہے کہ اس میں کچھ تو حدیثیں خاص امام احمد کی ہیں وہ تو اکثر صحیح ہیں اور کچھ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کے اضافے ہیں۔ ان میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ہو گئی ہیں اور کچھ حدیثیں عبداللہ بن احمد کے شاگرد ابوبکر قطیعی کی بڑھائی ہوئی ہیں جن میں ضعیف ہی نہیں بلکہ کچھ موضوعات بھی ہیں۔ اس تقسیم کے بعد ہر فرقے کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ جو حدیث اس کے موافق اس ذخیرے میں ملتی ہے، اسکو وہ خاص امام احمد کی بتاتا ہوا اس کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے اور جو حدیث اس کے خلاف ملتی ہے اس کو عبداللہ کے زیادات [illegible]

Marfat.com

ابوبکر قطیعی کے اضافے قرار دیکر رد کر دیتا ہے۔

رجال کی چھان بین کرنے والوں کی کافی تعداد دوسری صدی کے اواخر ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور یہ فن روز افزوں ترقی پر مدتوں رہا۔ مگر باوجود کافی تفحص اور قابلِ رشک دیانتداری کے نفسانی رجحانات سے ائمہ رجال بھی محفوظ نہ رہ سکے، اور جس طرح امام مالک و امام احمد اور بخاری و مسلم کے شیوخ سے جہاں تک ہو سکا، چشم پوشی سے کام لیا گیا اسی طرح ایسے لوگوں کے متعلق بھی عفو درگزر سے حتی الوسع کام لیا گیا، جن سے روایات کا کوئی خاص مقصد وابستہ تھا مثلاً حفص و حمزہ زیات وغیرہما جیسوں کے احکام و سنن کی کبھی کوئی روایت معتبر نہیں سمجھی گئی، مگر اختلاف قرأت کی روایتیں ضرورتاً ان سے لے لی گئیں ورنہ وہ قرأتیں جو اُن سے مروی ہیں معدوم ہو جاتیں اور ان کے معدوم ہونے سے قاریوں کے نزدیک قرآن کا ایک حصہ ہی معدوم ہو جاتا۔

اسی طرح سُدّی و کلبی وغیرہما کہ ہرچند احکام و سنن میں ان جیسوں کی کوئی روایت مقبول نہیں ہوئی، کیونکہ یہ لوگ بالاتفاق وضّاع و کذّاب ہیں، مگر تفسیری روایتیں کم سے کم پچانوے فیصدی اُن جیسوں سے مروی ہیں اگر ان لوگوں کو نامعتبر قرار دے کر انکی تفسیری روایتیں رد کر دی جائیں تو پھر یہ تفسیر کا ذخیرہ تو بالکل غائب ہی ہو جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسند کے دو راوی ابوبکر قطیعی جو مسند کی روایت عبداللہ بن امام احمد سے تنہا کر رہے ہیں اور ابن المذہب جو ابوبکر قطیعی سے تنہا مسند کی روایت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں غیر مُتقن اور حقیقتہً ناقابلِ اعتبار ہیں مگر ان کو ناقابل اعتبار قرار دے کر ان کے واسطے سے جو مسند احمد کا ذخیرہ مل رہا ہے، اس کو غیر مستند سمجھتے ہوئے محض رد کر دیتے تو پھر ایسی نعمتِ عظمیٰ جس سے ہر فرقہ کا کام نکل رہا ہو، کہاں ملتی؟ اس لئے جس طرح قرأت کے لئے حفص و حمزہ کو گلے لگانا پڑا اور تفسیری روایتوں کی خاطر سدی و کلبی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کو گوارا کیا گیا اسی طرح مسند احمد کی ضرورت نے ابوبکر قطیعی و ابن المذہب کی پالائش کرنے پر محدثین و ائمہ رجال کو مجبور کیا۔

متقدمین نے تو اتنا بھی اعتراف کیا تھا کہ اس انبار روایات میں بعض موضوع روایتیں بھی ہیں مگر وہ صرف ابوبکر قطیعی کے اضافے والی روایتیں ہیں۔ چنانچہ ابن جوزی[1] و علامہ عراقی[2] نے مثالاً بعض روایتوں کو موضوع قرار دے کر پیش بھی کیا تھا۔ مگر بعد والے اس مسند کے ساتھ اس قدر غلو پیدا کر چکے تھے کہ اسکو بھی برداشت نہ کر سکے کہ ابوبکر قطیعی ہی پر الزام رکھتے ہوئے بھی، اس کتاب میں کسی موضوع حدیث کا وجود بھی تسلیم کیا جائے، چنانچہ حافظ ابن حجر[3]

---

[1] ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی الجوزی۔ ولادت ۵۰۸ھ سے ۵۱۰ھ تک کے اندر، وفات ۵۹۷ھ۔

[2] حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی۔ ولادت ۷۲۵ھ۔ وفات بروایات صحیحہ ۸۰۶ھ ان کی کتاب "

[3] "حدیث" مشہور و معروف ہے۔

Marfat.com

متوفی ۸۵۲ھ جو خود اپنی کتاب لسان المیزان ج ۲ ص ۱۳۷ میں ابن المذہب ہی کے ترجمے کے آخر میں ابن المذہب اور ان کے شیخ ابوبکر قطیعی دونوں کو غیر متقن قرار دیتے ہوئے امام ذہبی کا قول نقل کر رہے ہیں کہ "اسی لئے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہوگئیں، جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے، نہ اسناد ہی"۔ انھیں ابن حجر نے ابن جوزی کے اقوال کے جواب اور مسند احمد کی حمایت میں ایک کتاب ہی لکھ ڈالی جس کا نام القول المسدد فی الذب عن مسند احمد ہے، اس میں اُن تمام حدیثوں کو جنھیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی موضوع قرار دیا تھا، صحیح ہی نہیں بلکہ بعض کو تو متواتر یا قریب متواتر تک بزعم خود ثابت کر دکھایا ہے۔

اخی المکرم مولانا عبید اللہ الاجمری مدرس سینیر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ابن حجر کی کی اس بے جا حمایت کا ذکر آیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان میں کسی ایک حدیث کو بھی اب پھر کوشش کر کے موضوع ثابت کر دیجئے اور ابن حجر کے دلائل کو باطل کر دکھائیے تو میں جانوں"۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپ ہی ان میں سے کسی حدیث کو چُن دیجئے"۔ بھائی صاحب مرحوم و مغفور نے "سُدّوا ابواب المسجد الا باب علی" والی حدیث پیش کی کہ "اس کو ابن جوزی و عراقی دونوں ہی نے موضوع قرار دیا ہے اور ابن حجر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اس کو قریب بتواتر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے۔ آپ ابن حجر کے دلائل کو غلط ثابت کر کے اس حدیث کو واقعی موضوع اور حقیقتاً شیعوں کا افترا ثابت کر دکھائیے"۔ تو توفیق الٰہی سے ایک ہفتہ کے اندر خود ابن حجر ہی کی کتابوں سے ابن حجر کے اقوال و دلائل کی دھجیاں اڑا کر [illegible] حدیث درحقیقت موضوع ہی ہے۔ بھائی صاحب ممدوح میرے مختصر رسالے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے بڑی داد دی اور ابن حجر کی اس بے جا حمایت پر سخت متأسف ہوئے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

**اسناد مسند احمد** — اس مسند کے اسناد جہاں کہیں ملتے ہیں، اسی سلسلۂ روایت سے ملتے ہیں [illegible] الرصافی ہی سے دوسرے مختلف لوگ روایت کرتے ہیں اور حنبل بن عبد اللہ الرصافی تنہا اس کو شیخ ابو القاسم ہبۃ اللہ بن محمد بن عبد الواحد[1] ابن احمد بن الحصین الشیبانی سے کرتے ہیں اور وہ تنہا ابو علی الحسن بن علی بن محمد التمیمی الواعظ المعروف ب ابن المذہب سے وہ تنہا ابوبکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک القطیعی سے، وہ تنہا عبد اللہ بن الامام احمد سے، وہ تنہا اپنے والد ماجد امام احمد بن محمد بن حنبل سے۔

مسند احمد کے تمام قدیم و جدید، قلمی و مطبوعہ نسخوں کو دیکھ [illegible] ہے یہ اخبرنا کہنے والے کون ہیں، واللہ ہی کو معلوم۔ ممکن ہے کہ اس تتبع [illegible]

---

[1] مسند کے موجودہ مطبوعہ مصری نسخے میں یہاں [illegible]

مگر حنبل بن عبداللہ الرصافی اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ کا حال مجھ کو باوجود جستجو کے رجال کی کسی کتاب میں کہیں نہیں ملا۔ مگر ممکن ہے کہ طبقات الحنابلہ وغیرہ میں کہیں مذکور ہوں، مگر اتنا ضرور ہے کہ حنبل بن عبداللہ اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ ان دونوں کے نام صرف اسی مسند ہی کے سلسلۂ اسناد میں آتے ہیں۔ اس کے سوا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ وفیہ ما فیہ۔

ہرکیف ان کے بعد ابن المذہب ہی کا نام آتا ہے تو اب ابن المذہب کا حال سنئے۔

**ابن المذہب۔** ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے شیخ ابن المذہب یعنی الحسن بن علی بن محمد ابوعلی بن المذہب الواعظ التمیمی البغدادی۔ ابوالقاسم ہبۃ اللہ کی طرح یہ واحد راوی اس پورے ذخیرۂ روایات یعنی مکمل مسند احمد کے ہیں۔ یہی تنہا اس مسند کی روایت ابوبکر قطیعی سے کرتے ہیں اور ابوبکر قطیعی عبداللہ سے، وہ اپنے والد امام احمد سے۔

امام ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں ان کا مفصل حال لکھتے ہیں۔ دونوں ہی ان کے متعلق خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "ابن المذہب کا ابوبکر قطیعی سے مسند احمد کا سننا تو صحیح[۱] ہے مگر پوری کتاب کا نہیں۔ بعض اجزا کا سننا ثابت نہیں۔ مگر ابن المذہب نے اُن غیر مسموعہ اجزا کو بھی مسموعہ کے ساتھ ملا لیا تھا اور امام احمد کی کتاب الزہد کو دیکھ کر اس کی بھی روایت کرنے لگے، حالانکہ اس کا اصل نسخہ ان کے پاس نہ تھا۔ خود اپنے ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے سے روایت کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ محلِ حجت نہیں۔"

ذہبی و ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن المذہب ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور نواسی سال کی عمر پاکر ۴۴۴ھ میں وفات پائی۔ مسند فضالہ بن عیاض اور مسند عوف بن مالک، ابن المذہب کے نسخۂ مسند میں نہ تھے۔ اسی طرح مسند جابر کی وہ بعض حدیثیں بھی نہ تھیں، جن کو حرّانی[۳] نے قطیعی سے روایت کیا ہے۔"

پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا معترفانہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ "جب ایک شخص بقول خطیب کسی کتاب کی روایت کے سلسلے میں اپنا نام جوڑ سکتا ہے، تو یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی مسند فضالہ و مسند عوف اور مسند جابر میں کی چند احادیث کا الحاق بھی (اپنی طرف سے) کر لیا ہوگا۔"

---

[۱] اگر ذہبی و ابن حجر اتنا نہ لکھیں اور اس سماعت کی صحت تسلیم نہ کریں تو پھر مسند احمد کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے، اسلئے اتنا اقرار مجبوراً ضروری تھا۔ اس کے بعد "مگر پوری کتاب کا نہیں" یہ فقرہ بے لوثی و حق گوئی ثابت کرنے کے لئے لکھ دینا لازمی تھا۔

[۲] اس کا اصل نسخہ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ یہ پوری کتاب مجرد ابن المذہب اور ان کے رفقا کی تصنیف کردہ تھی، جس کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر امام احمد کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں "اس لئے وہ محلِ حجت نہیں" تو پھر اور کس کی روایت سے کتاب الزہد محلِ حجت ہو سکے گی؟ دنیا میں ہے کوئی؟ جو ابن المذہب کے علاوہ کسی اور کی روایت سے کتاب الزہد کو پیش کر سکے۔

[۳] حرّانی سے مراد ابوشعیب عبداللہ بن الحسن حرّانی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود ابن حجر و ذہبی کی تصریحات سے ثابت ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کا لقب ایسا ہے، جس کو کہا جا سکے کہ شاید وہ ہو۔ تفصیل دیکھئے۔

Marfat.com

اتنا لکھ کر پھر حافظ ابن حجرؒ، امام ذہبی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "شجاع ذہلی نے کہا ہے کہ ابن المذہب روایتوں میں معتمد علیہ نہ تھے۔ سلفی نے کہا یہ ہمیشہ محلِ گفت گو رہے۔ کتاب الزہد کے معدوم[1] ہو جانے کے بعد بغیر اصل کتاب کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کتاب الزہد کی روایات کیا کرتے تھے۔ خطیب نے کہا کہ ابن المذہب نے ایک ایسی حدیث ابوبکر قطیعی سے روایت کی، جس کو اُن سے ہرگز نہیں سنا تھا۔"

اس پر ذہبی نے ابن المذہب کی طرف سے یہ تاویل کی ہے کہ شاید وجادۃ اجازت بنا لی ہو یعنی وہ حدیث کہیں قطیعی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہو، یا کسی اور جگہ قطیعی کی طرف منسوب نظر آئی ہو اور انھوں نے اسی پا لینے کو اجازت قرار دے دی ہو اور حدثنا ابوبکر قطیعی کہہ کر روایت کرنے لگے ہوں۔ تو کیا یہ بھی جھوٹ نہ ہوا؟

پھر ابن حجر لکھتے ہیں "خطیب بغدادی نے یہ بھی بیان کیا کہ ابن المذہب نے ہم لوگوں سے بواسطہ دارقطنی و [illegible] وراق و ابوعمرو بن مہدی ایک مرتبہ ایک حدیث محاملی سے روایت کی، تو میں نے کہا کہ یہ حدیث تو ابوعمرو بن مہدی کے پاس نہ تھی۔ تو ابن مذہب نے ابن مہدی کے نام پر ہاتھ مار کر کہا کہ بہتیری حدیثیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں جن میں نام غیر منسوب ہوتے ہیں تو میں اُن کو اپنی طرف سے منسوب کر لیا کرتا ہوں۔ اس طرح اصل روایت میں وہ نسبت ملحق ہو جایا کرتی ہے۔"

اتنا لکھ کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن مذہب کے معصر اُن کی ان حرکتوں کو بہت ناپسند کرتے تھے مگر یہ کبھی ان حرکتوں سے باز نہ آئے[2]"

ان تمام باتوں کو لکھ کر اخیر میں حافظ ابن حجر پھر ذہبی کا آخری قول نقل فرماتے ہیں کہ "ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ ابن المذہب ایک غیر متقن آدمی تھے اور انھیں کی طرح انکے شیخ ابوبکر قطیعی بھی۔ اور اسی وجہ سے مسند میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہو گئیں جن کی نہ تو متن محکم ہے نہ اسناد ہی۔ واللہ اعلم۔" (دیکھئے لسان المیزان جلد ۲ صفحہ [illegible] میزان الاعتدال جلد اول صفحہ ۲۲۰)

یہی ابن المذہب ہیں جو ابن مالک ابوبکر القطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ہیں۔ ان کے سوا کوئی دوسرا راوی مسند

---

[1] کتاب الزہد کا وجود ہی پہلے کہاں تھا کہ معدوم ہوتی؟ اس کو تو نہاں خانۂ عدم سے ساحتِ وجود پر خود ابن مذہب ہی نے پیش کیا [illegible] اپنے نام سے پیش کرتا تو مانتا ہی کون؟ [illegible] اسنے اسکو امام احمد کی طرف منسوب کر دیا۔ [illegible] اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا [illegible] بعد اُن کی اس تصنیف [illegible]

[2] یہی وجہ ہے کہ باوجود اسکے کہ ابن المذہب مسند احمد اور کتاب الزہد کو روایت کرتے ہوئے مگر [illegible] ابو القاسم ہبۃ اللہ نے امام احمد کی [illegible] انکی مسند احمد یا کتاب الزہد کی سند [illegible] کیا [illegible] زبان سے جھٹلایا نہیں مگر [illegible] کتاب الزہد کی سند ان سے [illegible] امام احمد کی کتابیں [illegible] خطیب جیسے محدثوں کے [illegible] کی طرف سے بے اعتنائی [illegible] پیدا کر دیں۔

احمد کا دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ بھی تنہا جو روایت کرتے ہیں تو صرف ابن مالک ابوبکر قطیعی ہی سے۔ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں جو اتنا بھران کے متعلق لکھا ہے، وہ بھی مجبوراً۔ اس لئے کہ کہاں تک چھپاتے اور اگر ان کے تمام حالات واضح کر دیتے تو پھر مسند احمد کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

ابھی ابھی ابن المذہب کے آغاز تذکرہ میں آپ نے پڑھا کہ "ابن المذہب کے نسخہ مسند احمد میں مسند جابر کی بعض حدیثیں نہ تھیں جن کو حرّانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر قطیعی سے حرّانی (یعنی ابوشعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی) نے بھی مسند احمد کی روایت کی ہے، تو قطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ابن المذہب نہ ہوئے بلکہ دوسرے راوی حرّانی بھی ہیں[۵۱]۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح کی داؤ گھات چالاک محدثین کو خوب آتی ہے کہ بعض غلط باتیں ضمنی طور سے کسی دوسرے تذکرے میں کہہ جاتے ہیں، تاکہ خارج از مبحث بات ہونے کی وجہ سے اس غلط بات کی تغلیط کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور اس طرح وہی غلط بات آئندہ کے لئے صحیح بن جائے۔ بعد کو جب یہی بات جو اسوقت خارج از مبحث ہے، خود موضوع بحث بنائی جائے گی، تو یہ تحریر اسوقت ثبوت میں پیش کر دی جائے گی کہ فلاں جگہ اس کا ذکر آچکا ہے۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو اسی وقت اس کی تردید کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حرّانی کا ابوبکر قطیعی سے پوری مسند احمد یا اس کے کسی جز کا بھی بلکہ کسی ایک حدیث کا بھی روایت کرنا کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۷۱ میں حرّانی کا ترجمہ لکھتے ہیں، مگر ان کے شیوخ میں ابوبکر قطیعی کا نام نہیں لکھتے اور نہ مسند احمد ہی کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی اُمید بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک تقریباً نوّے برس کا بوڑھا[۵۲] آدمی ایک بائیس برس کے چھوکرے سے مسند احمد کی سماعت کرنے جائے دو چار حدیثیں نہیں بلکہ تقریباً ہزار حدیثیں۔ اگر کہا جائے کہ جس سال حرّانی جنت کو سدھارے، اسی سال نہیں، بلکہ اس سے چند سال پیشتر ان کی اتنی عمر شاید ہوگئی ہو، تو چند سال پیشتر تو قطیعی صاحب اور بھی زیادہ ہی کم سن اور نوعمر ہوں اور پھر حرّانی نے تو عبداللہ بن احمد کا

---

[۵۱] تعجب ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر دونوں ہی ابن المذہب کو مسند احمد کا ابوبکر قطیعی سے تنہا راوی بھی لکھتے ہیں، پھر حرانی کو بھی قطیعی سے احمد کا راوی بتاتے ہیں۔ اگر دونوں قطیعی سے مسند کی روایت کرتے تھے تو پھر ابن المذہب تنہا راوی کس طرح ہوئے۔

[۵۲] ابوشعیب الحرانی کے متعلق ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۵ھ میں ۸۹ برس کی عمر پاکر وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے ان کی عمر ۸۹ برس کی نہیں ہوتی، بلکہ اس حساب سے ان کی عمر ۱۳۹ سال کی ہو جاتی ہے۔ ابن حجر یہ بھی لکھتے ہیں کہ احمد بن کامل کا قول ہے کہ حرانی نے ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس لئے یقیناً سال ولادت ہی غلط ہے۔ غالباً ۲۰۳ھ یا ۲۰۶ھ میں حرانی کی ولادت ہوئی ہو۔ ۸۹ سال کی عمر پاکر ۲۹۲ھ یا ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مگر بہرحال یہ عبداللہ بن احمد سے عمر میں بڑے تھے اور خاص امام احمد سے مسند کی روایت کر سکتے تھے اور اگر امام احمد یا عبداللہ کے وقت میں مسند کا وجود ہوتا، تو قطیعی تو کیا حرانی سے بھی زیادہ معتمد علیہ محدثین مسند کی روایت امام احمد اور نیز عبداللہ سے کرنے والے دنیا میں مشہور و معروف ہوتے۔

Marfat.com

قطیعی سے کہیں زیادہ پایا، بلکہ خاص امام احمد یا عبداللہ ہی سے مسند احمد کی سند لینے میں کیا دشواری تھی جو ایک کم سن چھوکرے غیر متقن سے مسند کی سند لیتے؟

مگر ابوبکر قطیعی تو حرانی کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ بائیس ہی سال کے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ قطیعی کی ولادت ۲۷۴ھ کی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، تو اگر خود قطیعی حرانی سے کچھ حدیثیں روایت کرتے، جب بھی شبہ ہوتا کہ انھوں نے تو حرانی کے اختلاط حواس کا زمانہ دیکھا، ان کی سماع صحیح ہے یا نہیں۔ نہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ حرانی نے اس کم سنی میں ایک نوجوان سے دو چار حدیث نہیں بلکہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ جا کر اول سے آخر تک سنا یا سنایا، اور یہ واقعی اگر ایسا تھا تو پھر حرانی کے ترجمے میں ابن حجر یا امام ذہبی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ انھوں نے قطیعی سے مسند احمد کی [illegible] میں سند لی یا یہ قطیعی سے مسند کی روایت کرتے ہیں۔ پھر ابن سمعانی نے بھی اپنی کتاب الانساب میں حرانی کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی یہ نہیں لکھتے کہ مسند احمد کی یہ قطیعی یا کسی سے بھی روایت کرتے ہیں یا قطیعی سے کوئی بھی حدیث کی، غرض حرانی کا مسند احمد سے درحقیقت کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ مسند احمد سے بالکل اسی طرح بے خبر ہیں، جس طرح دوسرے محدثین جو قطیعی سے متقدم تھے، مسند سے بے خبر تھے، اس لئے کہ قطیعی کی ولادت سے پہلے مسند احمد کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

**ابوبکر قطیعی** ۔ احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک بن شعیب ابوبکر القطیعی ۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ھ میں وفات پائی چونکہ یہی مسند احمد کے تنہا راوی ہیں، اس لئے اگر ان کی توثیق نہ کی جاتی تو پھر یہ ذخیرہ روایت کسی کا بھی نہ رہتا۔ اسی لئے امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد اول ص۴۲ میں ان کے ترجمے کے ضمن میں اتنا تو اعتراف [illegible] کہ ابن الصواف ان کو حدیث میں کچھ یونہی سا سمجھتے تھے اور مسند احمد کے بارے میں ان کے بعض اصولوں [illegible] برقانی نے کہا کہ ان کی کتاب کا کچھ حصہ غرق ہو گیا تھا، تو ایک دوسری کتاب جس کے متعلق ان کی سماع نہ تھی [illegible]

---

ابن المذہب کے ترجمے میں ابن حجر لسان المیزان [illegible]

امام ذہبی اور ابن حجر [illegible]

وہ دوسری کتاب [illegible]

Marfat.com

انھوں نے حدیثیں نقل کرلیں، اس وجہ[1] سے محدثین کی ان پر چشمکیں تھیں۔" اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ "ورنہ (یعنی اگر
یہ سب باتیں نہ ہوتیں، تو) وہ فی نفسہٖ ثقہ ہیں۔" پھر خود لکھتے ہیں کہ "میں خود ان سے سخت متنفر اور بعید خفا تھا مگر معلوم[2] ہو گیا
نہیں یہ سچے آدمی ہیں، انکی سماع میں شک نہیں کیا جا سکتا اور میں نے سنا ہے کہ وہ مجاب الدعوۃ بھی تھے۔" ان کی
توثیق کی اتنی کوشش صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے ہے، چنانچہ ابن حجر، امام ذہبی کی اتنی عبارت نقل کر کے لسان
المیزان جلد ۱ صفحہ ۱۴۵ میں لکھتے ہیں کہ "ذہبی نے جو ابن فرات (کی جرح) پر انکار کیا ہے، اس سے تعجب ہے، کیونکہ ابن فرات
ہی کچھ اس (جرح) میں متفرد نہیں ہیں، بلکہ خطیب نے بھی اس کو احمد بن احمد المسیبی کے ترجمے میں لکھا ہے۔ پھر آگے
چل کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ "اور ذہبی سے تعجب ہے کہ ابن الفرات کے قول کی تو (یہاں) تردید کرتے ہیں مگر انھیں
قطیعی کے شاگرد خاص) حسن بن علی التمیمی (ابن المذہب) کے ترجمے کے آخر میں خود لکھتے ہیں (یعنی وہ جو ہم نے ابن
المذہب کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ابن حجر نے ابن المذہب کے متعلق امام ذہبی کا قول نقل کیا ہے) کہ یہ بات[3] ظاہر
ہے کہ ابن المذہب ایک غیر متقن شیخ تھے، اور انھیں کی طرح اُن کے شیخ ابن مالک (القطیعی) بھی اور اس وجہ
مسند امام احمد میں ایسی چیزیں واقع ہو گئی ہیں، جن کی نہ متن ہی درست ہے نہ اسناد ہی واللہ اعلم۔"

غرض ذہبی اور ذہبی سے زیادہ ابن حجر، قطیعی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں، مگر دونوں ہی سند کی وجہ سے مجبور ہیں اس
لئے باوجود دلی تنفر کے کسی نہ کسی حد تک قطیعی کی توثیق ضرور کئے جاتے ہیں تاکہ مسند احمد کا بھرم رہ جائے۔ اگر مسند کا خیال
نہ ہوتا، تو خدا جانے یہ لوگ قطیعی اور ابن المذہب دونوں کے متعلق کیا کیا لکھتے۔

## قطیعی کے شیوخ دراصل قطیعی کے شیوخ نہ تھے

قطیعی کے شیوخ میں عبداللہ بن احمد کے سوا تین چار امام
بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں جن میں اکثریت وضاعین
کذابین کی ہے۔ مثلاً محمد بن یونس السامی الکدیمی وغیرہ۔ مگر تعجب یہ ہے کہ جہاں ان لوگوں کے تلامذہ کی فہرست ہے

[1] محدثین کی چشمکیں تو دراصل اس مسند احمد کے اختراع واختلاق ہی کی وجہ سے تھیں، مگر برقانی نے پردہ ڈالنے کیلئے کچھ حصہ کتاب کے غرق ہو جانے
چشمک کا سبب قرار دے دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے ان سے مسند احمد کے اصل نسخہ کا مطالبہ کیا، تو انھوں نے کہا وہ فلاں سفر میں غرق ہو گیا
میں نے اپنی یاد سے اور کچھ ردّی پرزے پر جو مسودہ تھا اس سے مرتب کر لیا، اسی لئے انکے معاصرین نے اس مسند کو مشکوک قرار دیا اور ان پر چشمکیں
اتنے بڑے اہم واقعہ کو برقانی نے کس قدر ہلکا کر دکھایا، صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے۔

[2] کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ اسکے ذکر کی ضرورت نہ تھی، مگر مجھ کو وہ ذریعہ معلوم ہے، یعنی یہی کہ دوسرے ہم عصر محدثین نے کہا کہ اگر ان کی سماع کو
معتبر نہیں مان لیتے ہیں، تو پھر مسند احمد جیسا ذخیرۂ روایات ہاتھ سے جاتا ہے، اسلئے جسطرح ہم لوگوں نے انکی سماع صحیح مان لی ہے آپ بھی مان لیجئے اس تنفر
اور خفگی کو دور کیجئے اور پھر مسند کے پروپاگنڈا کرنے والوں نے قطیعی کے ولی اور مجاب الدعوات ہونے کا بھی پروپاگنڈا کر رکھا تھا۔

[3] میزان الاعتدال جلد ۱ صفحہ ۲۲۷۔

Marfat.com

قطیعی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قطیعی کی اتنی عمر ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں سے یہ حدیثیں سنیں، اور روایتیں اخذ کر سکیں۔ البتہ قطیعی کے حقیقی استاد اور رفیقِ مذہب و مسلک ابو بکر شافعی کا نام ان لوگوں کے تلامذہ میں آتا ہے۔ جس طرح عبداللہ بن احمد کے ساتھ بھی دراصل ابو بکر شافعی ہی رہے اور ان کے ساتھ بچوں کی طرح یہ قطیعی صاحب بھی لگے لپٹے رہتے تھے۔ ان کو جو کچھ بھی ملا۔ ابو بکر شافعی ہی سے ملا، مگر یہ درمیان سے ابو بکر شافعی کا نام اڑا کر اپنی نسبت کو بلاواسطہ ابو بکر شافعی کے شیوخ سے جوڑ دیا کرتے تھے، اسی لئے ان کے اکثر شیوخ ایسے ہیں [illegible] شباب ہی کے وقت دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ غرض یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ دراصل قطیعی کے استاد [illegible] بھی تھے، صرف ابو بکر شافعی ہی تھے اور کوئی بھی نہیں۔ نہ عبداللہ بن احمد نہ کوئی اور [illegible] کے ترجمے میں آتی ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ابھی عبداللہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

**عبداللہ بن امام احمد بن حنبل۔** ان کی ولادت [illegible] کی ہے اور [illegible] میں انھوں نے وفات پائی [illegible] امام احمد کی وفات [illegible] میں ۱۲ ربیع الاول کو ہے، یعنی تقریباً آغاز سال ہی میں، اور عبداللہ کی پیدائش [illegible] میں ہے، اس لئے امام احمد کی وفات کے وقت عبداللہ زیادہ سے زیادہ [illegible] برس کے تھے۔

اور ابو بکر قطیعی کی عمر عبداللہ کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ [illegible] سال کی تھی۔ [illegible] سکتا ہے کہ یہ چند سال عبداللہ بن امام احمد کی خدمت میں شاید رہے ہوں، مگر اس عمر میں ساٹھ ہزار [illegible] کا سننا اور اخذ کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔ کوئی صاحب انصاف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

## قطیعی دراصل ابو بکر شامی کے چیلے تھے

البتہ یہ بچپن ہی سے ابو بکر شافعی کے ساتھ لگے رہتے [illegible] عبداللہ ابن احمد کے شاگردوں کی جماعت میں داخل [illegible] اور ابو بکر شافعی کی وفات کے بعد یہ بذات خود عبداللہ بن احمد سے تلمذ کے مدعی ہو گئے [illegible] کے ساتھ انکو بھی عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں شمار کر لیا۔ اس وقت مسند احمد کا کوئی وجود تو تھا نہیں کہ واقعی مسند احمد کو کوئی عبداللہ سے سنتا، یا ان کو سناتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ ان کی عمر عبداللہ کے وقت میں اتنی تھی یا نہیں کہ

## قطیعی نے عبداللہ بن احمد کا وقت نہیں پایا

ساٹھ ہزار روایات کا مجموعہ یہ عبداللہ سے اخذ کر سکیں [illegible] کے اجتماعات [illegible] شاید آخر وقت میں عبداللہ بن احمد سے سنی ہوں گی، اس وجہ سے یہ تلمذ کا دعویٰ کر رہے ہیں [illegible] خواہ مخواہ اتنی سی بات کو جھٹلاتا، جس کے امکان کا قرینہ بھی موجود تھا۔ ہاں اگر یہ عبداللہ بن احمد سے [illegible] سامنے مسند احمد کا نام لیتے، جب البتہ اکابر محدثین ان کی خبر لینے کو تیار ہو جاتے اور پوچھتے کہ [illegible] ہے اور تم کہاں سے لائے؟ ہم لوگوں کو تو یہ نعمت [illegible] عبداللہ سے [illegible]

Marfat.com

اور ساری زندگی حدیث کی خدمت میں گزاری اور گزار رہے ہیں اور تم کو ہم سب لوگوں سے چھپا کر بلا کسی استحقاق کے عبداللہ بن احمد نے اتنی بڑی دولت چپ چاپ سونپ دی! آخر تم میں کون سے سُرخاب کے پر لگے تھے۔

یہ مسند احمد کب اور کس طرح وجود میں آئی، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ خاص مسند احمد کے ذکر میں ابھی سلسلے کی آخری کڑی یعنی امام احمد بن حنبل کا مختصر سا ترجمہ سُن لیجئے۔

## امام احمد بن محمد بن حنبل

ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی۔ ۷۷ سال کی عمر پائی۔ امام شافعی، ابن مہدی، ابوالولید، عبدالرزاق، وکیع، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون سے یہ خود بھی روایت کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ بھی ان سے روایت کرتے ہیں یعنی یہ سات آدمی ان کے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ اور قتیبہ، داؤد بن عمرو اور خلف بن ہشام ان سے عمر میں بڑے تھے، مگر ان کے تلامذہ میں تھے اور احمد بن الحواری اور یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، حسین بن منصور، زیاد بن ایوب، ابو قدامۃ السرخسی، محمد بن رافع، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور عبدالرحمٰن بن ابراہیم جن کا لقب "رحیم" تھا، یہ نو آدمی ان کے دونوں صاحبزادے بھی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان اکابر محدثین کے علاوہ ابوبکر الاثرم، بقی بن مخلد، حرب الکرمانی، حنبلی بن اسحاق، شاہین بن السمیدع اور میمون بھی انکے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ پھر امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد بذات خود بلا واسطہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں اور بواسطہ عبدالرحمٰن اسود بن عامر الشافعی ملقب بہ شاذان سے بھی۔ امام احمد کے آخری شاگرد، جو امام احمد کے بعد عبداللہ بن احمد کے بھی شاگرد ہوئے۔ مشہور محدث ابوالقاسم البغوی ہیں اور ان بزرگواروں کے علاوہ ایک جماعت کثیر امام احمد کے تلامذہ میں ہے جن میں سے بیتیروں کے نام تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں مذکور ہیں۔

سلسلہ اسناد کے تمام افراد کو جان لینے کے بعد اب خاص مسند احمد کے وجود اور اسکی نوعیتوں پر غور فرمائیے۔

## مسند احمد

اب یہ چیز ہر صاحب عقل بغیر ذہن پر زور ڈالے سمجھ سکتا ہے اگر امام احمد بن حنبل اپنی زندگی میں کوئی مجموعہ اپنی حدیثوں کا قلم بند کر جاتے یا اپنے صاحبزادے عبداللہ سے لکھواتے تو جس طرح امام مالکؒ سے ان کی موطا ان کے سینکڑوں شاگردوں نے سُنی۔ اور ہر سننے والا ان سے موطا کی روایت کرتا تھا، اسی طرح امام احمد کے مسند کو بھی عبداللہ کے علاوہ ان کے دوسرے تلامذہ بھی ضرور امام احمد سے سنتے اور اسکی روایت کرتے۔ اتنے بڑے بڑے محدثین، جو نہ صرف امام احمد کے شاگرد تھے، بلکہ استاد بھی تھے، یا خاص اقران میں تھے یا عمر میں بڑے تھے یا اپنے علم و فضل کی وجہ سے علم حدیث میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب امام احمد کے شاگرد تھے، آخر یہ سارے کے سارے اس مسند ضخیم کے وجود سے بالکل بے خبر کیوں رہے اور امام احمد ان سب کے سب سے اپنی اس کتاب کو پوشیدہ کیوں رکھا؟ یہاں تک کہ اپنے دوسرے بیٹے صالح کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم ہی رکھا! تعجب ہے کہ امام بخاری اپنی تاریخ میں امام احمد کا ذکر خیر کرتے ہیں، مگر

Marfat.com

کا کوئی ذکر فرماتے ہیں نہ کتاب الزہد کا۔ آخر امام احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ اشاعت حدیث و اشاعت دین کے عوض اپنے تمام شاگردوں سے بالکل کتمانِ حدیث و کتمانِ علم فرمایا اور صرف اپنے ہی ایک صاحبزادے عبداللہ کو اس کتاب مکنون کا موم راز بنایا؟ آخر دوسرے لوگوں سے اس اخفاء و کتمان کی کیا ضرورت پڑی؟ کیا ان کے تلامذہ میں سے عبداللہ کے سوا کوئی بھی اس امانتِ عظمیٰ کا امین نہیں ہو سکتا تھا؟

**عبداللہ کے تلامذہ ابوالقاسم البغوی** اسی طرح عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں سے ابوالقاسم البغوی جنکی ولادت ۲۱۲ھ کی ہے یعنی عبداللہ سے ایک سال بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد کے آخری شاگرد تھے یعنی عبداللہ کے خواجہ تاش استاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی اور خود مشہور بلند پایہ محدث تھے بشکریہ میں عبداللہ بن احمد کے ستائیس سال بعد وفات پائی۔

**سلیمان بن حرب الطبرانی** سلیمان بن احمد بن ایوب اللخمی الطبرانی جن کی ولادت ۲۶۰ھ کی اور وفات ۳۶۰ھ میں ہے پورے سو برس کی عمر پائی، عبداللہ کی وفات کے وقت تیس برس کے تھے اور قطیعی سے تیرہ سال بڑے تھے اور بقول ابن حجر ۱۲ سال کی عمر سے حدیثیں سننے لگے اور برابر عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگے رہے۔

**احمد بن کامل بن شجرہ** احمد بن کامل بن شجرہ القاضی البغدادی انکی ولادت بھی ۲۶۰ھ ہی کی ہے۔ نوے سال کی عمر پاکر ۳۵۰ھ میں راہی جنت ہوئے۔ ابن حجر نے انکو کان من اوعیۃ العلم (علم کا ظرف) لکھا ہے۔

**محمد بن مخلد** محمد بن مخلد بن حفص، جنھوں نے کافی عمر پاکر ۳۳۱ھ میں وفات پائی، دارقطنی جیسے مشہور محدث کے شیوخ میں تھے اور قطیعی سے کافی بڑے تھے۔ عمر میں بھی اور علم و فضل میں بھی۔ ابن حجر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم تھے۔ وغیرہم۔

غرض ایسے تلامذہ کے ہوتے عبداللہ بن احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ ایسی کتاب مکنون مسند امام احمد جس کو امام احمد نے اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر صرف انھیں کو بطور ایک پوشیدہ راز کے عطا فرمایا تھا۔ ایسی نعمت عظمیٰ کو انھوں نے بھی اپنے شاگردوں سے چھپا کر بلا استحقاق دیا بھی تو صرف ایک سترہ سال کے چھوکرے ابوبکر قطیعی کو۔

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

جس طرح امام احمد نے اپنے دوسرے تمام تلامذہ سے حتیٰ کہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی اس سند کو پوشیدہ رکھا بالکل اسی طرح عبداللہ نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے اس باپ کی دی ہوئی نعمت کو پوشیدہ ہی رکھا اور ایک گھر سے باہر کے کم عمر چھوکرے کے حوالے کر دیا۔

امام احمد کو تو شاید اولاد کی محبت نے اس رازداری پر مجبور کر دیا ہو اور دوسرے بیٹے سے شاید وہ کچھ خفا رہتے ہوں، اس لئے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف ایک ہی بیٹے کو دے گئے اور دوسرے کو بالکل محروم کر دیا۔ مگر یہ

Marfat.com

ابوبکر قطیعی جیسے سترہ سال کے چھوکرے سے عبداللہ کو کون سا رشتۂ محبت تھا کہ عبداللہ نے اپنے تمام برابر والے اور علم و فضل میں مستند شاگردوں پر اس چھوکرے کو ترجیح دی؟ اور سب کو اس نعمت سے محروم ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر رکھا کسی سے کہا تک نہیں کہ میرے پاس والد ماجد کی ایک کتاب ہے۔

پھر ابوبکر قطیعی کے تلامذہ میں بھی ابن المذہب کے علاوہ کچھ لوگ مثلاً حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن اسحٰق صاحب الحلیۃ اور علی بن الحسن[1] الصقلی القزوینی وغیرہما بھی تھے۔ مگر ابن المذہب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس مسند کی روایت نہیں کرتا آخر اسکی کیا وجہ ہے؟

ابن المذہب کے بھی دو چار شاگرد ضرور ہوں گے، مگر ابن المذہب سے بھی صرف ابوالقاسم ہبۃ اللہ ہی تنہا اس کی روایت کرتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔

اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ صاحب کے بعد صرف حنبل بن اسحٰق الرصافی ہی اس کو تمام لئے پھرتے ہیں یعنی چھٹی پشت سے اس مسند کی روایتی نسل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ ادھر اُدھر پھیلنے لگتی ہیں، مگر پانچ پشت اوپر تک برابر مکمل رازداری اور پورے اخفا و کتمان کے ساتھ ایک ایک ہی شخص ہر دور میں اس مسند کی تنہا راوی چلا آتا ہے۔ اگر کوئی حدیث اس طرح کی ہو، جس کا راوی مسلسل ہر عہد میں ایک ایک ہی شخص رہا ہو، اور بات ایسی ہو، جس کے جاننے والوں کے لئے عقل تعدد چاہتی ہو، تو ایسی حدیث احاد قرار دیکر ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دے دی جاتی ہے اور یہاں ساٹھ ہزار حدیثوں کا پورا مجموعہ پانچ پانچ دور تک ایک ایک ہی شخص وساطت سے چلا آرہا ہے، مگر کسی محدث کے منہ میں زبان نہیں کہ اس پورے مجموعہ کو احاد کہہ کر ٹھکرادے، خصوصاً جب اس کے دو آخری راوی بالکل مجہول الحال ہیں اور اس کے اوپر کے دو راوی ابن المذہب اور ابوبکر قطیعی غیر اور ناقابل احتجاج۔

## سلسلہ مسند کی اصلی اور ابتدائی مگر پوشیدہ کڑی

**ابوبکر شافعی**۔ عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور تمام ائمہ رجال ابوبکر شافعی کا نام لکھتے ہیں اور ضرور عبداللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک لگے لپٹے رہے، ابن حجر ان کا مطلق ذکر ہی نہیں کرتے، البتہ امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۹۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ پہنچ اور نہ ان کو کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق اتنی کرید کرتے۔ ابن حجر غالباً ان کی حقیقت سے واقف ہو گئے تھے، اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا مناسب سمجھے۔ نہ تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان المیزان تقریب میں، نہ تعجیل المنفعۃ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دولابی نے بھی الاسماء والکنی میں ان کا ذکر نہ کیا۔ البتہ سمعانی نے انکا

[1] علی بن الحسن الصقلی القزوینی کا ترجمہ لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۲۲۰ میں ہے۔ ۵۰۳ھ میں وفات پائی واعظ تھے۔

الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام ختلی میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس لئے ختلی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی، یعنی کبھی یہ کبھی وہ لکھا ہے کہ عمر زیادہ پائی، یہاں تک کہ دارقطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ لکھا ہے کہ ابو علی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سبِ صحابہؓ لکھا ہوا پایا تو انھوں نے اپنی برکت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے، ۳۵۴ھ میں مرے۔ دارقطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔

**محمد بن عبد اللہ بن ابراہیم ثابت**۔ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۰ میں محمد بن عبد اللہ بن ابراہیم ثابت ابوبکر البغدادی کا ترجمہ لکھا ہے اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں، مگر دارقطنی نے ان کو دجّال کہا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکر شافعی ہی ہیں۔ دارقطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی معتبر ذرائع سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی تفحص و جستجو کر کے میں جس صحیح نتیجہ پر ان کے متعلق پہنچا ہوں وہ حسب ذیل ہے۔

**موسیٰ بن سہل الوشّاء** یہ ۱۹۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۸ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشّاء تھے، جن کو عقیلی نے غیر مشہور، دارقطنی نے ضعیف اور برقانی نے قطعی ضعیف لکھا ہے۔ ابن علیہ کے سب سے آخری شاگرد تھے۔ ۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

**محمد بن شداد المسمعی**۔ جب ابوبکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الٰہی محروم ہو گئے تو محمد بن شداد المسمعی کی گود میں آ گرے اور ان سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے [illegible] اور منکر الحدیث اور دارقطنی نے ضعیف و ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

درحقیقت ابوبکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انھیں دونوں وشّاء و مسمعی کی آغوش تربیت میں [illegible] میں ابوبکر شافعی پیدا ہوئے اور ۲۷۲ھ سے وشّاء کی خدمت میں رہنے لگے، یعنی ۱۲ سال کی عمر سے۔ گزشتہ دو استادوں کے

**محمد بن سعید البورقی** علاوہ محمد بن سعید البورقی کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں۔ یہ بورقی صاحب وہی ہیں جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضاع ہیں، یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔ اور یہ محمد بن یونس

**محمد بن یونس الکدیمی** الکدیمی، جو جانے بوجھے کذاب اور افترا پرداز ہیں [illegible]

**ابوبکر شافعی کے بعض دوسرے شیوخ** ہیں اور اسی قسم کے اور [illegible] بن ابراہیم بن شنین الختلی جن کی کتاب الدیباج مشہور ہے، محمد بن [illegible] بریۃ الہاشمی، سعید بن ہاشم الطبری، ابو عمارۃ محمد بن احمد بن مہدی، محمد بن [illegible] اسمٰعیل المسمعی البصری، اور انھیں جیسے بعض دوسرے مجروحین و متروکین و ضعفاء کے سامنے بھی [illegible] کرتے رہے۔

مگر درحقیقت یہ بورقی اور کدیمی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی، جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے ماتحت با
تقسیم اسمائے صحابہؓ و اکابر تابعینؒ کرکے ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابوبکر شاف
تیار کئے گئے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آیا جایا کریں اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیں تاکہ عام
محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنبلی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنبلی نہی
بلکہ شافعی مشہور کیا، تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں، مگر یہ ابوبکر شافعی صاحب دراصل شیعہ امامیہ تھے اور تقیۃً
**ابوبکر شافعی دراصل شیعہ تھے** کو شافعی مشہور کیے رہے، اور تقیہ ہی کرکے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی
تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور اجمال کی تفصیل یوں سنئے:

**تذکرۃ الحفاظ میں ابوبکر شافعی** ان ابوبکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرما
ہیں۔ دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱۔ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ البغدادی۔ انھوں نے اہلِ سنّت کو دھوکا دینے
لئے جس طرح مسلک شافعی بظاہر اختیار کرکے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی، اسی طرح اپنی اص
کنیت جو ابوالحسن تھی، اہلِ سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابوبکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اس طرح ابوبکر شافعی ہی
لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پردادا کا اصلی نام یوسف تھا، مگر انھوں نے عبدویہ لقب
دیکر اہلِ سنت میں مشہور کیا، اسی لیے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے "محمد بن ابراہیم بن یوسف الکات
**خلاصۃ الاقوال میں ابوبکر شافعی** یکنی اباالحسن" جیساکہ "خلاصۃ الاقوال" میں علامہ حلّی مشہور محدث شیعہ نے لک
ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرماکر لکھتے ہیں کہ "قال احمد بن عبدون هو ابوبکر الشافعی مولده سنۃ ۲۶۰ الحسی
وکان علی الظاهر یتفقه علی مذهب الشافعی ویری رای الشیعة الامامیة فی الباطن وکان فیها علی المذهبی
وله علی المذهبین کتب۔ یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا[1] کہ وہ ابوبکر شافعی ہیں، انکی ولادت حسینی[2] سال کے حساب سے
میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پڑھتے، مگر باطن میں شیعہ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فق
تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔" دیکھئے خلاصۃ الاقوال صفحہ اور دوسرے شیعہ محدّث امام فن رج
**منتہی المقال میں ابوبکر شافعی** ابوعلی محمد بن اسمٰعیل بن عبدالجبار اپنی کتاب منتہی المقال میں لکھتے ہیں
"ابوبکر الشافعی هو محمد بن یوسف کذا فی المجمع فلعلّه یُنسب تارةً الی ابیه وتارةً الی جدّه وذکرہ من
ثقاتهم" یعنی ابوبکر شافعی، وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب "المجمع" میں ہے۔ شاید انکی نسبت کبھی ان کے

[1] یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کیفیت ابوالحسن ہے، جیساکہ ابتدائی ترجمہ میں علامہ حلّی نے لکھا ہے۔

[2] حسینی سال کی تفصیل میری کتاب تطہیر آیۃ التطہیر میں ہے۔ مختصراً اگلے صفحہ کے حاشیہ پر لکھئے۔

کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف" یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا، کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو ثقہ لوگوں کے طبقے میں ذکر کیا ہے۔"

**علامہ مجلسی کی الوجیزہ** علامہ مجلسی جیسے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں "محمد بن ابراہیم بن یوسف ح" شیعوں کی کتاب رجال میں کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے، وہ ممدوح کا مخفف ہے خود مصنفین کتب

**ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر التقانی** رجال شیعہ نے اس کی تصریح کر دی ہے، دیکھئے وجیزہ ص۱۶۲ مگر اسی رسالہ کے کے باب الکنیٰ میں ابوبکر شافعی کے عوض "ابوبکر التقانی" لکھ کر وہی علامت ح کی بنا دی ہے، جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے اور ابوبکر شافعی کا ذکر باب الکنیٰ میں نہیں کیا۔

**شرح تصریحات علمائے شیعہ** علامہ حلّی اور صاحب منتہی المقال نے ابوبکر شافعی کی نشان دہی کی، مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا، صاف کھا گئے، اور ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر التقانی لکھ کر اسطرح اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابوبکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابوبکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب کر دیا۔ یا ممکن ہے کہ ابوبکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہل سنت کو اپنا سلسلۂ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو۔ واللہ اعلم۔ پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوئی صرف محمد بن یوسف۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب منتہی المقال نے یہ گتھی اسطرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کے دادا کی طرف۔ مگر ان کے دادا یا پردادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود ہی رکھا تھا، اس کو ان میں سے کوئی بھی نہیں لکھتا۔ تماشہ یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا جاتا۔ صرف علامہ حلّی سال ولادت تو لکھتے ہیں، مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے، اس سے گریز کر کے ایک بالکل غیر متعارف [illegible] سال حسینی[1] کے حساب سے جس سے علمائے اہل سنت تو کجا، شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں ادل بدل شیعی علما بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے تو جواب میں کہہ دیا جائے کہ نہیں تو، شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے، چنانچہ دونوں کے نام میں ذرا سا فرق موجود ہے۔ آپ کا ابوبکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے جس کی ولادت ۲۶۰ھ کی ہے اور ہمارا ابوبکر شافعی

---

[1] سال حسینی کا حال مجھ کو اخی الاعظم حضرت مولانا قاری شاہ محمد میاں پھلواری سے اور انھوں نے حسن الملک سے معلوم ہوا رحمہما اللہ تعالیٰ جنھوں نے اس کی پوری تفصیل اپنے رسالے التطہیر من دنس ہفوات الرواۃ فی التفسیر میں لکھی ہے۔ یہاں تو اسکی طرف صرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا آغاز بعثت نبویہ سے آٹھ سال پیشتر سے اہل تشیع کرتے ہیں اور اس کی بنیاد ایک خواب بتاتے ہیں جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم کو امام حسینؓ کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پیشتر دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں یہ خواب کا [illegible] ہجری واقف کاروں پر دو ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے۔ غالباً اسی بنا پر علامہ حلی نے استعمال کیا ہے۔

محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف ہے، جس کا سال پیدائش ۲۸۱ھ ہے باقی رہا سال حسینی، تو اگر امام حسینؓ کی ولادت سے بھی لیجئے، تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے۔ اس لئے یہ دوسرے ہی ابوبکر شافعی ہیں جو پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے۔ اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب اختیار کر لیا، مگر پہلے لقب سے مشہور رہ گئے۔ اس طرح کی تدلیس شیعے

**علمائے شیعہ کی تدلیسیں** ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

**مندل بن علی العنزی** مندل بن علی العنزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے، مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں میں مبدل بن علی العتری لکھا ہے اور تصریح کردی کہ مبدل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور العتری تائے مثناۃ فوقانیہ و رائے مہملہ سے۔ تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مندل کے حقیقی بھائی حبان بن علی العنزی کو صرف حیان بنا کر تصریح کردی

**حبان بن علی العنزی** کہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے اور بس۔ یہاں عنزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے تیار ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت کا خیال بھی نہ جاسکے گا۔ مندل کا نام باب المیم میں بہت بعد کو آئے گا اور حبان کا نام باب الحاء مہملہ میں کتاب کے دوسرے ہی رُبع میں موجود ہوگا۔

اسی طرح ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالاتفاق شیعہ تھے۔ ابوجعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری لکھ دیا۔ تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں، چنانچہ سمجھے اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں کو دو سمجھتے رہے، حالانکہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا۔ ابن جریر نے خود یہ تدلیس کی، کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام اس نے رستم ہی رہنے دیا اور جو کتابیں عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں، ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں، وہ عام نگاہوں سے اُس وقت تک برابر پوشیدہ رہیں، جب تک کہ ایران میں حکومت صفویہ قائم نہ ہوئی تھی۔ جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں اور مخصوص عقیدے اس سے پہلے تک برابر پردہ کتمان میں رہے۔ ابن جریر کی خالص شیعی تصنیفیں بھی نہاں خانہ کتمان میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے استحکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ اور شیعے اپنے اصلی عقائد اور حقیقی رنگ روپ میں نمایاں ہوگئے۔ اُس وقت اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے علمائے اہل سنت بدظن ہو کر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو تخم ریزیاں ابن جریر اپنی اس تفسیر اور تاریخ میں کر گئے ہیں وہ بیکار نہ ہوسکیں گی، اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع کر دیں، جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے اور وہ علمائے و عقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے تھے۔ اپنی زبانی اس کا پروپاگنڈا بھی کرتے رہے اور ایک خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر اس چیز کو ہم فلاں فلاں حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے سہی مگر رد کر دیتے ہیں۔ و مشتبہ و غیر مستند مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز ہمیشہ کے لئے

Marfat.com

ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو۔ اس لئے ہم ان صحیح واقعات و واقعی وجوہات سے چشم پوشی کرلیں گے، یہاں تک کہ بربنائے ضرورت اسکی واقعیت ہی سے انکار کردیں گے، مگر اس دولت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ یہ حلوائے بادام کی قاب فی الجملہ زہر آلود ہی سہی، مگر ہے تو حلوائے بادام اسکی زہر آلودگی سے انکار کرکے تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں، تو اس کا مزا تو آئے گا، ہوس تو مٹے گی۔ زہر آلود کہہ کر واپس کردینے پر ہوس اور تمنا رہے گی اور یہ یاد کرکرکے کہ ہائے کیا خوش رنگ اور خوش بو حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بے چین ہوگی۔ بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری کو بھی اہل سنت نے گلے لگایا اور مسند امام احمد کو بھی اور اسی طرح سنن نسائی اور مستدرک حاکم وغیرہ کو بھی۔

**رجوع بسوئے مقصد**۔ غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابوبکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم ہوگئی کہ یہ ایک پکا منافق شخص تھا، درحقیقت شیعہ رافضی تھا اور تقیہ کرکے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا اور اس کی پیٹھ پر وہ کدیمی اور بورقی والی پارٹی تھی، جو درحقیقت بالکل اسی طرح تقیہ باز تھی۔ اور وہ سب کے سب

**تصریح سلسلہ تالیف مسند** شیعے ہی تھے مگر اہل سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جمع کردہ جھوٹی سچی روایات کو یکجا کرکے پورا ذخیرہ "حدثنا عبد اللہ حدثنی ابی" لکھ لکھ کر مرتب کرڈالا یہ شخص تھا بڑا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ حلی نے انکے نام کے ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے، اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کرلیں۔ مگر فوراً اسکی اشاعت ہوتی تو پھر عبداللہ کے دوسرے تلامذہ نہایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے، اس کا ڈر لگا ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے تلامذہ ایک ایک کرکے راہیِ جنت نہ ہولئے، اس وقت تک توکسی سے مسند احمد کا نام تک نہیں سنا گیا۔ یہاں تک کہ اس انتظار میں ابوبکر شافعی خود ہی ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسا جلیل القدر شیخ متوفی ۳۶۰ھ جو عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابوبکر شافعی نے مرتے وقت ابوبکر قطیعی کو یہ امانت سپرد کردی اور بزبانِ حال کہا کہ ؎ سپردم بتو مایۂ خویش را

قطیعی تو ابوبکر شافعی کے ساتھ رہتے ہی تھے۔ اور انھیں کے تربیت یافتہ و ہم مسلک و ہم خیال بھی تھے، اس کے بعد سے برابر شریکِ کار بھی رہے، یعنی برابر ترتیب مسند میں بھی ابوبکر شافعی کے معین و مددگار رہے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق تمام لے لیا، اور اب کام ہی کیا تھا۔ یکی چال کہیر نو سامنے حق طرف لگ گیا تھا طبرانی کے انتقال کے بعد یہ ادھر ادھر لکھونے لگے۔ مگر پھر بھی کہیں مسند احمد کا نام لینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی اپنے کو عبداللہ کا شاگرد مشہور ہی کرچکے تھے اور لوگوں نے تسلیم کرلیا تھا۔ عبداللہ کے آخر وقت میں کچھ مہینے ان سے ملے ہوں گی ۱۶۔۱۷ سال کی عمر یعنی بچپن کی عمر نہیں۔

پھر جس طرح ابوبکر شافعی کو یہ ابوبکر قطیعی مل گئے تھے، بالکل اسی طرح ابوبکر قطیعی کو بھی "جوینده یابنده" کے مطابق آخر ایک ہم راز شاگرد ابن المذہب مل ہی گیا، جو درحقیقت منافقت میں ابوبکر شافعی اور ابوبکر قطیعی دونوں کا ہم مذہب تھا اسی ابن المذہب نے مسند احمد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ابوبکر قطیعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے گزر جانے کے بعد دیکھا کہ اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر تلامذہ سے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب بہت زیادہ نہیں رہا، اسلئے اِدھر اُدھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد، ابن المذہب کے دام تزویر میں کب آسکتا تھا۔ اگر واقعتہً خطیب کو ابن المذہب پر بھی اعتماد ہوتا، تو خطیب ضرور ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لے لیتے۔ خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر خدا جانے کتنے محدثین ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لئے ہوتے۔ مگر کسی نے ان کے اس دعویٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت کے دوسرے محدثین نے ابن المذہب کی تکذیب بھی کی ہو، مگر بعد والوں کے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر زبانی تکذیب کوئی ثبوت نہیں، تو یہ تو روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی بے توجہی سے درحقیقت انکی تکذیب کر کے دکھادی۔ ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر اس عملی تکذیب کو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے تھے۔ مگر زبانی تکذیب بھی ضرور تھی۔ جبھی تو ذہبی و ابن حجر باوجود توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذہب و قطیعی کو زبان روکتے روکتے بھی غیر متقن وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو عمر بھر لے پھرے مگر کسی نے کبھی توجہ نہ کی آخر دونوں اگلے مقتداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابوالقاسم ہبتہ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہوئے اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کر کے ۴۴۴ھ میں دنیا سے سدھار گئے۔

ان ابوالقاسم ہبتہ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا۔ ساری عمر مسند کو ہر جگہ ڈھوئے پھرے، مگر علمائے حدیث میں سے ایک شخص نے بھی نگاہ اُٹھا کر انکی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبداللہ الرصافی کو اشاعتِ مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کر گئے، چنانچہ حنبل بن عبداللہ الرصافی کے سوا اور کوئی شیخ ابوالقاسم ہبتہ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی بھی تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی۔ جس طرح حنبل بن عبداللہ الرصافی کے بعد دو چار راویوں کی تعداد مل جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر اب تک رصافی کے سوا ہبتہ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا نہیں نظر سے نہیں گزرا۔

Marfat.com

**مشتبہ آحاد روایتیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں۔** محدثین کا متفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق نفس اس کی مقتضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جاننے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ہر عہد میں صرف ایک ایک یا ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آرہے ہوں، تو وہ حدیث صرف احاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کر دی جائے گی۔

**حدیث آحادِ ظنی اور آحادِ مشتبہ اور دونوں کا فرق۔** عہد صحابہؓ یا عہد تابعین یا عہد تبع تابعین میں کسی بات کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زمانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو، یا دو زمانوں میں، تو دہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اس کی ظنیت زیادہ قوی ہو گی [illegible] یا قریب تر ہو گی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جا رہی ہو جس کے متعلق عقل اس کا یقین [illegible] والوں اور روایت کرنے والوں کی کچھ زیادہ تعداد ضرور ہونی چاہئے۔ مثلاً [illegible] جماعت کے سامنے کا یہ امر واقعی ہونے کی وجہ سے اس کا علم پوری یا کسی خاص [illegible] پر اس جماعت کا عمل درآمد ضرور ہونا چاہئے۔ [illegible] مثلاً کسی خاص جماعت یا عامۃ مسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ مثلاً کسی خاص تبلیغ یا [illegible] وارد ہوئی ہو۔ یا وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو [illegible] اور اعتبار سے۔ یا جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو وغیرہ [illegible]

اس قسم کی روایت صرف کسی ایک ہی [illegible] متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق [illegible] ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں [illegible] ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محل اشتباہ ضرور ہے۔ [illegible] ہوں، جب بھی وہ اشتباہ سے خالی نہیں۔ [illegible] سے صرف ایک ہی تابع تابعی روایت کرتے ہوں [illegible]

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے ایک تبع تابعین [illegible] دوہرے ہونے کی وجہ سے ہوگی۔ [illegible]

۵ مثلاً صرف عورتوں یا صرف مردوں [illegible]

Marfat.com

ہی تبع تابعی روایت کرے، جب تو ہر ے اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہو جائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روائتیں اپنے مراتب اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہونگی اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت و سند نہیں سمجھی جائے گی اور ضرور واجب الرد ہوگی، اس لئے کہ ہم کو تو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع متشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار و مشرکین اور گم راہوں کی بتلائی گئی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ وآیاک والمشتبہات، یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

تو جب وہ ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً ساٹھ ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجھ کو کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی احادیث سے بھرا ہوا ہے، جس کی آحادیت کا سلسلہ تین سو برس تک مسلسل متفرد و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک یکے بعد دیگرے بلا شرکت دیگرے وبے مداخلت غیرے چلا آرہا ہے اور تقریباً تین سو برس کے بعد بھی جو وہ آحادیت ٹوٹتی ہے اور تعدد شروع ہوتا ہے، تو اس دور تعدد کا ہر راوی اس غیر معمولی احادیث کو تسلیم کئے ہوئے اور اس پر پوری طرح قائم ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی اس غیر معمولی آحادیت کے پہاڑ سے ٹکراتے رہنے کے باوجود اسکے شیشۂ استناد پر معمولی سے معمولی اور خفیف سے خفیف بال پڑنے کا گمان بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امام احمد کے صرف نام کی اسی قسم کی ناروا ساحرانہ برکت ہے جیسی کہ سامری کو قبضۃ من اثر الرسول سے حاصل ہوئی تھی۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

---

# منکرینِ حدیث

از ـــــ اسلم جیراجپوری

جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی اسی وقت سے اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی جو اگی حیثیت کی منکر رہی۔ یعنی ان کے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حدیث کے وجود یا اسکی حقیقت ہی کو نہیں مانتے یا بالکل جھوٹ جانتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اسکو دینی حجت نہیں تسلیم کرتے دین خالص انکے نزدیک سوائے قرآن کریم کے کچھ نہیں۔ حدیث کو وہ صرف دینی تاریخ قرار دیتے ہیں جس سے عہد رسالت اور زمانہ صحابہ میں قرآن پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اور بس۔

امام شافعی رح متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے بلکہ ان پر

Marfat.com

ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے اس نے امام موصوف سے سوال کیا جو مختصراً یہ تھا۔

"قرآن میں جو فرائض مسلمانوں پر عاید کئے گئے ہیں انہیں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو کسی کو خاص اور کسی کو صرف مباح اور یہ سب کچھ اُن روایات کی بنیاد پر کرتے ہو جو اُن لوگوں سے مروی ہیں جنہیں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ اُن سے ملے اور باوجود اسکے کہ ان رواۃ حدیث میں سے جنکی عدالت اور ثقاہت تمہارے نزدیک مسلّم ہے تم کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ کتاب الٰہی کے احکام اور فرائض میں انکے ذریعے سے تفریق کر ڈالتے ہو۔"

امام صاحب نے اس کا جو جواب دیا اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سنت وہی ہے جسکو قرآن نے "الحکمۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ $\frac{۳}{۱۵۹}$ | مومنوں پر اللہ نے احسان کیا جو انکے اندر انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کر دیا جو انکو اللہ کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور انکو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ |

دوسری آیت ہے:۔

| | |
|---|---|
| ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا ۵۹ | رسول جو تمکو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے [illegible] |

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ [illegible]

[illegible] کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر سنت کو [illegible] [illegible]

اس کے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہیں ہو کیونکہ [illegible] [illegible]

[illegible] قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے [illegible] نہیں۔ علاوہ بریں [illegible] [illegible]

[illegible] طرح صحیح نہیں حکمت قرآن [illegible]

| | |
|---|---|
| وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ [illegible] | [illegible] |

سورۂ بنی اسرائیل میں توریت کے احکام عشرہ کے مقابل احکام دوازدہ [illegible]

| | |
|---|---|
| ذالک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ [illegible] | یہ ہے حکمت [illegible] [illegible] رب نے تجھ پر وحی کی ہے۔ |

---

[illegible] کے [illegible] کا ہے [illegible] آیت کا۔

Marfat.com

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا۔ کہ

| | |
|---|---|
| واذکرن مایتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللہ و الحکمۃ ۳۳/۳۴ | تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت جو تلاوت کی جاتی ہیں انکو یاد کرو۔ |

سے معلوم ہوا کہ "الحکمۃ" بھی قرآن ہی ہے ورنہ سنت کی کون "تلاوت" کرتا ہے مگر باوجود اسکے شافعی جیسے امام نے
نے جو ائمہ مذہب میں نہایت ذہین اور قرآن کے ماہر تھے توجہ نہ کی اور اپنی ہی تفسیر پر مصر رہے حالانکہ انکا خو
قول ہے کہ سنت منزل من اللہ نہیں ہے بلکہ استنباطات نبویہ کا نام ہے پھر جب الحکمۃ کا قرآن سے منزل من اللہ
ہونا ثابت ہے تو وہ سنت کیسے ہو سکتی ہے۔

دوسری آیت "ما آتاکم الرسول" مال فیئ کی تقسیم کے متعلق ہے اسکو سنت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

امام شافعی کی ان دونوں دلیلوں کو نجدی اور اہلحدیث علماء آجتک سنت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں
اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔

شیخ طاہر جزائری نے بھی اپنی کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر میں منکرین کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وقد ثبت توقف کثیر من الصحابۃ فی قبول کثیر من الاخبار، وقد استدل بذالک من یقول بعدم الاعتماد علیہا فی الدین | بہت سی حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت سے صحابہ کا توقف کرنا ثابت ہو چکا ہے اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو دین میں حدیثوں پر اعتماد نہ کرنے کے قائل ہیں۔ |

الغرض منکرین حدیث کی ایک جماعت اسلام میں رہی ہے مگر انکا کوئی جداگانہ فرقہ کبھی نہ تھا بلکہ یہ ارباب
فکر میں سے وہ لوگ تھے جو غور کرتے کرتے اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ حدیثیں دینی حیثیت نہیں رکھتیں
اصل دین قرآن ہی ہے۔

ان منکرین کے اقوال و افکار کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور انکے دلائل و براہین دیکھے ہیں جو اس کثرت سے
ہیں کہ انکے لکھنے کیلئے ایک ضخیم دفتر درکار ہے اسلئے میں انکی جملہ فروعی باتوں کو چھوڑکر صرف سات اصولی
دلائل اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

قائلین حدیث کو انکا جواب یا حدیث کی دینی حیثیت کا ثبوت قرآن ہی سے دینا چاہئے کیونکہ وہ
فریقین کی مسلم کتاب ہے۔ جو آیات سند میں لکھی جائیں انکی تفسیر بھی آیات ہی سے ہونی چاہئے نہ کہ روایات سے۔

(۱) گزشتہ رسولوں کی امتوں کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب ہی پر ایمان رکھنے کا حکم دیا تھا اور مسلمانوں
کو بھی یہی حکم دیا ہے۔

| | |
|---|---|
| قولوا امنا باللہ وما انزل الینا الایہ ۲/۱۳۰ | کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی |

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون $\frac{۲}{۲۸۵}$

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اسکے رب کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔

وقل آمنت بما انزل اللہ من کتاب $\frac{۴۲}{۱۵}$

اور کہدے کہ میں ایمان لایا اسپر جو اللہ نے اتارا (یعنی کتاب)

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

فبای حدیث بعدہ یومنون $\frac{۷۷}{۵۰}$

اس (قرآن) کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائینگے؟

فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون $\frac{۴۵}{۵}$

اللہ اور اسکی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائینگے؟

زیادہ تشریح اس آیت میں ہے :-

ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزوا۔ اولئک لھم عذاب مھین $\frac{۳۱}{۶}$

بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے شغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم (یقین) کے۔ اور اسکو مذاق بنائیں یہ لوگ ہیں جنکے لئے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

اس آیت میں لہو الحدیث کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے یعنی گانا۔ اور اسکی روایت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر صحیح نہیں کیونکہ اس آیت میں لہو الحدیث کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی ہو دوسرے یہ کہ اس کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ غنا کی غرض نشاط و طرب ہے۔ اس کا مقصد نہ گمراہ کرنا ہے نہ اللہ کا مذاق بنانا ہے اور نہ اسکو علم یعنی یقین یا غیر یقین سے کوئی تعلق ہے صرف قصص اور روایات ہیں یعنی حدیث ہے۔

کہا گیا ہے کہ رسول پر بھی تو ایمان لانے کا حکم قرآن میں ہے اسلئے اسکے اقوال و اعمال جنکا نام حدیث ہے خود بخود جزو ایمان بنگئے۔ جواب دیا گیا ہے کہ بیشک ہمارے رسول بلکہ تمام رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

لا نفرق بین احد من رسلہ $\frac{۲}{۲۸۶}$

اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم فرق نہیں کرتے (ایمان لانے میں)

مگر ساری بحث تو یہی ہے کہ رسول کا پیغام امت کے لئے قرآن ہے یا حدیث۔ رسول پر قرآن نازل کیا گیا اسی کی اتباع۔ اسی کی تلاوت، اسی کی تبلیغ اور اسی کی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ رسول نے اسی کو سنایا۔ اسی کو لکھوایا اسی کو یاد کرایا اور اسی پر عمل کیا، اسکے اتارنے والے نے اسکی حفاظت کا بھی ذمہ لے لیا۔ کیا حدیثوں کے متعلق ان میں سے کوئی ایک بات بھی ثابت کر سکتے ہو؟ حدیثوں کی حیثیت تو یہ ہے کہ جس نے جو دیکھا یا سنا اسکو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہی باتیں سلسلہ بسلسلہ امت میں پھیلیں ایک زمانے کے بعد ان سے اصول مقرر کئے ان کی

Marfat.com

کو قابل تسلیم قرار دیا اور کسی کو مسترد قرار دیا۔ کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے انکے اوپر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول… کے سامنے پیش کر کے انکی تصدیق کرائی گئی ہے؟ پھر کس طرح انکو جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے… درانحالیکہ وہ اصول بھی جنکے اوپر حدیث کی صحت کا دارومدار تم نے رکھا ہے یعنی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں…

رسول اللہ نے صرف قرآن ہی پر عمل کیا ہے اور بحیثیت رسالت وہی اُمت کے لئے انکا پیغام ہے۔

واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۶/۲۰ | مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس سے تم کو آگاہ کروں اور… بھی جن تک یہ پہنچے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور بہ ہے۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ۴/۶۲ | اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور امیروں کی… میں سے ہوں۔ اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو… اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اور جب اطاعت رسول فرض ہے تو لازم ہے کہ اسکے اقوال واعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت ا… کی اطاعت کرے۔

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جسقدر امراء ہوئے ہیں۔ ان میں سے بھی ہر ایک کا ایک ایک… احادیث ہونا چاہئے ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے۔ جس میں ر… اور امراء دونوں داخل کئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی اطاعت باذن الٰہی اور بحیثیت رسالت فرض ہے جیسا کہ اللہ نے کہا ہے…

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۴/۶۸ | ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ باذن الٰہی اسکی اطاعت…

بلکہ چونکہ رسول اللہ ہی کا پیغام لاتے ہیں اور اسی کی اطاعت چاہتے ہیں اسلئے ان کی اطاعت او… کی اطاعت ایک ہی ہوتی ہے۔

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۲ | جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت…

لیکن اطاعت رسول سے عملی اور بالمشافہ اطاعت مراد ہے۔ اسکے لئے دفاتر تیار کرنے کی ضرورت نہیں… کریم میں اس کی تصریح ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون ۸/۲۰ | اے مومنو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرو۔ اور… سنکر نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اس کی اطاعت ہوگی اولوالامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہو جاتا ہے جو…

Marfat.com

جانشینی کریں گے۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے یعنی بصورت تنازع معاملہ کو رسول کیطرف رد کرنے کے حکم سے حدیث کے بعض حامی اسکی دینی حیثیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس صورت میں رسول کو کیا کرنے کا حکم ہے۔ سنئے۔

| | |
|---|---|
| فاحکم بینھم بما انزل اللہ ۵/۵۵ | ان کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلہ کرو۔ |
| انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ۴/۱۰۶ | ہم نے تیری طرف قرآن اتارا حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجھ کو سمجھائے اسکے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر۔ |

دراصل حکم کتاب اللہ ہی ہے رسول یا امیر اسی سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مامور ہیں اسی نے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| ان اختلفتم فی شئ فحکمہٗ الی اللہ ۴۲/۸ | اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اسکا فیصلہ اللہ کیطرف ہے۔ |

اللہ کے فیصلہ کے معنی یہ ہیں کہ اسکی کتاب کی رُو سے فیصلہ کیا جائے۔

| | |
|---|---|
| افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا ۶/۱۱۵ | کیا اللہ کے ماسوا کوئی حکم تلاش کروں حالانکہ وہ تو وہ ہے جس نے تمھاری طرف مفصل کتاب اتاردی۔ |
| ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون ۵/۵۲ | جو اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں۔ |

(۲) اتباع کے متعلق اللہ تعالےٰ کا قطعی حکم یہ ہے:۔

| | |
|---|---|
| اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء ۷/۳ | اسکی پیروی کرو جو تمھاری طرف تمھارے رب کیطرف سے اتارا گیا اور اسکے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔ |

اس آیت میں حصر ہے کہ قرآن ہی کی پیروی کرو اور اسکے سوا کسی دوسرے کی پیروی نہ کرو۔ درحقیقت یہ آیت اس امر میں نص صریح ہے کہ بجز کتاب اللہ کے کسی کی پیروی جائز نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسی قرآن میں رسول کی اتباع کا حکم بھی دیا گیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ۳/۳۱ | کہدے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔ |

لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے؟ اسکی بھی تصریح قرآن میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| اتبع ما اوحی الیک من ربک ۶/۱۰۶ | پیروی کر اسکی جو تیرے رب کے پاس سے تیری طرف وحی کی گئی۔ |

پھر رسول کو اعلان کردینے کا حکم دیا جاتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی ۷/۲۰۳ | کہدے کہ میں تو بس اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔ |

لہٰذا رسول بجز وحی کے کسی چیز کا پیرو نہیں تھا اسلئے اسکی پیروی بعینہٖ قرآن کی پیروی ہے۔

یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا تھا سب وحی تھا۔ جس کے ثبوت میں آیت

| | | |
|---|---|---|
| ما ینطق عن الھوا ان ھوا لاوحیٌ یوحیٰ | ٥٣/٤ | وہ نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔ |

پیش کیجاتی ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا اُسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے۔ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اسکے متعلق نہ کوئی انکار تھا نہ کوئی بحث تھی۔ چنانچہ دوسری آیات میں تصریح ہے کہ وحی قرآن ہی ہے :۔

| | | |
|---|---|---|
| واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک | ١٨/٢٧ | اور پڑھ کر سنادے جو وحی کیگئی ہے تیری طرف یعنی اپنے رب کی کتاب۔ |
| واوحی الی ھذا القرآن لانذر کم بہ ومن بلغ | ٦/٢٠ | اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمکو اس کے ذریعہ سے آگاہ کروں اور انکو بھی جن تک وہ پہنچے۔ |
| قل انما انذر کم بالوحی | ٢١/٤٥ | کہدے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔ |

حصر ہے کہ سرمایہ انذار قرآن ہی ہے۔ اور وہی قرآن لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے مجھ پر وحی کیا گیا ہے۔

جو لوگ وحی کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ متلو اور غیر متلو جن میں پہلی کو قرآن اور دوسری کو حدیث کہتے ہیں وہ محض انکی خیالی تقسیم ہے بعضوں نے وحی کی دو قسمیں خفی اور جلی ہیں لیکن ہمارے رسولؐ کی وحی تو سب خفی تھی۔ وحی کی کیفیت خود قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| نزل بہ الروح الامین علی قلبک | ٢٦/١٩٥ | روح الامین اسکو لے کر تیرے قلب پر اُترتا ہے۔ |

(٣) قرآن خالص اور دائمی حق ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ھوالحق | ٣٤/٦ | اور اہل علم جانتے ہیں کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اُترا ہے۔ وحی حق ہے۔ |

یقین ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ذالک الکتاب لاریب فیہ | ٢/٢ | یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ |

روح الامین اسکو لاتا ہے اور رسول امین پر اُتارتا ہے۔ شہاب ثاقب کے پہرے لگادئے جاتے ہیں تاکہ کسی قسم کی شیطانی آمیزش نہ ہوسکے چنانچہ وہ جن جنھوں نے قرآن سنا کہتے ہیں :۔

| | | |
|---|---|---|
| کنا نقعد منہا مقاعد للسمع فمن یسمع الاٰن یجد لہٗ شہابا رصدا | ٧٢/٩ | ہم بیٹھا کرتے تھے سننے کے ٹھکانوں پر مگر اب جو سنتا ہے شہاب کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔ |

اُتار لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی کو اسکے خود پڑھانے اور یاد کرانے کا ذمہ لیتا ہے۔

Marfat.com

انا علینا جمعہٗ وقرآنہٗ $\frac{75}{19}$ | یقیناً ہمارا ذمہ ہے کہ ہم اسکو یاد کرا دینگے اور پڑھا دینگے۔

اسبات کی بھی ذمہ داری لیتا ہے کہ یاد کرا دینے کے بعد تم اسکو بھولوگے نہیں۔

سنقرئك فلا تنسٰی $\frac{87}{6}$ | ہم تمھیں پڑھا دینگے پھر تم اسکو نہ بھولوگے۔

پھر اس کتاب کی ابد تک حفاظت کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحافظون $\frac{15}{10}$ | ہم ہی کہ ہم نے قرآن کو اتارا اور ہم ہی اسکے نگہبان ہیں۔

وہ اسکے لفظ لفظ کا محافظ ہے کسی کی مجال نہیں کہ اسکے کلمات کو بدل سکے۔

واتل ما اوحی الیك من کتاب ربك لا مبدل لکلماتہٖ ولن تجد من دونہٖ ملتحدا $\frac{18}{27}$ | اور سنا جو کچھ تیری طرف وحی بھیجی ہے تیرے اپنے رب کی کتاب۔ کوئی اسکے کلمات کو بدلنے والا نہیں اور اسکے سوا ہرگز تجھے کوئی پناہ نہیں ملیگی

اور حدیثیں بجز متواتر[۱] کے جسکے وجود ہی میں بحث ہے باتفاق ائمہ حدیث تمام ظنی ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں۔

خبر الواحد لا یفید العلم (المستصفٰی جزو اول[۲]) | خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد کی تعریف بھی اسی میں ہے:-

انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام ما لا ینتھی من الاخبار الی حد المتواتر المفید للعلم فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فھو خبر الواحد | ہم اس مقام پر خبر واحد سے وہ خبر مراد لیتے ہیں جو حد تواتر تک جو یقین سے نہ پہنچے مثلاً جس خبر کو ایک جماعت دس آدمیوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں۔

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوك عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون $\frac{6}{14}$ | روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہی ہیں کہ اگر تو [illegible] اللہ کی راہ سے گمراہ کردینگے وہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔

وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا $\frac{10}{36}$ | اکثر ان میں سے نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی اور ظن حق کا کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

ولا تقف ما لیس لك بہٖ علم $\frac{17}{36}$ | اور اسکے پیچھے نہ چل جسکا تجھکو علم نہیں۔

اسلئے حدیثیں دینی امور میں کارآمد نہیں صرف تاریخ دین کا کام دے سکتی ہیں۔

---

[۱] جن حدیثوں کی بابت بعض علماء حدیث نے تواتر کا دعویٰ کیا ہے [illegible]
نہیں ہے اور انکا تواتر بھی قصداً ظہور میں آیا بلکہ اتفاقی ہے لیکن صحیح بخاری حدیث [illegible]

(۴) سرچشمہ دین اللہ ہی ہے :-

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک ۴۲/۱۳ | اللہ نے تمہارے لیے وہی دین شروع کیا جسکی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جسکو ہم نے تیری طرف وحی کیا۔

یعنی اوّلین رسل حضرت نوحؑ سے خاتم رسل محمدؐ تک وہی دین ہے جو اللہ نے مشروع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے :-

ثم جعلنٰک علی شریعۃ من الامر فاتبعہا ۴۵/۱۸ | پھر ہم نے تجھکو (عالم[۵]) امر کی شریعت پر لگا دیا ہے۔ اسی کی اتباع کر۔

قرآن اتار کر اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور اعلان فرمایا۔

یا ایہا الناس قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا۔ فاما الذین آمنوا باللہ واعتصموا بہ فسیدخلھم فی رحمۃ منہ وفضل ویھدیھم الیہ صراطاً مستقیما ۵/۱۷۵ | لوگو! تمہارے پاس رب کیطرف سے دلیل آگئی اور ہم نے نور مبین تمہاری طرف اُتار دیا اب جو اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اسکو مضبوط پکڑ لیا تو وہ انکو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کریگا اور اپنی طرف سیدھے راستہ کی ہدایت دیگا۔

یہی نور مبین یعنی قرآن ہے جسکی روشنی میں نبیؐ خود چلتا تھا اور دوسروں کو چلاتا تھا اسی آفتاب حقیقت نے اسکے افق قلب پر طلوع ہو کر اسکو سراج منیر بنا لیا تھا یہی اسکا سرمایہ تعلیم و تبلیغ اور سامان بشارت و انذار تھا اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا یعنی انکو کفر و شرک کی ظلمت سے نکالکر اسلام اور صراط مستقیم کی روشنی میں لاتا تھا۔

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور ۱۴/۱ | کتاب ہم نے تیری طرف اتار دی ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اسی کی تلاوت کرتا، اسی کو سناتا، اسی کو لکھاتا، اسی کو یاد کراتا اسی کو سکھاتا اور اسی پر عمل کر کے امت کیلئے نمونہ قائم کرتا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۳۳/۲۱ | تمہارے لئے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح و طلاق، جنگ و صلح وغیرہ تقریباً جملہ اوامر و نواہی کتاب پر عمل کر کے طریقہ

---

[۵] عالم امر جسکے ماتحت عالم خلق میں جملہ طبیعی اور حیاتی حرکات کا صدور ہوتا ہے قرآن کی تعلیمات مہمہ میں سے ہے اسکے سمجھ لینے سے عرش ملائکہ روح دین اور شریعت وغیرہ کے حقائق واضح ہوجاتے ہیں لیکن یہ مسئلہ بھی دیگر اہم قرآنی مسائل کیطرح مسلمانوں میں محروم توجہ رہا جسکی وجہ سے بہت سے اختلافات اور نزاعیں واقع ہوئیں منجملہ انکے فتنہ خلق قرآن تھا جسمیں علماء و صلحاء مصیبت میں ڈالے گئے خاصکر امام احمد حنبل جیسے بزرگ ۲۸ مہینے تک قید و ضرب کی سختی جھیلے اگر اسوقت عالم امر کی حقیقت واضح ہوتی تو فریقین کو اپنی اپنی غلطی کا علم ہوجاتا اور نزاع نہوتی نہ علماء کو ضرورت پڑتی کہ قرآن کو غیر مخلوق اور قدیم ثابت کیلئے حدیثیں بنائیں کیونکہ اس رسول اعظم و مہبط وحی سے جسکی رسائی افق اعلیٰ تک تھی اور جو اپنی نورانی چشم بصیرت سے صاف دیکھ رہا تھا کہ وحی کا فیضان عالم ہے جو امر حادث ہے قطعی ناممکن تھا کہ اسکو قدیم کہدے اسی طرح استواء علی العرش کی بحث ہے جو صدیوں ہی نہیں بلکہ آجتک ہے۔ اور علماء کی بحث

Marfat.com

بنادیا جو امت میں نسلاً بعد نسلٍ متواتر متوارث چلا آرہا ہے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب تعامل امت جو تواتر کیساتھ چلا آرہا ہے تمھارے نزدیک یقینی اور دینی ہے تو پھر حدیثوں کے دین ہونے میں کیا قباحت ہے آخر وہی اعمال تو ہیں جو دفاتر حدیث میں مدون کئے گئے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ تعامل اور حدیث میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی، تعامل احکام قرآن پر عمل کی صورت ہے اور حدیث اس سے دس گنی بلکہ سو گنی باتیں زیادہ شامل رکھتی ہیں جو قرآنی حدود سے آگے بڑھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کو ایسے امور کی پابند بناتی ہیں جو صرف [illegible] ہو سکتے ہیں مثلاً قرآن نے وضع اور لباس میں انسان کو آزاد چھوڑا ہے اور اسلام جیسے عالمگیر فطرتی دین کو جو ہر ملک ہر قوم کو اپنے جھنڈے کے نیچے لانا چاہتا ہے ایسا ہی وسیع ہونا بھی چاہئے مگر حدیثیں مسلمان کے لئے ایک مخصوص ہیئت اور وضع معین کرتی ہیں انھوں نے بال بال تک جکڑ رکھا ہے کہ اسکو چھوڑ دو اور اسکو منڈاؤ بعض جگہ وہ قرآن کے بالکل خلاف جاتی ہیں جنکی وجہ سے علما قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے [illegible] مرنے سے پہلے والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض کی ہے۔

| | |
|---|---|
| کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیة للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین ۲/۱۸۰ | تمھارے اوپر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آجائے اور وہ مال چھوڑے تو والدین اور اقربا کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ اہل تقویٰ پر یہ ایک حق ہے۔ |
| مگر حدیث کہتی ہے:۔ لا وصیة لوارث | کسی وارث کے لئے وصیت نہیں۔ |

علما نے اس ظنی حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے بہت سے عائلی مصالح کی خاطر فرض کی ہے اور جسکو اہلِ تقوی پر ایک حق قرار دیا ہے منسوخ کر ڈالی۔

حدیثوں کا تو یہ حال ہے کہ جو روایات قرآن کی تفسیر میں ہیں وہ بھی خود بعض جگہ اسکے برخلاف ہیں۔ مثلاً

| | |
|---|---|
| ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات الایہ ۱۷/۱۰۱ | ہم نے موسیٰ کو نو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔ |

اس کی تفسیر حدیث کی زبان سے سنئے:۔

صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک یہودی نے [illegible] کہا چلو اس پیغمبر کے پاس سوال کریں [illegible] وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ ان نو آیتوں کی [illegible] آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں [illegible] شریک نہ بناؤ۔ زنا نہ کرو۔ کسی بیگناہ کو قتل نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ جادو نہ کرو۔ کسی [illegible] حاکم کے پاس [illegible] کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں نمبر میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمھارے

Marfat.com

لئے اے یہود یہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو[۵] یہ سنکر دونوں یہودیوں نے آپ کے دستِ پاک کو بوسہ دیا۔[۶]

حضرت موسیٰ کی تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کیگئی ہے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن کی رُو سے اسکا صحیح ہونا قطعاً محال ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کو یہ نو نشانیاں اسوقت ملیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے انکو رسول بناکر فرعون کیطرف بھیجا اور اسوقت تک توریت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ خود آیت مذکورہ۔

ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات (فاسئل بنی اسرائیل) اذ جاءھم فقال لہ فرعون انی لاظنک یا موسیٰ مسحورا۔ قال لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السموات والارض بصائر۔ $\frac{۱۷}{۱۲}$

موسیٰ کو ہم نے کھلی کھلی نو نشانیاں دیں (تو بنی اسرائیل سے پوچھ لے) جب وہ انکے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں خیال کرتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے کہا تو جانتا ہے کہ انکو نہیں اُتارا آسمان اور زمین کے رب نے مگر نشانیاں۔

سے ثابت ہے کہ یہ نشانیاں لیکر موسیٰ فرعون ہی کے پاس گئے تھے۔ مزید تصریح سورہ نمل میں ہے :۔

فی تسع آیاتٍ الیٰ فرعون وقومہ

نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اسکی قوم کی طرف۔

سورہ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ کا قصہ مسلسل بیان کیا گیا ہے ان نشانیوں کی تفصیل کردی گئی ہے :۔

فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین $\frac{۷}{۱۰۵}$

موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا وہ کھلا ہوا اژدھا ہوگیا اور اپنا ہاتھ نکالا۔ وہ دیکھنے والوں کے لئے سفید تھا۔

ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین و نقصٍ من الثمرات $\frac{۷}{۱۲۸}$

آلِ فرعون کو ہم نے قحط اور پھلوں کی کمی میں گرفتار کیا

فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل و الضفادع والدم آیاتٍ مفصلات $\frac{۷}{۱۳۱}$

پھر ہم نے بھیجا طوفان۔ ٹڈی۔ چچڑیاں۔ مینڈک اور خون الگ الگ نشانیاں۔

اس تفصیل کے مطابق وہ نو نشانیاں جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھیں یہ ہوئیں :۔

عصا[۱]۔ یدِ بیضا[۲]۔ قحط[۳]۔ نقص ثمر[۴]۔ طوفان[۵]۔ ٹڈی[۶]۔ جوں[۷]۔ مینڈک[۸]۔ خون[۹]۔

---

[۵] نہ صرف دسواں بلکہ توریت کے احکام عشرہ کل کے کل یہود کے لئے تھے۔ توریت دینے کے بعد حضرت موسیٰ کو اللہ نے حکم دیا۔ وامر قومک یاخذوا باحسنھا یعنی اپنی قوم کو حکم دے کہ انکو بہترین طریقے سے لیں۔

[۶] یہ حدیث جامع ترمذی۔ مسند احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ابن جریر میں ہے امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسری "باب ماجاء فی قبلۃ الید والرجل" دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح"

(سیرۃ النبی جلد سوم طبع دوم صفحہ ۴۳)

اسکے مدتوں بعد فرعون ہلاک کئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے طور امین کیطرف پہنچتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ انکو توریت عطا کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| یا موسیٰ انی اصطفیتك علی الناس برسالاتی و بکلامی فخذ ما اتیتك وکن من الشاکرین وکتبنا لہ فی الالواح من کل شیء موعظۃ وتفصیلا لکل شیء | اے موسیٰ میں نے تجھ کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور کلام کیلئے چن لیا۔ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر ادا کر اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی۔ |

۷/۱۴۲

یہ تمام تفصیلات اسقدر مصرح ہیں کہ ان میں نہ کسی شک کی گنجائش ہے نہ کسی تاویل کی مگر پھر بھی انکے خلاف یہ "چار آنکھوں والی" حدیث جو صحاح ستہ کی ہے بتلاتی ہے کہ خود رسولؐ نے نسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام عشرہ کے ساتھ کی۔ کوئی عقل اسکو تسلیم کر سکتی ہے؟ چنانچہ بعض مفسرین نے باوجود حدیث مذکورہ کے بھی یہ تفسیر قبول نہیں کی ہے پر یہ معاملہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ چونکہ ان یہودیوں نے خوش ہوکر آنحضرتؐ کے دست و پا کو بوسہ دیا تھا اسلئے حدیث میں ایک باب "قبلۃ الید والرجل" کا اضافہ اور ہوجاتا ہے جس سے علماء کے ہاتھ پاؤں چومنے کا جواز نکالا گیا ہے اس روایت سے کئی باتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ارباب صحاح ستہ نے جو شرطیں حدیث کی صحت کے لئے مقرر کی ہیں وہ کس حد تک انکی ضمانت کرتی ہیں

(۲) ان ائمہ کے حسن صحیح کہنے کی قدر و قیمت کیا ہے۔

(۳) جو لوگ ایسی حدیثوں پر ایمان رکھنے کو دین اور قرآن جیسے آسمانی نور اور جاودانی حق کے [illegible] کو الحاد و بیدینی قرار دیتے ہیں وہ کہاں تک دین کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

(۵) رسول کریمؐ نے حدیثوں کی حفاظت کیطرف کوئی توجہ نہ فرمائی بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا:-

| | |
|---|---|
| لاتکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن الخ | مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو۔ |

اگر بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے دن کا خطبہ ابو شاہ کو لکھوا دیا یا کسی خاص بات کو لکھنے کی اجازت دے دی تو یہ مستثنیات میں شمار ہوگا عام حکم یہی تھا کہ سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھا جائے اور یہی عمل کرایا جاتا تھا چنانچہ ابوداؤد کتاب العلم میں ہے۔

| | |
|---|---|
| وقد لزید بن ثابت علی معاویہ فسالہ عن حدیث فامر ان یکتبہ فقال لہ زید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنا ان لا نکتب من حدیثہ فمحاہ | حضرت زیدؓ بن ثابت امیر معاویہ کے پاس گئے تھے انھوں نے ایک حدیث دریافت کی پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ اسکو لکھ لے زید نے کہا رسولؐ نے ہم کو منع کیا ہے کہ ہم انکی حدیث نہ لکھیں اسلئے اسکو مٹا دیا۔ |

اس سے علماء حدیث کی وہ توجیہ بھی غلط ہو جاتی ہے جو انھوں نے کی ہے [illegible]

اس لئے تھا کہ حدیثیں آیات کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائیں۔

بیشک روایات کو بیان کرنے کی اجازت حدیثوں سے نکلتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم روایت کو روایت ہی رکھنا چاہتے تھے اور دین یعنی قرآن کی طرح اسکو محفوظ بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا جب لوگوں کو دیکھا کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم اختلاف کرتے ہو آئندہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے اسلئے رسولؐ سے کوئی روایت نہ کرو[۱]۔ انھوں نے خود تقریباً ۵۰۰ حدیثوں کا ایک مجموعہ لکھا بھی تھا۔ اسکو آگ میں جلا دیا[۲]۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اور بھی زیادہ سختی برتی اگر کوئی روایت کرتا تو وہ درہ لیکر اسکو مارنے کو تیار ہو جاتے اور جبتک گواہ اور شاہد نہ لے لیتے نہ چھوڑتے۔ لکھنے کی مطلق اجازت نہ دیتے۔

قال عبد اللہ بن علاء سالت القاسم بن محمد بن ابی بکر ان یملی علی الحدیث۔ فقال ان الاحادیث قد کثرت علی عہد عمر بن الخطاب فانشد الناس ان یاتوہ بھا۔ فلما اتوہ بھا امر بتحریقھا۔ ثم قال مثناۃ کمثناۃ اہل الکتاب۔ قال فمنعنی القاسم یومئذ ان اکتب حدیثاً (طبقات ابن سعد جزء خامس ص۱۴۰)

عبد اللہ بن علا کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد ابن ابو بکرؓ سے کہا کہ مجھ کو حدیث لکھوائے انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حدیثیں زیادہ ہو گئی تھیں انھوں نے منادی کرائی کہ لوگ حدیثیں انکے پاس لائیں جب لائے تو حکم دیا کہ انکو جلا دو۔ پھر فرمایا کہ سنت جیسے اہل کتاب کی سنت[۳] علا کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے قاسم نے روک دیا کہ میں ایک حدیث بھی لکھوں۔

حضرت عثمانؓ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لے گئے جسمیں نبی صلعم کا وہ حکم لکھا ہوا تھا جو زکوٰۃ کے بارے میں تھا انھوں نے کہا کہ مجھے اس سے معاف کرو[۴]۔ حضرت علیؓ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو اس سے حلف لیتے تھے[۵]۔

حضرت ابن عباس نے بھی حضرت ابو ہریرہ کی حدیث "الوضوء مما مسته النار" اور حضرت علی کی حدیث "نہی عن المتعہ" اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا۔[۶]

رسول صلعم اور صحابہ کرام کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو دین نہیں سمجھتے تھے ورنہ قرآن کیطرح اسکی حفاظت بھی کرتے۔ بیشک احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے شہادت لینے کے بعد روایتیں قبول کی ہیں جسکی وجہ یہ تھی کہ انکو عینی گواہ ملجاتے تھے جو شہادت دیتے تھے کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسولؐ کی زبان مبارک سے اسکو سنا ہے۔ مگر عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہو گیا اور شہادت در شہادت

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ترجمہ ابو بکر [۲] تذکرۃ الحفاظ [۳] یہود نے انبیاء کی روایات کتاب میں جمع کی تھیں جسکا نام مثناۃ رکھا تھا۔

[۴] توجیہ النظر صفحہ ۱۶ [۵] توجیہ النظر ص۱۱ [۶] توجیہ النظر صفحہ ۶

Marfat.com

عقلاً۔ عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابلِ سماعت نہیں۔ ایسی شہادت کی بنیاد پر آپ کسی عدالت سے ایسا یکطرفہ [illegible]
فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔

(۶) روایت کی صحت کا معیار ائمہ حدیث نے راویوں کی ثقاہت اور عدالت کو قرار دیا ہے حدیث [illegible] کا سب سے بڑا ذریعہ انکے پاس یہی ہے۔ ارباب صحاح ستہ میں سے ہر ایک نے جو شرائط رکھی ہیں ان میں [illegible] ہے۔ وہ رواۃ کی ثقاہت کا ہی ہے۔ امام بخاری صرف اول درجہ کے ثقہ راویوں کی روایت [illegible] کہیں درجہ دوم والوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ارباب سنن ان سے بھی کچھ نرم ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہے بیان [illegible] راویوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ثقاہت یا عدالت خود ائمہ حدیث کی تعریف کے مطابق[1] [illegible] جسکے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی قطعی شہادت نہیں ہو سکتی لہذا سارا دارومدار حدیث کا شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔

رواۃ میں طبقہ اول صحابہ کرام کا ہے۔ ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں۔ علامہ ابن صلاح کہتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| الصحابة باسرهم خصيصة ، وهي انه لا يسأل عن عدالة احد منهم بل ذلك امر مفروغ عنه (مقدمہ ابن صلاح ص۱۴۶) | جملہ صحابہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کا سوال نہیں اُٹھایا جا سکتا بلکہ ایسا امر [illegible] |

پھر اسی صفحہ میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| ان الامة مجمعة على تعديل جميع الصحابة ومن لابس الفتن منهم كذالك | تمام صحابہ کی تعدیل پر امت کا [illegible] میں شریک ہوئے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ |

صحابہ کی تعریف بھی انھیں کی زبان سے سُن لیجیے:۔

| | |
|---|---|
| المعروف من طريقة اهل الحديث ان كل مسلم رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو من الصحابة | طریقہ اہلحدیث کے مطابق [illegible] اللہ کو دیکھ وہ صحابی ہے [illegible] |

صحابہ کرام کی عظمت و جلالت شان کی وجہ سے ہم اصول مذکورہ پر جو غیر صحیح [illegible] کا فیصلہ ہے بحث کرنا پسند نہیں کرتے لیکن اس امر پر [illegible] کہ [illegible] فیاضی کہ ہر ایک صحابی کو عدالت اور ثقاہت کا پورا پورا حصہ دیدیا جاتا ہے [illegible] میں مومن بھی نہیں صرف مسلم کہا جاتا ہے حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن [illegible]

---

[1] امام بخاری نے جب اپنی کتاب صحیح لکھنی شروع کی تو [illegible]
لیں جو انھوں نے درج کیں ان میں سے اگر [illegible]

[2] عدالت محدثین کے نزدیک وہ ملکہ [illegible]

| | |
|---|---|
| ومن اهل المدینة مردوا علی النفاق لاتعلمهم نحن نعلمهم ۹/۱۰۲ | اور کچھ لوگ مدینہ کے نفاق پر اڑے ہوئے ہیں انکو تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔ |

مسلمان ہی کہلاتے تھے اور رسول اللہ تک کو انکے نفاق کا علم نہ تھا۔ نیز واقعۂ "افک" میں جو لوگ شریک تھے جن پر حد قذف پڑی۔ جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| لاتقبلوا لهم شهادة ابدا ۲۴/۵ | نہ قبول کرو ان کی کوئی گواہی کبھی۔ |

وہ بھی مسلمان ہی کہے جاتے تھے علاوہ بریں ایک طرف تو یہ روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔

| | |
|---|---|
| لاترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض | میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بنجانا کہ ایکدوسرے کی گردن مارنے لگو۔ |

دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑ کر باہمی لڑائیوں میں ایکدوسرے کا گلا کاٹا انکو بھی ابوبکر و عمر کے ساتھ ثقاہت کے پلہ میں ہموزن رکھدیا جاتا ہے۔

صحابہ کے بعد ہر ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کرکے جرح و تعدیل کے مسلخ میں لائے جاتے ہیں اور انکی پوست کشی کی جاتی ہے بہت سے کذاب خبیث اور دجال وغیرہ قرار دئے جاتے ہیں اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے پھر ان ثقاۃ میں سے بھی کمتر ایسے ہیں جو جرح کی تیغ سے زخمی نہ ہوں ایک کو ایک اگر صادق کہتا ہے تو دوسرا اسی کو کاذب بتاتا ہے[۵۱]۔ اور یہ سب کچھ محض ظن، زی تخمین۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| قتل الخراصون ۵۱/۱۰ | اٹکل دوڑانے والے مارے پڑے۔ |

آپ کہیں گے کہ شک کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں مگر منکرین کو شک کی بیماری نہیں ہے اُنکا کہنا تو یہ ہے کہ یہ دین کا راستہ ہی نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا۔ دین کو براہ راست اللہ نبیؐ پر نازل کر دیتا ہے اس علیم و حکیم نے اپنے بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا ہے کہ عقل اور انسانیت کے خلاف پہلے وہ لاکھوں مردہ رگوں کو جرح و تعدیل کی بھٹی میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کریں[۵۲]۔ پھر دین کا پتہ لگائیں اس نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے:۔

---

[۵۱] کوئی خوش قسمتی سے اگر بالکل بیداغ نکل گیا تو تدلیس کے بے پناہ تیروں سے بچنا مشکل تھا بڑے بڑے ائمہ مثلاً حسن بصری مکحول شامی۔ سفیان ثوری۔ مالک بن انس اور دارقطنی وغیرہ اس کا نشانہ بنے ہوئے ہیں حافظ ابن مندہ نے تو امام بخاری و مسلم پر بھی وار کیا تھا مگر علماء حدیث نے بیچ میں پڑ کر روک لیا (طبقات المدلسین ابن حجر)

[۵۲] مذہبی جماعتوں میں ہم خیالی بڑی چیز ہے تعدیل میں زیادہ کار فرما یہی جذبہ تھا ذرا بھی کوئی اختلاف نکلا کہ مجروح ہوا۔ جرح و تعدیل کا منظر بھی ایک مضمون میں بسط کے ساتھ دکھانے کے قابل ہے۔

يا ايها الناس قد جاءكم من الله نورٌ وكتابٌ مبين يهدي به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ويخرجهم من الظلمات الى النور باذنه ويهديهم الى صراطٍ مستقيم ۵/۱۹

لوگو! اللہ کیطرف سے تمہارے پاس روشنی اور کتاب مبین آچکی۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے پیرو ہیں انکو اللہ اسکے ذریعہ سے سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے انکو تاریکی سے روشنی میں نکالتا ہے۔ اور سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

(۷) قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اسکا پیغام ایک' اسکی راہ عمل ایک اور اسکی منزل مقصود ایک ہے وہ کوئی فرقہ بنانے نہیں آیا ہے بلکہ اقوام عالم میں حق کو ذریعہ وحدت بنانا چاہتا ہے اس نے جملہ [illegible] امتوں کو ایک ہی امت قرار دیا ہے۔

ان هذه امتكم امة واحدة وانا ربكم فاعبدون ۲۳/۵۴

یہ تم سب کی امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے، اور میں تمہارا رب ہوں مجھی کو پوجو۔

فرقہ بندی کو وہ کفر ضلالت بلکہ شرک قرار دیتا ہے:۔

ان الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا لست منهم في شيء ۶/۱۶۱

جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا کرلیا اور گروہ گروہ ہوگئے ان سے (اے محمدؐ) تجھ کو کوئی واسطہ نہیں۔

ولا تكونوا كالذين تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءهم البينات واولئك لهم عذاب عظيم ۳/۱۰۲

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے نشانیوں کے آجانے کے بعد تفرقہ ڈالا وہ لوگ تو وہ ہیں جنکے لئے بڑا عذاب ہے۔

ولا تكونوا من المشركين من الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا كل حزب بما لديهم فرحون ۳۰/۳۲

تم مشرک نہ بنو یعنی وہ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہوگئے اور ہر جماعت اسی میں مگن ہے جو اسکے پاس ہے

یہ حق ہے کہ مسلمانوں میں جو جو فرقے پیدا ہوئے انکی بنیادیں خاص خاص روایتوں ہی پر تھیں [illegible] مذاہب اسلامی کی بنیادی سندیں جو روایات ہیں گنائی جاسکتی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر فرقہائے اسلامی کے محدثین اپنی اپنی کتابوں میں گنائی بھی ہیں علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق بہت سے فرقوں نے حدیثیں بنا بنا کر اپنے اصول مضبوط کئے ہیں اسلئے روایات تفریق وتشتت کا موجب ہوئیں جن سے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اگر قرآن پر جملہ اختلافات کا فیصلہ رکھا جاتا تو یقیناً کوئی تفریق نہیں ہوسکتی تھی [illegible]

لا يزالون مختلفين الا من رحم ربك ۱۱/۱۲۱

ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے [illegible] مہربانی کرے۔

مگر ہمارا مقصد جملہ بنی نوع انسان سے نہیں بلکہ "من رحم ربك" یعنی اہل حق اور مسلمانوں سے ہے کہ ان میں وحدت قائم رہتی۔

Marfat.com

کہا جا سکتا ہے کہ حدیثوں کے دین نہ ماننے پر بھی فہم قرآن میں اختلاف ممکن ہیں اسلئے پھر بھی فرقے پیدا ہو سکتے ہیں۔ بیشک فہم معانی میں اختلاف ہونگے لیکن ان کے اوپر فرقہ کی تعمیر نہ ہو سکے گی کیونکہ قرآن کی حقیقت ایک۔ تعلیم ایک۔ مفہوم ایک اور غرض اور منتہائے نظر ایک ہے۔ جو شخص کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کریگا علماء قرآن کے مسلسل غور و فکر کے بعد اگر وہ صحیح ثابت ہوگی تو تسلیم کر لیجائیگی ورنہ مسترد۔ بجنسہٖ اسیطرح جس طرح اس عالم مادی میں علماء طبیعی وغیرہ الگ الگ نظریے قائم کرتے ہیں پھر ایک مدت تک غور و فکر کرتے کرتے اُن پر انکی صحت یا غلطی نمایاں ہو جاتی ہے قرآن میں کامل صلاحیت اس بات کی موجود ہے کہ جملہ اختلافات کا قطعی فیصلہ کر سکے۔ وہ کتاب "مفصّل" اور تبیاناً لکلِ شیٔ ہے۔

یہ تو علمی پہلو ہے اور عملی پہلو سے تو قرآنی جمہوریت اسقدر وسیع اور روشن ہے کہ اسمیں بجائے وحدت کے تفریق ہو ہی نہیں سکتی اسلام کا ابتدائی عہد یعنی قرون اول جس میں نہ حدیثیں مدون ہوئی تھیں نہ انھوں نے دینی حیثیت حاصل کی تھی خالص عمل بالقرآن کا دور تھا جس نے ہر لحاظ سے انکو خیر القرون بنا دیا تھا۔ تفرقے اسی وقت سے پیدا ہوئے جب سے روایت اور شخصیت پرستی آئی۔

کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کو تمام امت نے شرق سے غرب تک دینی حجت تسلیم کر لیا پھر اسمیں تمھارے لئے بحث کی گنجائش کہاں رہی، جواب یہ ہے کہ تمھارے نزدیک چار دلیلیں ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس اور اسی ترتیب سے انکے مدارج ہیں کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہے اجماع سے جو فرد تر حجت ہے ثابت کرنا چاہتے ہو یعنی اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی سے دکھانا چاہتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمھارا مشعل تاریک ہے۔ اجماع سارے عالم کے نزدیک صرف ایک ہنگامی چیز ہے یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اسکو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے۔

ان دلائل کے علاوہ منکرینِ حدیث نے اُن مضر اثرات اور نتائج پر بھی بسط کیساتھ بحثیں کی ہیں جو روایت پرستی سے پیدا ہوئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ انھوں نے حدیثوں کی بے اعتباری ثابت کرانے کی کوشش کی ہے مگر میں نے اس مضمون میں اُن باتوں کو قصداً چھوڑ دیا کیونکہ موضوع بحث یعنی حدیثوں کے دینی حجت ہونے یا نہ ہونے سے انکو زیادہ تعلق نہیں۔

Marfat.com

# حکمِ وصیت و قانونِ وراثت

(حضرت مولانا شاہ عمادی مجیبی پھلواری شریف)

قرآن مبین نے ہر مسلمان پر فرض کیا ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو اپنے مال متروکہ کے بارے میں اپنے والدین و قریب تر رشتہ مندوں کے لئے مناسب وصیت کرجائے آیت یہ ہے :-

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا ۖ الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین ۝ فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ ان اللہ سمیع علیم ۝ فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینہم فلا اثم علیہ ان اللہ غفور رحیم ۝ (بقرہ پ ۲ ع ۲۲)

(اے مسلمانو) تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو اپنے باپ ماں اور قریب تر رشتہ مندوں کے لئے وصیت کرجائے مناسب وصیت۔ یہ متقی لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ ایک حق ہے۔ (ان کے پس ماندوں کا) تو جو شخص اس وصیت کو سن لینے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ اس بدلنے والے پر ہوگا بیشک اللہ جاننے والا اور سننے والا ہے۔ ہاں جو شخص وصیت کرنے والے سے ڈرا اس کی بے انصافی یا گناہ کی (وصیت کی) وجہ سے تو اس نے ان پسماندوں کے درمیان [illegible] تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اللہ بخش دینے والا مہربان ہے۔

چونکہ اس قسم کے معاملات میں گواہی کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ وصیت کے وقت دو گواہ بھی ضرور رکھ لو۔ چنانچہ ارشاد ہوا :-

یایہا الذین امنوا شہادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنٰن ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم ان انتم ضربتم فی الارض فاصابتکم مصیبۃ الموت تحبسونہما من بعد الصلوٰۃ فیقسمٰن باللہ ان ارتبتم لا نشتری بہ ثمنا ولو کان ذا قربیٰ ولا نکتم شہادۃ اللہ انا اذا لمن الاثمین ۝

اے ایمان والو جب تمہاری موت کا وقت آجائے اور تم وصیت کرنے لگو تو تمہارے درمیان [illegible] تم میں سے دو انصاف ور گواہ ہوں [illegible] اور سفر ہی میں موت کا وقت آگیا اور اپنی جماعت سے دو گواہ نہ ملیں تو غیر جماعت کے دو انصاف ور گواہ ہوں۔ ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد تک مسجد میں روکے رکھو پھر اگر تم لوگوں کو (اس وصیت کے متعلق) [illegible]

فان عثر علی انهما استحقا اثما فاٰخران یقومٰن مقامهما من الذین استحق علیهم الاولیٰن فیقسمٰن باللہ لشهادتنا احق من شهادتهما وما اعتدینا انا اذا لمن الظٰلمین ۝ ذٰلک ادنیٰ ان یاتوا بالشهادۃ علیٰ وجهها او یخافوا ان ترد ایمان بعد ایمانهم واتقوا اللہ واسمعوا واللہ لا یهدی القوم الفٰسقین ۝

(مائدہ پ۷ ع۳)

دونوں اللہ کی قسم کھائیں۔ کہ ہم اپنے اس حلفیہ بیان پر کوئی قیمت (دنیاوی) نہیں حاصل کرتے۔ اگرچہ وہ (جس کے حق میں وصیت ہے) قرابت مند ہی ہمارا ہو اور ہم اللہ کی گواہی کو چھپاتے نہیں۔ (اگر ہم ایسا کر رہے ہیں) تو اس وقت بے شک ہم ظالموں میں سے ہیں۔ پھر اس کا اگر پتہ ل گیا کہ ان دونوں گواہوں نے (اپنی گواہی کے ذریعے) حق مارا ہے گناہ کر کے، تو دو دوسرے گواہ ان دونوں کی جگہ کھڑے ہو جائیں ان لوگوں میں سے جن کا حق مارا ہے ان دونوں نے جو اولی تھے (شہادت میں) تو اب یہ دوسرے قسم کھائیں اللہ تعالیٰ کی کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ حق ہے اور ہم نے حدِ صداقت سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا کیا ہو تو ہم لوگ اس وقت ظالموں میں سے ہیں (حاشیہ دیکھئے) اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت وہ (جو اولے ہیں شہادت کے لئے) ٹھیک اس طرح پر یا وہ ڈریں کہ (ان کی) قسم رد نہ کر دیجائے ان (وارثوں یا دوسرے گواہوں) کی قسم کے بعد تو ڈرو اللہ سے اور (اس کے احکام گوشِ دل سے) سنو۔ اور اللہ بدکاروں کی ہدایت نہیں کرتا۔

قرآن مبین میں ناسخ و منسوخ کی بحث فرقہ بند علماء کی یادگار ہے۔ حدیثیں تو ہر فرقے نے اپنے اپنے موافق خود بھی گھڑلیں اور دوسروں کی گڑھی حدیثیں بھی جمع کر لیں اور اپنے خلاف جو حدیثیں پائیں ان پر کچھ جرحیں کر کے ان کو موضوع یا ضعیف کہہ دیا، یا ان کی کوئی تاویل پیش کر دی۔ مگر آیات قرآنیہ کو کیا کرتے ہو؟ تو اگر اختلافات قرارت سے کام چلا تو متواتر قرارت قرارت کے خلاف کسی صحابی یا تابعی کی طرف منسوب کوئی قرارت پیش کر کے اپنا کام نکالا اور کبھی ناسخ و منسوخ کی بحث چھیڑ کر۔ مگر اس وقت میرا یہ موضوع بحث نہیں ہے اس لئے میں اس بحث سے قطع

---

لے تعاقُ، اتقاق، باہم حق کے لئے لڑنا۔ کہ ہر فریق اپنے کو حق پر کہے یا اپنا حق بتلائے استحقاق حق مارنا، حق دبا لینا۔ جب علیٰ اس کے صلے کے ساتھ آئے اور متعدی ہو تو اس معنی میں آتا ہے۔ الاولیان استحق کا فاعل ہے جو لوگ آخران کی صفت اسکو قرار دیتے ہیں وہ نحوی قواعد کو نظرانداز کر جاتے ہیں، نکرہ کی صفت معرفہ لانا۔ پھر استحق کا فاعل ڈھونڈھتے پھرنا اور جب نہ ملے تو اثم کو اس کا فاعل بنانا رکیک پر رکاکت کا ارتکاب ہے۔ اختلاف قرارت والوں کو تو نہ پوچھئے ان کا ذکر ہی بیکار ہے اصل یہ ہے کہ جنکو میت نے مرنے کے وقت اپنی وصیت کا گواہ بنایا وہی گواہی کے لئے اولیٰ سمجھے جاسکتے ہیں انکو اپنی قسم کا وقار خود رکھنا چاہئے۔ میت نے انھیں کو شہادت کیلئے منتخب کیا یا وہی وہاں پر تھے اسلئے ان پر اعتماد کیا تو وہی اولےٰ بالشہادۃ ہیں گر ان کے خلاف وارثوں کے پاس اگر دلائل ہیں تو یہ کیوں ایسی قسمیں کھائیں جو انکی قسم وارثوں کی قسم سے رد کر دی جائے۔

نظر کرتے ہوئے لکھتا ہوں کہ آیات وراثت سورۂ نساء میں ہیں اور یہ سورہ جب کہ کہا جاتا ہے کہ سورۂ بقرہ کے بعد نازل ہوا ہے مگر سورہ مائدہ تو بالکل آخری سورتوں میں ہے۔ سورہ مائدہ کے بعد تو صرف سورۂ توبہ اور اس کے بعد آخری سورہ نصر نازل ہوا ہے۔ اس لئے سورۂ نساء سے تو سورۂ مائدہ کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ کسی روایت میں ہے کہ سورہ مائدہ کی یہ آیت جو شہادت وصیت کے متعلق آئی ہے اس کا نزول سورہ نساء کی آیت وراثت کے بعد ہوا۔

اس کے علاوہ ناسخ و منسوخ کا اصول تو یہ ہے کہ دونوں کا اجتماع محال ہو۔ اسلئے مجبوراً ایک کو ناسخ دوسرے کو منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر یہاں آیتِ حکم وصیت اور آیتِ قانون وراثت میں کسی طرح کا تضاد نہیں کہ دونوں کے احکام پر عمل عقلاً محال ہو۔

اوّل تو آیت وصیت کی رو سے وصیت کا حکم مرنے والے کو ہے اور تقسیم وراثت کو کم ورثہ یا حاکم شرع کو اور حکم دو شخصوں کو الگ الگ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک حکم کی وجہ سے دوسرا حکم منسوخ ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت وراثت میں جس کا حصہ بھی بیان کیا ہے۔ من بعد وصیۃ کی قید کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آیات قانون وراثت وصیت کے حکم کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے نازل کی گئی ہے۔ تو جو حکم پہلے حکم کو باقی رکھ رہا ہے، فقہا کس طرح اس حکم کو اس پہلے حکم کا منسوخ کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔

لے دے کر سب سے بڑا سہارا ان لوگوں کی ایک حدیث ہے لا وصیۃ لوارث اور چونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ آیات قرآنی سے زیادہ حدیثوں کو اہمیت دیں۔ اس لئے کتنوں نے تو صرف اسی حدیث سے حکم وصیت والی آیت کو منسوخ کہہ دیا۔ جو ذرا اس میں ہچکچائے تو انھوں نے آیات وراثت سے آیت وصیت کو منسوخ کہہ کر گویا اس اعتراض سے اپنا بچاؤ کر لیا کہ یہ قرآن کو روایت کے ذریعہ منسوخ کر رہے ہیں۔

## اگر یہ حدیث نہ ہوتی؟

اگر یہ حدیث لا وصیۃ لوارث کی ان فقہاء و محدثین کے پاس نہ ہوتی تو کیا یہ لوگ آیت حکم وصیت کو قانون وراثت کی آیتوں سے باوجود ہر حصے کی تقسیم کے بعد "من بعد وصیۃ" کی قید موجود ہونے کے منسوخ کہہ سکتے تھے؟ حاشا و کلا کبھی نہیں۔

## کیا یہ حدیث واقعی متواتر ہے؟

متواتر کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ صحابہ و تابعین و اتباع تابعین تینوں دوروں میں اس حدیث کے راوی اتنے زیادہ ہوں کہ یہ گمان نہ کیا جاوے کہ اتنی بڑی جماعت نے ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے پر اتفاق کر لیا ہوگا۔

یہ تعریف ہر چند ناقص ہے مگر جو تابعین و اتباع تابعین ہی کے زمرے میں ہیں آئی دروغ بافوں

ان کی ایک باضابطہ مکمل سازش سے بے خبر اگر اپنے کو رکھا جائے تو ضرور نہایت صحیح اور مناسب معلوم ہوگی۔ ورنہ اگر ان عجمی تابعین و اتباع تابعین کے سامنے یہ تقریف، متواتر حدیث کی بیان کی جاتی تو وہ اگرچہ زبان سے تو کچھ کہتے مگر اس کی تصحیح و تصدیق بڑے زوروں پر کرتے، مگر دل ہی دل میں یہ ضرور کہتے کہ تم کیا کہتے ہو کہ اتنی بڑی جماعت کا ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے پر متفق ہونا عقلاً محال ہے حالانکہ بارہا کردیم و شد۔

## طرق روایت پر بحث

بہرحال اب اس حدیث کے طرق روایت پر نگاہ ڈالئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث امام مالک کے موطا اور صحیح مسلم میں بالکل نہیں۔ صحیح بخاری نے باب تو ضرور باندھا ہے باب لا وصیۃ لوارث۔ مگر اسی باب کے تحت میں اس مضمون کی ایک حدیث بھی انکو نہ مل سکی۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک ذاتی رائے انھوں نے نقل کی ہے جس میں لا وصیۃ لوارث کا لفظ بھی نہیں نہ پوری طرح یہ مفہوم اس سے نکل سکتا ہے۔ عنقریب آپ اسکی تصریح ملاحظہ فرمائیں گے۔

غرض اسی حدیث سے مؤطا، بخاری و مسلم تینوں قدیم اور معتبر کتابیں جو علمائے حدیث میں تمام دوسری کتب حدیث سے زیادہ معتبر ہیں بالکل خالی ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ان لوگوں کے زمانۂ جمع و تدوین احادیث تک یہ حدیث گڑھی ہی نہیں گئی تھی۔ یا کم سے کم اس وقت تک ایسے راویوں کی زبانوں تک نہیں پہنچی تھی جن کو یہ امام مالک و امام بخاری و امام مسلم سند و حجت سمجھتے تھے۔

## سنن ابوداؤد

میں دو باب اس سلسلے میں ہیں۔ پہلا باب فی نسخ الوصیۃ للوالدین والاقربین یعنی والدین اور اقربین کے لئے وصیت کے حکم کا منسوخ ہونا۔ اس باب میں کوئی حدیث رسول نہیں بلکہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے۔ وھو ھذا۔

حدثنا احمد بن محمد المروزی حدثنی علی بن حسین بن واقد عن ابیہ عن یزید النحوی عن عکرمۃ عن ابن عباس رض ان ترک خیرا ان الوصیۃ للوالدین والاقربین۔ فکانت الوصیۃ کذالک حتی نسختھا آیۃ المیراث

ابوداؤد سے احمد بن محمد المروزی نے، اُن سے علی حسین بن واقد نے، ان سے ان کے باپ نے، ان سے یزید نحوی نے ان سے عکرمہ بربری نے ان سے حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین (یہ آیت پڑھ کر کہا) کہ تھی وصیت اس طرح یہاں تک کہ اس آیت کو آیت میراث نے منسوخ کردیا۔

## بخاری کی روایت

بخاری کی روایت کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ بھی حضرت ابن عباس رضؓ ہی کا قول کہا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس پر بھی بحث کردی جائے وہ روایت یہ ہے

باب لا وصیۃ لوارث۔ حدثنا محمد بن یوسف عن ورقاء عن ابن ابی نجیح عن عطاء عن ابن عباسؓ قال کان المال للولد وکانت الوصیۃ للوالدین فنسخ اللہ من ذلک ما احب فجعل للذکر مثل حظ الانثیین فجعل للابوین لکل واحد منھما السدس وجعل للمرأۃ الثمن والربع للزوج الشطر والربع۔

یہ باب ہے اس بارے میں کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔ امام بخاری سے محمد بن یوسف نے ان سے ورقا نے ان سے ابن ابی نجیح نے ان سے عطا نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مال پہلے بیٹے کے لئے تھا اور وصیت والدین کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا اسکو منسوخ کیا تو اولاد میں سے مرد کے لئے دو عورت کا حصہ رکھا اور باقی میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی۔

## تنقید حدیث کا ایک نہایت اہم طریقہ

جو حدیث درایت قرآنیہ کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، مگر متعدد طرق سے اسکی روایت اسطرح نظر آتی ہو کہ اس پر متواتر یا بہت زیادہ مشہور ہونے کا گمان کیا جاسکے اور اس کے کثرت طرق کو دیکھ کر اس حدیث کو باطل و موضوع کہنے کی ہمت نہ پڑتی ہو، تو اس حدیث کے تمام طرق کو اور اس کے راویوں کو پوری تحقیق کے ساتھ دیانت و بازپرس آخرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہئے کہ اس کے راوی کون کون ہیں اور کہاں کہاں کے رہنے والے ہیں۔

حضرت امیر المومنین اعظم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب عہد فاروقیؓ میں ایران فتح ہوا تو اسی وقت سے منافقین ایران نے خراسان کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جد و جہد جاری رکھنے کے لئے مرکز بنالیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عہد عثمانی میں دوسرا مرکز ان منافقین عجم کا کوفہ بنا۔ یہی دو اصل مرکز منافقین عجم کے رہے، مگر ان کے علاوہ بصرہ، قرسط، مصر، نصیبین، موصل اور عراق کے پاس چھوٹے بڑے گاؤں میں اور شام کے اکثر شہر مثلاً حمص، دمشق، قیساریہ، فلسطین، انطاکیہ، بصیصہ، طرطوس اور قنسرین وغیرہ میں بھی چھوٹے چھوٹے مراکز ان کے رہے لیکن حدیثوں کے گڑھنے کی اصل ٹکسال خراسان اور کوفہ ہی رہے۔ وقتی طور سے ان چھوٹے چھوٹے مراکز میں بھی ٹکسال قائم کرلی جاتی تھی۔ مگر چونکہ اس فن کے ماہرین زیادہ تر خراسان اور کوفہ ہی میں تھے۔ اس لئے حدیثیں عموماً انہیں دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ گڑھی جاتی تھیں اور دوسرے مراکز سے ان کی اشاعت کا انتظام کیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک خراسان کی طرح نیشاپور بھی ان وضاعین وکذابین کا مرکز رہا ہے۔ مگر آخر میں سب سے بڑا مرکز اور سب سے بڑی ٹکسال کوفہ ہی بن گیا۔ اسی لئے

Marfat.com

جتنے وضاعین وکذابین کوفے میں ہوئے اور کہیں نہیں ہوئے اور شام کا پورا علاقہ ان منافقین کی زبردست اشاعت گاہ رہا تو ایسی حدیثوں کے رُوات آپ کو یقیناً انہی جگھوں کے رہنے والے یا یہاں سے تعلق رکھنے والے ہی ملیں گے، اور آپ کو تھوڑی چھان بین سے پتہ مل جائے گا کہ یہ تمام طرق انہی جگھوں میں سے کسی ایک یا دو تین جگھوں سے پھیلے ہیں۔

## حضرت ابن عباس کا قول

وہ قول جس کو امام بخاری کی کتاب میں دیکھتے ہیں گڑھا تو گیا خراسان میں مگر اس کے گڑھنے والے اپنے فن کے ماہر نہ تھے اسلئے اس میں بعض رکاکتیں رہ گئیں۔ جن کو بعد والوں نے محسوس کیا تو پھر ایک نئی روایت گڑھ ڈالی اور وہ بھی خراسان میں ہی گڑھی گئی جسکو سنن ابی داؤد میں آپ دیکھتے ہیں اس میں وہ رکاکتیں نکال دی گئیں۔ بخاری کی روایت میں جو رکاکتیں ہیں ان کو بھی عنقریب بتا دوں گا۔ جب متن حدیث پر بحث ہوگی۔ ابوداؤد کی روایت تو اوّل سے آخر تک مروزیوں یعنی "مرو"[۵۱] کے رہنے والوں سے چلی ہے۔ احمد بن محمد المروزی دو ہیں۔ احمد بن محمد بن ابراہیم المروزی متوفی ۲۸۳ھ اور احمد بن محمد بن موسیٰ المروزی متوفی ۲۳۵ھ مگر کسی کے تذکرے میں یہ مذکور نہیں کہ ان سے ابوداؤد صاحب سنن نے بھی روایت کی ہے اور نہ دو میں سے کسی کے ذکر میں یہ مذکور ہے کہ یہ علی بن حسین بن واقد المروزی سے روایت کرتے ہیں اسلئے معلوم نہیں کہ یہ کون احمد بن محمد المروزی ہیں۔ بہرحال ہیں وہ مروزی ہی جو بھی ہوں۔

علی بن حسین واقد المروزی کو تو کتب رجال والے ضعیف الحدیث خود تسلیم کر رہے ہیں اور مرجبہ بھی لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب میں ابن حجر نے اور میزان الاعتدال میں امام ذہبی نے دونوں ہی نے لکھا ہے کہ امام ابوحاتم نے ان کو ضعیف الحدیث کہا ہے اور امام اسحٰق بن راہویہ ان کے بارے میں نہایت بُرا خیال رکھتے تھے اور ابن حبان نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رات دن انکے سامنے سے گزرتے تھے مگر ایک حرف بھی ان سے نہیں لکھا۔ یعنی امام بخاری ان کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ انکی حدیث لکھی جائے یہ ۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے" اور ان کے والد بزرگوار حسین بن واقد المروزی متوفی ۱۵۹ھ (بقول صحیح) کی حدیثوں سے امام احمد بن حنبل نہایت سختی کے ساتھ انکار فرماتے ہیں اور یزید بن ابی سعید الخوری بھی مروزی ہی تھے۔ قریش خاندان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۱۳۱ھ میں ابومسلم خراسانی نے انھیں قتل کرا دیا تھا۔

---

[۵۱] "مرو" خراسان کا ایک مشہور شہر تھا جہاں وضاعین وکذابین کا ایک جگھٹا رہتا تھا۔

Marfat.com

غرض ابوداؤد[۵] کی اس روایت کا سلسلہ صرف خراسانیوں سے چلا ہے "مرو" خراسان ہی کا ایک شہر تھا۔

**امام بخاری کی روایت**

اب بخاری کی روایت پر نظر ڈالیے۔ امام بخاری حضرت ابن عباس کا قول روایت کرتے ہیں محمد بن یوسف بن واقدی عثمان الضبی سے۔ یہ بھی ایک غلام آزاد کردہ تھے "فاریاب" جو بلاد ترک میں سے ایک شہر تھا۔ دراصل وہیں کے رہنے والے تھے۔ مگر قیساریہ جو ساحل بحر شام پر آباد تھا وہیں رہتے تھے۔ لیکن ایک مدت تک کوفہ میں بھی رہے اور سفیان ثوری وغیرہ کی خدمت میں حاضر باش رہے۔ سفیان ثوری سے ایسی ایسی روایتیں کرتے تھے، جو ان کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا تھا۔ اس لئے لوگ ان کی روایتوں کے متعلق ذرا مشتبہ سے رہتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین نے انکی بعض حدیثوں کو باطل بھی کہا ہے۔ سنہ۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔ مگر چونکہ امام بخاری نے ان سے ۲۶ حدیثیں روایت کی ہیں اس لئے ائمہ رجال نے ان کی توثیق کی ہے۔

ورقاء بن عمر بن کلیب الیشکری۔ یہ کوفی تھے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ یہ خراسان کے ہیں یعنی خراسانی ہیں مگر کوفہ میں آکر رہ گئے تفسیر میں مشہور تھے۔ مگر امام احمد نے فرمایا کہ یہ تفسیر میں تصحیف بہت کیا کرتے تھے۔ [illegible] نے یحییٰ القطان سے پوچھا کہ تم نے منصور کی حیثیت سنی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ پوچھا کس سے؟ کہا ورقاء سے انھوں نے کہا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وکیع تفسیر بیان کرنے لگے تو ابراہیم الحربی نے لوگوں سے کہا کہ انکی تفسیر سے ان کی تفسیر میں کلبی اور ورقاء کی تفسیری روایتیں نہیں ہوتیں۔ کلبی مشہور کذاب و مفتری تھا۔ اسکے بارہ ورقاء کا ذکر بالکل اسی نوعیت میں آتا ہے کہ دونوں ہی تفسیری روایتوں کے راوی ہیں اور ایک ہی [illegible] دونوں کذاب ہیں۔

ورقاء کی ولادت یا وفات کا سال ابن حجر وغیرہ نہیں لکھتے۔ مگر یہ لکھا ہے کہ ابوالنذر اسمٰعیل بن عمر ان کی وفات کے وقت آئے تھے اور ابوالنذر کی وفات سنہ۲۰۰ھ کے بعد ان کے ترجمے میں لکھی ہے۔ اسلئے ورقاء کی وفات سنہ۲۰۰ھ میں یا اس کچھ پہلے ہوئی ہوگی۔

---

۵ امام ابوداؤد جن کی کتاب سنن ابی داؤد مشہور ہے اور صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے۔ ان کا پورا نام سلیمان بن الاشعث ہے۔ سنہ۲۰۲ھ میں انکی ولادت ہے اور ۲۷۵ھ میں وفات۔ ان کے ترجمے میں ان کے شیوخ کے نام بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں مگر کوئی بھی شیوخ میں احمد بن محمد المروزی کا نام نہیں لکھتا ہے۔ عجب کیا ہے کہ یہ حدیث ایک سلسلہ اسناد قائم کرکے انکی کتاب میں داخل کر دی گئی ہے۔ ورنہ کیا معنی کہ احمد بن محمد المروزی کا نام نہ ابوداؤد کے شیوخ میں مذکور ہے نہ علی بن حسین بن واقد کے تلامذہ میں [illegible] المروزی نام کے جو دو شخص کتب رجال میں ملتے ہیں ان کے شیوخ میں علی بن حسین بن واقد کا نام آتا ہے نہ ان کے تلامذہ میں ابوداؤد کا نام ہے نہ ذکر ہے۔

Marfat.com

تو اب صاف پتہ مل گیا کہ ابوداؤد اور بخاری دونوں کی روایتوں کا اصل منبع اور ٹکسال خراسان ہی ہے۔ پہلی روایت یعنی بخاری والی پورے حزم و احتیاط سے نہ بن سکی، اس لئے اس میں کسی قدر رکاکت رہ گئی، جسکو متن حدیث کی تنقید ہی میں ابھی بیان کرتا ہوں۔ اسلئے جب حلقۂ وضاعین نے اس کمزوری کو محسوس کیا تو جھٹ دوسری روایت وضع کر ڈالی اور وہ رکاکت نکال دی۔ بخاری والی روایت ورقار کے ذریعے خراسان سے کوفہ پہنچی تھی، اور پھر کوفے سے بذریعہ محمد بن یوسف فیساریہ ساحل شام تک پہنچی اور پھر امام بخاری کو مل گئی یا انکی کتاب میں داخل کردی گئی۔ ایسی رکیک حدیث، محض ابن عباس کا ایک قول ایسے کمزور ذرائع سے امام بخاری خود اپنی کتاب میں داخل کر لیتے اور اسی کے لئے ایسے الفاظ میں باب باندھتے جو قرآن کی نص صریح کے خلاف ہو اور اس کے لئے کوئی قوی یا ضعیف ہی حدیث نبویؐ بھی ان کو نہ مل رہی ہو، ہرگز امام بخاری سے اسکی توقع نہیں کی جاسکتی اسلئے یقیناً یہ باب ہی معہ حدیث بخاری میں داخل کردیا گیا ہے۔

**رکاکت معنوی** امام بخاری کی روایت اور اس کا ترجمہ پڑھ جایئے۔ حضرت ابن عباس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "مال پہلے ولد (بیٹے) کے لئے ہوا کرتا تھا اور وصیت والدین کے لئے" غور کیجئے کیا اس سے کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین کے حکم وصیت کی تعمیل کا رواج عہد نبوی میں جو ہوا، وہ مراد ہو سکتا ہے؟ اس آیت میں تو وراثت ولد کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ ابن عباسؓ کے قول میں صرف ولد کا ذکر ہے جس میں بیٹی کو بھی داخل سمجھا جاسکتا ہے اور صرف بیٹا بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت نہیں ہے۔ بلکہ اقربین کے لئے بھی وصیت کا حکم ہے اور الاقربین میں اولاد بدرجۂ اولےٰ داخل ہیں۔ ابن عباسؓ کے اس قول میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت کا دستور بیان کیا گیا ہے۔ اگر واقعی یہ قول ابن عباسؓ کا ہے تو اس سے زمانۂ جاہلیت کے رواج کا بیان سمجھا جاسکتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بیٹی کے لئے وراثت نہ تھی نہ وصیت۔ وراثت صرف بیٹے کا حق تھا اور مرنے والا والدین کے لئے کچھ وصیت کر جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ابن عباسؓ نے زمانۂ جاہلیت کے اس رواج کا ذکر کرکے فرمایا ہو کہ "وراثت بیٹے کا حق تھا اور وصیت والدین کے لئے کی جاتی تھی۔ تو اللہ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا اسکو منسوخ کردیا۔ اس کے بعد بخاری ابن عباس کا قول یوں لکھتے ہیں "تو اولاد میں سے ایک مرد کے لئے دو عورت کا حصہ رکھا اور باپ ماں ہر ایک کے لئے ایک چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی"

مگر پھر حضرت ابن عباس یہاں بھولے۔ بیوی اور شوہر کے لئے تو دونوں حالتوں میں اولاد ہو جب کیا ملے اور اولاد نہ ہو جب کیا ملے، تصریح کے ساتھ بیان کیا۔ مگر والدین کے متعلق صرف ایک ہی صورت میں یعنی میت کے

Marfat.com

اولاد ہو تو کیا ملے۔ اسی کو بیان کیا اور اگر میت لاولد ہو تو ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کا ذکر بھول گئے۔ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں جب ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کی بھی تصریح نہ کی۔ جب کہ بیوی اور شوہر کے حصّوں میں جو جو فرق اولاد کے ہونے یا نہ ہونے اور بھائی بہن کے ہونے یا نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں، ان کو بھی تو ضرور مذکور ہونا تھا، ورنہ جس طرح ابوداؤد والی روایت میں تصریح حصص کو چھوڑ دیا ہے اس روایت میں بھی تصریح حصص نہ ہوتی۔ غرض بیان رواج سابق اور حصّوں کی تصریح کرکے اس روایت کی متن کو رکاکتوں سے بھر دیا ہے۔ جو ہرگز ہرگز حضرت ابن عباس کا قول نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یقیناً یہ روایت صحیح بخاری میں داخل کردی گئی ہے، امام بخاری نے کبھی نہیں لکھی ہوگی۔

مختصر یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب یہ دونوں قول خراسانیوں کے من گھڑت ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔

## اصل حدیث

اب لا وصیۃ لوارث والی حدیث کے عروق روایت کو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ حدیث تین صحابیوں سے روایت کی گئی ہے۔ عمرو بن خارجہ۔ ابوامامۃ الباہلی اور انس بن مالک

**سلسلۂ اسناد**

۱؎ قتادہ۔ شہر بن حوشب الشامی۔ عبدالرحمٰن بن غنم۔ عمرو بن خارجہ۔

۲؎ ہشام بن عمار۔ اسمٰعیل بن عیاش۔ شرجیل بن مسلم الخولانی۔ ابوامامۃ الباہلی

۳؎ ہشام بن عمار۔ محمد بن شعیب بن شابور۔ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر۔ سعید بن ابی سعید۔ انس بن مالک۔

پہلی روایت کو ابن ماجہ ابوبکر بن شیبہ سے وہ یزید بن ہارون سے وہ کہمس بن ابی عروبہ اور وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ترمذی و نسائی قتیبہ بن سعید سے وہ ابوعوانہ سے وہ قتادہ سے اور نسائی اسمٰعیل بن مسعود سے بھی اور وہ شعبہ سے وہ قتادہ سے۔ مگر ان تمام روایتوں میں قتادہ، شہر بن حوشب سے وہ عبدالرحمٰن بن غنم سے وہ عمرو بن خارجہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن نسائی کی ایک آخری روایت میں جو نسائی عتبہ بن عبداللہ المروزی سے وہ عبداللہ بن المبارک سے وہ اسمٰعیل بن ابی خالد سے اور وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں قتادہ بلاواسطہ کسی کے عمرو بن خارجہ سے روایت کر رہے ہیں، جو یقیناً خلاف اصل ہے۔ اس میں شہر بن حوشب اور عبدالرحمٰن بن غنم کے دو واسطے چھوٹے ہوئے ہیں۔ قتادہ غریب نے عمرو بن خارجہ صحابی کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔

تو یہ روایت دراصل شہر بن حوشب سے ہے۔ جو شامی ہیں اور بیت المال کے خازن تھے۔ روپے کی ایک تھیلی چرائی تھی، جس پر اُس وقت کے ایک شاعر نے ان کی شان میں کچھ اشعار کہے تھے، جس کا

Marfat.com

ایک شعر یہ ہے:۔

ولقد باع شہر دینہ بخریطۃ
فمن یأمن القراء بعدک یا شہر

یعنی شہر نے اپنا دین ایک تھیلی پر بیچ ڈالا۔ تو پھر تیرے بعد اے شہر قاریوں پر کون بھروسا کرے؟

شہر نے ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ ائمہ رجال اس سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے کوئی حدیث عبدالرحمن بن غنم سے سُنی ہو۔ شعبہ اور محدثین کی ایک جماعت نے شہر بن حوشب کو ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے اور ابن حزم نے ساقط عن الاعتبار لکھا ہے۔ عباد بن منصور کا بیان ہے کہ میرے ساتھ یہ حج کو گئے تھے تو راہ میں میرا عیبہ (سوٹ کیس) چرا لیا۔ یہ شہر صاحب اسماء بنت یزید بن السکن کے غلام آزاد کردہ تھے۔ غرض انھیں کی روایت سے یہ حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف منسوب حدیث ابن ماجہ، نسائی اور ترمذی میں ہے۔ ان کے سوا کوئی اس حدیث کو روایت نہیں کرتا۔

## ابوامامہ والی حدیث

یہ حدیث صرف اسمٰعیل بن عیاش الحمصی سے ابن ماجہ، ابوداؤد اور ترمذی روایت کرتے ہیں۔ ابن ماجہ، ہشام بن عمار سے وہ اسمٰعیل بن عیاش سے اور ابوداؤد عبدالوہاب بن نجدہ سے۔ وہ اسمٰعیل بن عیاش سے اور ترمذی ہناد اور علی بن حجر سے اور یہ دونوں اسمٰعیل بن عیاش سے اور اسمٰعیل بن عیاش شرحبیل بن مسلم الخولانی سے وہ حضرت ابوامامۃ الباہلی سے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔

اسمٰعیل بن عیاش شامی ہیں۔ حمص کے رہنے والے ہیں۔ صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام مسلم لکھتے ہیں:۔ بقیہ بن الولید جو روایت مشہور و معروف لوگوں سے کریں، اس کو لکھ لینا چاہئے اور جو روایت غیر معروف مجہول لوگوں سے کریں نہیں لکھنا چاہئے۔ مگر اسمٰعیل بن عیاش چاہے مشہور و معروف لوگوں سے روایت کریں چاہے مجہول راویوں سے انکی کسی قسم کی بھی حدیث ہرگز نہیں لکھنا چاہئے اور عقیلی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ کچھ سمجھتا ہی نہیں کہ اس کے دماغ سے کیا نکل رہا ہے۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ اس کی حدیثوں سے احتجاج کرنا ہی نہیں چاہئے اور عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ ان کی حدیث کی روایت جائز نہیں۔ منوی نے بھی ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے، جن کی روایتوں کی طرف سے منہ پھیر لینا چاہئے۔ ۱۸۱ھ میں وفات پائی۔ بس اسی اسمٰعیل بن عیاش سے حضرت ابوامامۃ الباہلی کی طرف منسوب روایت کا دارومدار ہے۔

## حضرت انس والی حدیث

یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی میں نہیں ہے۔ صرف ابن ماجہ میں ہے۔ ابن ماجہ ہشام بن عمار سے بذریعہ اسمٰعیل بن عیاش، ابوامامۃ الباہلی والی حدیث بھی روایت کرتے ہیں اور پھر ہشام بن عمار ہی سے بذریعہ محمد بن شعیب بن شابور اور وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔

Marfat.com

ہشام بن عمار بن الدمشقی۔ یہ ایسی چار سو حدیثیں روایت کیا کرتے تھے جنکی کوئی اصل نہ تھی بعض لوگ ان کو اِدھر اُدھر سے حدیثیں لا لا کر دیتے تھے اور یہ ان کو روایت کیا کرتے تھے۔ بعض محدثین نے ہشام بن عمار سے کہا کہ تم اسلام میں ضرور کوئی فتنہ پیدا کروگے تو ہشام نے کہا کہ میری حدیثیں مروج ہو چکیں۔ مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ انکی غلطیاں کس کے سر پڑیں گی۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ جس نے ہشام بن عمار کے پیچھے نماز پڑھی ہو اس کو چاہئے کہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ ہشام ۱۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۵ھ میں دمشق ہی میں دنیا سے سدھارے۔

اور محمد بن شعیب بن شابور بھی دمشقی ہی تھے۔ بنی امیہ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے مرجیہ تھے ۱۹۹ھ میں وفات پائی۔

اور عبدالرحمن بن یزید بن جابر ازدی۔ یہ بھی شامی ہیں ۱۵۴ھ میں بقول اصح وفات پائی [illegible] تھے اہل کوفہ سے منکر حدیثیں بہت روایت کیں۔

باقی رہ گئے سعید بن ابی سعید۔ ان کے متعلق بعد محدثین کا خیال ہے کہ یہ مقبری ہیں جو مدینہ طیبہ کے [illegible] قبر کے مجاور تھے۔ جن کے باپ قبیلہ بنی لیث کی ایک عورت کے مکاتب غلام تھے۔ ۱۲۳ھ میں انہوں نے وفات پائی اور وفات سے چار سال پہلے مخبوط الحواس ہو گئے تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث سعید بن ابی سعید المقبری سے مروی ہی نہیں ہے۔ اس حدیث [illegible] روایت میں چاہے وہ کسی صحابی سے روایت کی گئی ہو ایک بھی حجازی راوی نہیں ہے بجز خراسانیوں شامیوں [illegible] کے۔ جس کی دلیل واضح یہ ہے کہ یہ حدیث جو ابن ماجہ میں مروی ہے تو سعید بن ابی سعید کے نام کے ساتھ [illegible] لفظ نہیں ہے۔ (دوسرا طریق) دارقطنی روایت کرتے ہیں ابوبکر نیشاپوری سے وہ عباس بن [illegible] اپنے والد (ولید بن فرید) سے۔ وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی [illegible] بن ابی سعید ایک ساحلی شیخ نے انھوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی ایک شخص[1] نے اہل مدینہ میں سے۔ اس کے بعد حدیث مذکور ہے۔

اس روایت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ سعید بن ابی سعید کے متعلق کہ شیخ بالساحل اور ساحل شام کے رہنے والے سعید بن ابی سعید مشہور راوی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ ساحل شام والے سعید بن ابی سعید [illegible] کا الزام ہے اور ان کی روایتیں معتبر نہیں ہیں۔ جھوٹی حدیثیں بہت گھڑا کرتے تھے۔ بے شبہ کے طبری کی روایت بعض محدثین پیش کرتے ہیں جس میں سعید بن ابی سعید بعد "المقبری" کا لفظ صراحۃً موجود ہے۔ مگر یہ خیال میں [illegible]

---

[1] یعنی حضرت انس بن مالک۔ نام کیوں چھپایا؟ یا کیوں بھول گئے؟ انکو نہ پوچھئے۔ یہ بھی ایک مثال ہے جھوٹی حدیثیں روایت [illegible]

طبرانی نے اس حدیث کو مسند الشامیین میں نقل کیا ہے اور یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ سعید بن ابی سعید ساحل شام ہی والے ہیں نہ کہ "مقبری" مدینہ والے۔ اگر یہ مقبری مدینہ والے ہوتے تو طبرانی اسی حدیث کو مسند اھل المدینہ میں درج کرتے۔ نہ کہ مسند الشامیین میں۔ صحابہؓ سے جو شخص روایت کر رہا ہو، اس کی سکونت کا ایسے موقع پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ ورنہ تابعی کے بعد تو تبع تابعی یا تبع تبع تابعی مختلف مختلف سکونت کے ہو سکتے ہیں۔ اسلئے مسند الشامیین میں صرف شامی تابعی کا اعتبار کیا جائے گا کہ نہ تابعی کے بعد والوں کا۔ یقیناً کسی کاتب نے طبرانی کے نسخے میں یہ تصحیف اپنی طرف سے کر دی ہوگی۔ طبرانی نے جب اس حدیث کو مسند الشامیین میں درج کیا ہے تو یقیناً ان کی مراد وہی سعید بن ابی سعید ساحلِ شام والے ہی ہیں۔

**خلاصہ تنقید رجال** تو صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت انس بن مالک کی طرف منسوب حدیث اسی ساحل شام والے سعید بن ابی سعید کذاب کی من گھڑت ہے۔ اور حضرت عمرو خارجہ کی طرف منسوب حدیث شہر بن حوشب شامی مشہور چور غیر معتبر شخص کی سکم زاد ہے۔ اور حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث اسماعیل بن عیاش الحمصی الشامی کی گھڑی ہوئی ہے۔ اور ان سب حدیثوں کی ٹکسال چاہے خراسان ہو یا کوفہ مگر اشاعت گاہ شام ہی رہی۔

**تنقید متن حدیث** حضرت ابو امامہ والی حدیث مختصر ہے حدثنا شرحبیل بن مسلم الخولانی سمعت ابا امامۃ الباھلی یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی خطبتہ عام حجۃ الوداع ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث یعنی شرحبیل بن مسلم الخولانی نے کہا کہ میں نے ابو امامۃ الباہلی سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے سنا رسول اللہ صلعم سے کہ آپ حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرما رہے تھے کہ بیشک اللہ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے تو کسی وارث کے لئے وصیت نہیں رہی۔ بظاہر یہ حدیث بہت صاف گھڑی گئی ہے۔ مگر پھر بھی کمزوریاں موجود ہیں۔ "حجۃ الوداع کا خطبہ" نہیں کہا۔ بلکہ "حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرمایا" جس سے پورے سال کے تمام خطبوں کو شامل۔ ورنہ حجۃ الوداع میں تو تقریباً ایک لاکھ صحابہ تھے۔ پھر بصیغہ واحد متکلم حضرت ابو امامہ ہی نے کیوں سنا؟ اگرچہ کوئی خطبہ بھی ہو سننے والے متعدد ہی ہوں گے۔ اس لئے یہ صیغہ واحد متکلم کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور عرب ایسے جاہل نہ تھے کہ واحد متکلم اور جمع متکلم کا محل استعمال نہ جانتے ہوں یہ عجمی راویوں سے ہو سکتا ہے۔ حضرت عمرو بن خارجہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبھم وھو علی راحلتہ وان راحلۃ لتقصع جرتھا وان لعابھا لیسیل بین کتفی۔ قال ان اللہ قد اعطی کل وارث نصیبتہ من المیراث فلا یجوز لوارث وصیۃ۔ الولد للفراش وللعاھر الحجر۔ ومن ادعی الی غیر ابیہ او تولی غیر موالیہ فعلیہ لعنتہ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل او قال عدل ولا

Marfat.com

(ابن ماجہ) یعنی عمرو بن خارجہ نے کہا کہ رسول اللہ صلعم لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے اور آپ اپنی سواری (اونٹنی) پر تھے اور وہ اونٹنی جگالی کئے جارہی تھی اور اس کا لعاب میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہ رہا تھا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے تقسیم کر دیا۔ ہر وارث کے لئے اس کا حصہ میراث میں سے تو نہیں جائز ہے کسی وارث کے لئے وصیت اور لڑکا فراش (منکوحہ بیوی) کے لئے ہے زناکار کے لئے پتھر ہے اور جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرے یا اپنے مولا کے سوا کسی اور کا مولا بنے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ نہیں قبول کی جائے گی اس سے توبہ اور نہ فدیہ۔ راوی اپنا شبہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ نے صرف (؟) فرمایا یا پہلے عدل ؟ فرمایا۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے روایت کو سچی ثابت کرنے کا ایک آدھ لفظ میں شبہ ظاہر کر دیا کہ یوں کہا یا یوں کہا۔ تاکہ معلوم ہو کہ کتنا دیانت دار راوی ہے کہ جہاں اسکو شبہ ہوا اس شبہ کو بھی اس نے ظاہر کر دیا باقی الفاظ تو ضرور وہی ہیں جو رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے نکلے۔ راوی کو کسی اور لفظ میں کوئی شبہ نہ ہوا۔ پھر اونٹنی کی کیفیت یہ بیان کرنا کہ وہ جگالی کئے جارہی تھی اور اس کے منہ سے لعاب جاری تھا اور راوی سننے میں اس قدر مستغرق تھا کہ لعاب اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہہ رہا تھا مگر یہ اسکی مطلق پروا نہیں کر رہا تھا۔ راوی نے اپنی بے خبری کو بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ راوی محسوس کر رہا تھا کہ اس پر لعاب گر رہا ہے مگر خطبہ سننے کے خیال سے اس نے کپڑے خراب ہونے کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ اور اس سے قرب بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ کس قدر قریب سے سن رہا تھا۔ حدیثیں گھڑنے والے نفسیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اسلئے خوب غور و خوض کرکے حدیث کے الفاظ باہمی مشورے سے چنتے تھے اور عنوان بیان بہت مناسب اختیار کرتے تھے۔

مگر ترمذی کی روایت میں الفاظ کا فرق اور مضمون کا اختصار ہے اس میں ہے ان النبی صلعم خطب علی ناقتہ وانا تحت جرانہا وھی تقصع بجرتہا وان لعابہا یسیل بین کتفی فسمعتہ یقول ان اللہ عز وجل اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث والولد للفراش وللعاھر الحجر اور نسائی میں اور بھی اختصار ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ ابن خارجہ نے کہا کہ انہ شھد رسول اللہ صلعم یخطب الناس علی راحلتہ وانہا لتقصع بجرتھا وان لعابھا لیسیل فقال رسول اللہ صلعم فی خطبتہ ان اللہ قد قسم لکل انسان قسمہ من المیراث فلا یجوز لوارث وصیۃ۔

مگر نسائی میں دو طریق اور بھی ہیں اور نہایت مختصر ہیں ایک میں ہے کہ عمرو بن خارجہ نے کہا کہ خطب رسول اللہ صلعم فقال ان اللہ اعطی کل ذی حق حقہ ولا وصیۃ لوارث اور آخری طریق یہ ہے کہ قال رسول اللہ صلعم ان اللہ عز اسمہ قد اعطی کل ذی حق حقہ ولا وصیۃ لوارث یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کے بعد عز اسمہ کا اضافہ ہے ورنہ یہ دونوں آخری طریق ایک ہی ہیں۔ لیکن پہلے طریق میں صرف لعاب کے بہنے کا ذکر ہے

مگر ان کے مونڈھے پر لعاب کے گرنے کا ذکر نہیں ہے۔ مگر ان تمام طویل ومختصر روایتوں کے راوی وہی قتادہ وہی شہر بن حوشب وہی عبدالرحمن بن غنم وہی عمرو بن خارجہ ہیں۔ مگر صرف "صرفٌ ولا عدلٌ" میں جو ابن ماجہ والی روایت میں راوی صاحب کو شبہ ہوا ہے تو اس کو ظاہر کر دیا۔ مگر ان روایتوں میں جو کہیں ان اللہ قسم لکل وارث نصیبہ من المیراث ہے، کہیں قسم لکل انسان قسمتہ من المیراث ہے۔ کہیں ان اللہ اعطی کل ذی حق حقہ ہے کہیں ان اللہ عز وجل اعطی ہے مگر ان اختلافات کو بلا اظہار اشتباہ قتادہ صاحب نے کسی سے کچھ کسی سے کچھ بیان کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ اگرچہ حدیث گھڑی ہوئی تو شہر بن حوشب ہی کی ہے مگر ان سے روایت کرتے ہیں قتادہ جو مشہور مدلس ہیں اور ہر طرح کی رطب و یابس حدیث روایت کرنے کے خوگر ہیں اور فرقہ کے بڑے امام تھے اپنے مسلک کی لوگوں کو دعوت دیا کرتے تھے۔ مرسل حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے۔ محدثین ان کی مرسلات کو بمنزلۃ الریح سمجھتے تھے۔

## حضرت انس والی روایت

جو صرف ابن ماجہ میں ہے یا دارقطنی میں یا طبرانی کی سند اشاسعین میں ابن ماجہ اور طبرانی کے اسناد بالکل ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ابن ماجہ بلا واسطہ ہشام بن عمار سے روایت کرتے ہیں اور طبرانی بواسطہ احمد بن انس بن مالک جو ایک مجہول الحال راوی ہیں۔ البتہ دارقطنی کے ابتدائی تین راوی اوروں سے مختلف ہیں۔ یعنی دارقطنی روایت کرتے ہیں عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز سے وہ داؤد بن رشید سے وہ عمرو بن عبدالواحد سے اور وہ عبدالرحمان بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس سے۔ اور دوسرے طریق میں دارقطنی روایت کرتے ہیں ابو بکر نیشاپوری سے وہ عباس بن ولید بن یزید سے وہ اپنے باپ ولید بن یزید سے وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید شیخ ساحلی سے وہ اہل مدینہ میں سے ایک شخص سے یعنی انس بن مالک سے۔ ابن ماجہ کی حدیث یوں ہے کہ عن انس بن مالك قال انی لتحت ناقة رسول الله صلی الله علیه وسلم یسیل علیّ لعابها فسمعته یقول ان الله قد اعطی کل ذی حق حقه الا لا وصیة لوارث اور دارقطنی کی روایت یوں ہے عن انس بن مالك قال انی لتحت ناقة رسول الله صلی الله علیه وسلم یسیل علیّ لعابها فسمعته یقول ان الله عز وجل قد اعطی کل ذی حق حقه فلا وصیة لوارث۔ والولد للفراش وللعاهر الحجر۔ لا یُعین رجلٌ الی غیر ابیه لا ینتمی الی غیر موالیه فمن فعل ذلك فعلیه لعنة الله متتابعة ولا تنفق المرأة من بیت زوجها الا باذنها فقال رجل ولا الطعام؟ یا رسول الله قال ذلك افضل موالنا۔ ثم قال الا ان العاریة مؤداة والدین مقضیٌّ والزعیم غارم۔

دارقطنی کا دوسرا طریق بھی اسی طرح کا ہے۔ اور طبرانی کا طریق بھی اسی طرح ہے اب ترجمہ سنئے حضرت انس

فرماتے ہیں:۔ میں رسول اللہ صلعم کی اونٹنی کے نیچے تھا اور اس کا لعاب مجھ پر بہہ رہا تھا تو میں نے آپ کو سنا کہ آپ فرما رہے تھے کہ بے شک اللہ عزوجل نے دیدیا ہر حق والے کو اس کا حق تو وصیت نہیں ہے کسی وارث کے لئے۔ اور لڑکا فراش (منکوحہ) کے لئے ہے اور زناکار کے لئے پتھر ہے۔ ہرگز نہ پکارا جائے کوئی شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرکے اور نہ منسوب ہو کوئی اپنے موالی کے سوا کسی اور کی طرف۔ جس نے ایسا کیا تو اُس پر اللہ کی پے درپے لعنت ہے۔ نہ خیرات کرے کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر۔ تو کہا ایک شخص نے اور کھانا بھی نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا یہ افضل ہے ہم لوگوں کے اموال سے۔ پھر فرمایا۔ عاریت ادا کی جانے والی چیز۔ اور قرض ادا کیا جانیوالا ہے اور کفالت کرنے والا ضامن ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ دارقطنی کی حدیث کا پیش کیا گیا۔ چونکہ آخر کے مضامین اس میں فاضل ہیں جو ابن ماجہ کی روایت میں نہیں ہیں اور دارقطنی کے دوسرے طریق میں نحوہ لکھا ہے یعنی اس طرح طبرانی کی روایت کو بھی حاشیہ دارقطنی میں نحوہ کرکے لکھا ہے اس لئے ترجمہ اسی کا پیش کیا۔

## اونٹنی کا لعاب

بہرحال حضرت انس کی طرف منسوب روایت جہاں بھی ہے مختصر یا طول سب میں اونٹنی کے نیچے ان کا ہونا اور اونٹنی کے لعاب کا ان پر بہنا مذکور ہے۔ پھر حضرت عمرو بن خارجہ والی روایت جو ابن ماجہ، نسائی اور ترمذی میں ہیں۔ جو مذکور ہوئیں جن میں اونٹنی کے نیچے عمرو بن خارجہ کا ہونا اور ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان اونٹنی کے لعاب کے بہتے رہنے کا ذکر ہے۔ اب کوئی بتائے کہ حضرت انس بن مالک اونٹنی کے نیچے کہاں پر تھے اور حضرت عمرو بن خارجہ کہاں پر تھے کہ دونوں پر اونٹنی اپنا لعاب گرا رہی تھی۔

پھر جن مضامین کا ذکر انس بن مالک کی طرف منسوب حدیث میں ہے ان میں سے آخری مضامین کا ذکر اور کسی روایت میں نہیں ہے۔ اور وہ حجۃ الوداع والے سال کا تو ذکر صرف حضرت ابوامامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث میں ہے وہ بھی ابن ماجہ اور ترمذی کی روایت میں۔ ابوداؤد کی روایت میں اس کا ذکر نہیں۔

**محدثین کا طریقہ تطابق** محدثین بڑی آسانی سے یہ کہدیں گے کہ ایک بار حجۃ الوداع کے سال بھی کسی خطبے میں آپ نے فرمایا تھا جس کو ابوامامۃ الباہلی نے سنا تھا۔

Marfat.com

اور اس کی روایت کی۔ اور ایک دوسرے موقع پر انس بن مالک آں حضرتؐ کی اونٹنی کے نیچے کھڑے تھے اور ان پر اونٹنی کا لعاب گر رہا تھا۔ اور تیسرے موقعہ پر عمرو بن خارجہ اونٹنی کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ اونٹنی کا لعاب ان کے مونڈھوں کے درمیان گر رہا تھا اور ایسے اتفاقات امکان سے باہر نہیں ہیں۔ باقی جو مختصر مختصر روایتیں ہیں ممکن ہے کہ راوی نے کبھی مفصل بیان کیا۔ کبھی تفصیل کا موقع نہیں پایا، یا ضرورت نہیں سمجھی اس لئے اختصار سے کام لیا۔ یا یہ بھی دوسرے مختلف مواقع کے واقعات ہوں اور آپ نے اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے ورثہ کے حصے خود مقرر کر دئے تو اب وارث کے لئے وصیت جائز نہیں رہی۔ وغیر ذلک فی التاویلات۔

مگر یہ محدثین اس کو کیا کریں گے اور اس کا کیا جواب دیں گے کہ یہ روایتیں جو صرف تین صحابیوں کیطرف منسوب ہیں ابو امامۃ الباہلی، عمرو بن خارجہ اور انس بن مالک جن میں سے ایک بھی اکابر مہاجرین و انصار میں سے نہیں ہیں۔ انس بن مالک خادم رسول اللہ صلعم اگرچہ بہت مشہور صحابی ہیں۔ مگر ہجرت کے وقت آٹھ دس برس کے تھے۔ جیسا کہ استیعاب میں مذکور ہے۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت اسی حساب سے اٹھارہ بیس برس کے ہوں گے۔ بصرہ سے دو میل پر مقام طف میں مکان بنایا تھا۔ وہیں رہے وہیں ۹۱ھ میں وفات پائی بصرہ میں یہ آخری شخص تھے۔ جس نے آنحضرت صلعم کو دیکھا تھا۔ بلکہ ان کے بعد صرف حضرت ابو الطفیل ہی کی وفات ہے جو آخری صحابی روئے زمین پر رہ گئے تھے۔ اور ابو امامۃ الباہلی مصر میں رہتے تھے پھر حمص شام کے علاقے میں آکر رہ گئے اور یہیں وفات پائی۔ شام میں یہ سب سے آخری صحابی تھے۔ ان کے بعد کوئی صحابی شام میں نہ رہا۔ صرف شامیوں ہی نے ان کی حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور بہت روایت کی ہیں۔ ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں وفات پائی۔ اور عمرو بن خارجہ بن المشفق الاسدی یہ بھی شام ہی کے ساکن تھے۔ ان سے بس یہی ایک روایت لاوصیۃ لوارث والی ہے۔ جس کو ان سے عبد الرحمن بن غنم اور ان سے شہر بن حوشب اور ان سے قتادہ روایت کرتے ہیں۔ اس کے سوا ان سے کوئی اور حدیث کہیں مروی نہیں نہ ابن غنم کے سوا کوئی اور ان سے کچھ روایت کرتا ہے عبد الرحمن بن غنم شامی ہی ہیں۔

## اصل حقیقت

یہی ہے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ حضرت ابن عباس والے قول کو تو ورقار اور علی بن حسین بن واقد نے خراسان میں گھڑا تھا یا ایک کو ورقار نے کوفہ میں اور دوسرے قول کو ابن واقد نے مرو میں

گھڑا۔ اور لا وصیۃ لوارث والی حدیث کو سعید بن ابی سعید ساحلی شام والے کذاب نے حضرت انس کی طرف اور شہر بن حوشب شامی چور بدمعاش نے حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف اور اسماعیل بن عیاش الحمصی الشامی کذاب نے حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب کرکے شام کے علاقوں میں اور خراسان و عراق و مصر میں اس کی اشاعت کی ایسے جلیل القدر صحابہ کا نام نہ لیا کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ آخر تمھیں شامیوں نے ان سے یہ حدیث کیوں سنی؟ اس لئے ان ہی صحابہ کی طرف منسوب کیا جو شام ہی میں رہے اور شام ہی میں وفات پائی یا عراق میں جیسے حضرت انسؓ مگر یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ رسول اللہ صلعم کے اس خطبے کو انھیں تین صحابیوں نے کیوں سنا؟ اکابر صحابہ اس سے کیوں بے خبر رہے؟ اگر کہا جائے کہ وہ لوگ بے خبر نہ تھے، سب باخبر تھے۔ تو پھر آخر اس کی روایت اکابر صحابہ و تابعین تبا ذکیوں نہیں کرتے؟

یہی وہ حدیث ہے جس کو متواتر اور ناسخ قرآن تک کہا جاتا ہے۔ تو کیا اگلے محدثین اس حدیث کی تنقید اس طرح نہیں کرسکتے؟ ضرور کرسکتے تھے۔ مگر تنقید تو وہ کرے جس کو کوئی شبہ ہو۔ روایت پرستی سے وہ اتنے مغلوب تھے کہ چاہے کیسی ہی حدیث، قرآن مبین کی کیسی ہی صریح آیات کے خلاف کیوں نہ مل جائے۔ اگر ان کے کسی مرغوب مسئلے کی اس سے تائید ہورہی ہے۔ تو پھر بلا چون و چرا اس کو مان لیں گے یہ عادت کچھ ایسی پڑی رہی کہ تنقید حدیث کے اصول خود بنانے کے باوجود انھوں نے کبھی صحیح معنوں میں تنقید حدیث کی ہی نہیں موضوعات کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے کتنی صحیح حدیثوں کو موضوع قرار دے دیا اور صحاح کے اندر کتنی موضوع حدیثیں بھرلیں۔ یہ اس لئے کہ ان کا معیار صحت و غلط ہی نو کھا ہے۔ توافق قرآن و عدم مطابقت قرآن کو ایک اہم معیار ضرور لکھتے ہیں مگر کبھی اس معیار پر کسی حدیث کو پرکھتے نہیں۔ اور اگر کبھی کسی آیت کی بنا پر بظاہر کسی حدیث کو رد بھی کیا تو غلط بنیاد پر۔ درحقیقت اس آیت کی خلاف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے مزعومہ کسی رائے یا عقیدہ یا کسی مسئلے کی مخالفت کی بنا پر اور بظاہر کسی آیت کو ایک ٹٹی بنا لیا ہے۔ جیسے تکثر لکم الاحادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علے کتاب اللہ فما وافقہ فاقبلوہ وما خالفہ فردوہ یعنی آں حضرت نے فرمایا کہ میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہوگی۔ تو جو حدیث تمھارے سامنے مجھ سے روایت کی جائے اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اس کو قبول کرو جو اس کے خلاف ہو اس کو رد کردو۔" توضیح و تلویح" میں علامہ تفتازانی اس حدیث پر بہت خفا ہوئے ہیں اور لکھ دیا کہ اس کو زندیقوں نے گھڑا ہے۔ کیونکہ یہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ہے ما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا۔ یعنی جو کچھ تمھیں رسول نے دیا اس کو لے لو اور جس سے باز رکھا اس سے باز رہو۔

حالانکہ اگر واقعی اس آیت کے تحت میں حدیث بھی آسکتی ہے تو یہ حدیث تکثر لکم الخ والی تو یہی بتا رہی ہے کہ کسی حدیث کے سننے کے بعد پہلے یہ دیکھ لو کہ وہ ما اتکم الرسول ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ضرور قبول کر لو ورنہ وہ تو ما اتکم الرسول ہے ہی نہیں۔ اس لئے ما نھکم عنہ میں داخل ہے۔ اس سے باز ہی رہنا فرض ہے۔ غرض قرآن سے استدلال بھی کرتے ہیں تو غلط طریقے سے نسئال اللہ تعالیٰ ان یجعلنا ممن یطیعہ ویطیع رسولہ ویتبع رضوانہ ویجتنب سخطہ انما نحن بہ ولہ وصلے اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وبارک وسلم وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین ؎

کرتا ہے ہر خبر پہ تمنّا! یقین کیوں

ناداں! نوید دوست فریب عدو نہ ہو

Marfat.com

# ایک
# آخری مگر سچی بات

(وعظ حق گو)

مولوی عبدالماجد دریا بادی میری انگریزی کتاب "محمدان دی قرآن" پر اپنے اخبار صدق جدید مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۵۲ء میں تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"سید مقبول احمد الہ آبادی سابق ڈپٹی کلکٹر ایک زمانے میں نگار کے دست راست تھے اور فتنہ انکار حدیث میں بجا طور پر بڑی بدنامی و رسوائی حاصل کئے ہوئے تھے لیکن الحمدللہ کہ اس کے بعد ہی سنبھل گئے ..... وغیرہ وغیرہ"

میں نے جواب میں عرض کیا کہ انکار حدیث رسول کی مجال تو کسی مومن کو نہیں ہو سکتی۔ حدیث منسوب الی الرسول میں البتہ کلام ہے اور علمائے سو (انہ کان ظلوما جہولا) کے [illegible] اختلاف نہیں کر سکتا۔ ورنہ آپ مولوی عبدالشکور صاحب سے ہی دریافت کریں کہ کتنی حدیثیں [illegible] یقینی گنی گئی ہیں، حد سے حد پانچ چھ اور وہ بھی قولی نہیں بلکہ فعلی ارکان صلوٰۃ وغیرہ [illegible] میں مولانا نے فرمایا "حدیث کو قرآن کے درجہ کی چیز تو ہرگز نہیں سمجھتا ہوں لیکن قرآن کے بعد جو چیز سب سے زیادہ مستند کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہی ذخیرۂ احادیث ہے جس کے درجات و مراتب استناد کی بعد امکان بشر تنقید اور تنقیح ہو چکی ہے"

یہ وہی عام غلط فہمی ہے جس سے مولانا کے جیسے فلسفی اور اہل علم بھی خیر نہیں۔ [illegible] کہ انھوں نے اور لوگوں کی طرح اس کا جواب یہ نہیں دیا کہ بجز قرآن ہی کو آپ [illegible] حق رکھتے ہیں۔ اسلئے بحث دو تنقیح طلب مسئلوں میں رہ جاتی ہے۔

اوّل۔ قرآن کامل ہے یا ناقص۔

دوم۔ کیا یہ بشری قوت سے ممکن ہے کہ وہ دو ڈھائی سو برس کے بعد زبانی روایتوں کی تنقیح کر سکے جبکہ اولین سننے اور دیکھنے والوں کی دس پشتیں گزر چکی ہوں۔

Marfat.com

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہی دیا جائے گا کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو، یعنی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ امور غیبیہ کا کوئی علم رسول اللہ صلعم کو بغیر وحی کے نہ ہو سکتا ہے نہ ہوا ہے۔ بلکہ اوامر و نواہی میں بھی وہ تابع وحی تھے ۔ لازماً یہ نتیجہ نکلے گا کہ رسول اللہ صلعم نے بعض امور کو تو بیان کر دیا اور بعض کو چھپا ڈالا یا بھلا دیا۔ پھر کبھی اتفاقیہ اسکو اپنا قول بنا کر پیش کر دیا جس کو راوی نے سن لیا اس لئے تمام وہ باتیں جن کا ذکر میں نے مطالعہ حدیث میں کیا ہے۔ بلکہ بہت سی اور باتیں وہ سب زائد از وحی بھی ہیں اور وحی بھی ہیں۔ میں کچھ اپنے طرف سے اسکے جواب میں عرض کرنا نہیں چاہتا۔ اپنی ہی ہوش و خرد سے اس کا جواب دیجئے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا بعضوں کی عقل ایسی سلب کر لیتا ہے کہ وہ دو اور دو کو چار کہنا بھول جاتے ہیں۔

دوسرا سوال محض نظری ہی نہیں بلکہ تجرباتی ہے۔ آپ اپنے ہی خاندان کے کسی مشہور بزرگ کے کسی زبانی قول کو بیان کر دیجئے۔ تصدیق کرنا تو علیحدہ رہا جو آپ سے ڈھائی سو برس پہلے گزر گیا ہے اور جو ضبط تحریر میں کبھی نہیں آیا۔ شاید آپ یہ کہیں کہ میں نے یہ بیان اپنے چچا یا باپ یا زیادہ سے زیادہ اپنے دادا پردادا سے سنا تھا اور وہ ثقہ تھے مگر اسکے پہلے آگے تاریک پردہ ہے یا نہیں۔ پس کیوں کر قول منسوب الی الرسول کو ہم یقینی کہہ سکتے ہیں۔ ہم تو اسکو تصدیقی کہنے کی بھی مجال نہیں پاتے آپ میں یا آپ کے راویوں میں اگر مافوق العادۃ بشری قوتیں ہوں تو اور بات ہے پھر سوائے ہٹ دھرمی و تعصب یا کورانہ تقلید و انسان پرستی کے جذبے کے کوئی اور بنیاد اس دعوے کی ہو سکتی ہے کہ یہ وہی ذخیرہ احادیث ہے جسکے درجات مراتب استناد کی بقدر امکان بشر تنقیح و تنقید ہو چکی ہے یا للعجب۔"

مولوی عبدالماجد صاحب اگر خدا نخواستہ وکیل ہوتے تو اپنی برادری میں ایک قہقہہ برپا کر دیتے اگر کسی مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے وہ عدالت کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ انکے موکل کا دعویٰ استقرار صحیح و یقینی ہے اور اس زبانی قول پر مبنی ہے جو نوابین اودھ کے زمانے سے پہلے اسکا مورث اعلیٰ اپنے کسی مجہول یا کم سن ساتھی سے کہہ گیا تھا۔ پھر کیا یہ مقام افسوس نہیں کہ وہ خدائی عدالت میں ایسی بے تکی باتیں کہنے سے نہ شرماتے ہیں نہ جھجکتے ہیں۔

(س۔م۔ا)

Marfat.com

## مصنف کی دو اور مشہور کتابیں جو لائبریری کے سلسلہ معارف اسلامی میں شامل ہیں:-

**مظاہر قرآن** :- نہ صرف تمام قرآن پاک کا صاف و شستہ و عام فہم عبارت میں ترجمہ ہے بلکہ جن مسائل پر قرآن ناطق و حاوی ہے اسکو اس طرح سلجھا کر مختلف ابواب میں رکھدیا ہے کہ ہر زمانہ و عالم کے لئے یکساں مفید و کافی ہی نہیں بلکہ تمام مسائل دینی و ضروریات دینی سے بالکلیہ مستغنی کرتا ہے۔ ہر باب میں مصنف نے حسب ضرورت اپنے مختصر نوٹ سے آیات کی توضیح و تشریحات سائنس، فلسفہ، تاریخ قدیم و کتب سماوی کی روشنی میں کردی ہے اور عقائد و اعمال اسلامی میں اسکا خود اپنا تبصرہ بھی ہے غرضیکہ یہ کتاب ہر مسلمان کو مومن کامل بنانے کی ضامن ہے اور ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ یہ کتاب خود بھی پڑھے۔ اپنی اولاد کو پڑھائے اور اپنے غیر مسلم دوستوں کو پڑھنے کو دے۔ اس کتاب میں وہ سیرۃ نبوی بھی شامل ہے جس کی بنیاد قرآن ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب مطالعہ حدیث کا بے بہا بدرقہ ہے۔

**محاکمہ حکمت** - جو پہلے فلسفہ مذہب کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اب اضافہ اور ترمیمات کے ساتھ کراؤن سائز کی ضخیم جلد ہوگئی ہے۔ اس میں عقلیت یعنی حکمت و مذہب کا موازنہ ہے اور مذہب [illegible] فیصلہ۔ یونانیوں کے متروک و مردود اصول کی جگہ یوروپین فلاسفر کے نئے افکار سے تعرض [illegible]۔

اسکے علاوہ ہماری مطبوعات میں انگریزی کی بھی معارف اسلامی کی سیریز ہے جسکی فہرست ہم سے طلب کیجے۔

لائبریری کے سلیکٹ کمیٹی تہیہ کر چکی ہے کہ انگریزی اردو بلکہ ہندی کی ہر ایسی کتاب شائع کی جائے جو اسلام [illegible] اللہ منظور کرے اور اس طرح تبلیغ و اشاعت اسلام کی مددگار ہو۔ آپ بھی ہماری مدد کیجئے یعنی ہماری کتابوں کو زیادہ سے زیادہ حسب استطاعت خریدئے۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ لائبریری کبھی ایسی کوئی کتاب شائع نہ کرے گی جس سے اسلام کو نفرت ہو۔ البتہ ہم ان کتابوں کے چھاپنے سے باز نہ رہیں گے جو اسلام کے مقابل تفرقہ سازی، اوہام پرستی کو کبھی فروغ نہ ہونے دے۔

**عباس منزل لائبریری الہ آباد (۳)**

اسرار کریمی پریس الہ آباد سے لائبریری مذکور نے چھپوا کر شائع کیا

Marfat.com

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم

قرآن حکیم

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

(اقبال)

# مُطالعہ حدیث

## تنقید صحیح کی روشنی میں

اور

## بعض عقائد اسلامی کے مجہول و کمزور ماخذ

از


سیّد مقبول احمد صاحب بی۔ اے (مصنف فلسفۂ مذہب)


مع

تنقید از مولانا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری


ناشر

عباس منزل لائبریری ——— الہ آباد (۳)